پُلِ صراط
نگہت سیما

حزن، سچائی اور گہرائی

ادب کی تخلیق کاری نے بہت سے نام معتبر کر دیے اور کئی نام ادب کو معتبر کر گئے۔ انہی میں ایک نام نگہت سیما کا بھی ہے۔ روزمرہ کے ان واقعات کو قلمبند کرنا جو بادی النظر میں غیر اہم ہوں لیکن انسانی سوچ، زندگی اور مزاج پر اثر انداز ہوتے ہوں اور ایسے پیرائے میں بیان کرنا کہ انسانی احساس پوری طرح واضح ہو جائے، نگہت سیما کی تحریر کا خاصا ہے۔

نگہت کی تحریر پر کوئی comments دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی بچے کی مسکراہٹ اور ہنسی کو ہو بہو تحریر کرنے کی کوشش کرے یا پھر اس چہرے پر موجود حزنیہ سلوٹ کو بیان کرنے کی کوشش کرے، جو کسی قبر کے سرھانے بیٹھی روح کے چہرے پر اتری ہو۔ اتنا حزن، اتنی سچائی اور اتنی گہرائی! وہ یہ سب define کرے گی (تو مجھے ڈر ہے) لوگ اسے accept کرنے سے انکار کر دیں گے۔ اس کا ارتکاز بہت خوفزدہ کر دینے والا ہے اور وہ بہت بے دردی سے اندر کے دکھ کو عیاں کرتی ہے اور اس چھپے ہوئے کو کرید ڈالتی ہے جو ایک بار پھر پلٹ آتا ہے، گزر جانے کے بعد! اس کی تحریر دل کو بریدہ اور آنسوؤں کو Recreate کرتی ہے اور اس کی قصوروار نگہت سیما ہے۔ وہ چند لفظوں میں سب کچھ یوں نکھار دیتی ہے جیسے گھنے باغ کی گھاس پر گلے سڑے پتوں اور ٹہنیوں کے ڈھیر سے نئی نویلی کونپل سر اٹھا لے۔

مختصر! یہ کہ نگہت کی تحریر انسانی المیوں، جذبوں اور احساسات کی ترجمان ہے۔ ان میں پوری سچائی موجود ہے۔ اس کا ناول ''پل صراط'' بہت ہی کرب ناک حقیقت ہے اس بارے میں کیا لکھوں؟ آپ خود پڑھیں اور پھر اپنے دل و دماغ پر قرطاس ہوتا ہوا دیکھیں۔

محمد اعجاز چوہدری

ڈائریکٹر

نیو ہوریزن سائنس انسٹیٹیوٹ گوجرانوالہ

پیش لفظ

میری یہ کہانی تین حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ ادھوری کہانی ہے اس میں میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بعض اوقات ہم انہی بنے بنائے راستوں پر چلتے ہیں جو ہمیں ورثے میں ملتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ غلط ہیں یا صحیح یا پھر کبھی غلط صحیح کا ادراک ہو بھی جاتا ہے تو ہم پھر بھی اسی راستے پر چلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ ہم اس میں اس حد تک انوالو ہو چکے ہوتے ہیں کہ باوجود خواہش کے بھی راستہ بدل نہیں سکتے۔

آفتاب حسین بھی اپنے صحافی باپ جنہیں وہ ہنی بابا کہتا تھا کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے پر مجبور تھا۔ وہ راستہ جو ییلو جرنلزم کی طرف جاتا تھا وہ راستہ جس نے ایک سچے کھرے انسان کو بلیک میلر بنا دیا تھا وہ جانتا تھا کہ یہ غلط ہے لیکن وہ اس پر چلتا جا رہا تھا یوں وہ اپنی کہانی ادھوری چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔

دوسرا حصہ استقامت ہے یہ اسید عبدالرحمٰن کی کہانی ہے جو اس ادھوری کہانی کو مکمل کر رہا ہے اسید عبدالرحمٰن وہ صحافی ہے جو سچائی کی خاطر جان بھی قربان کر سکتا ہے یہ راستہ پل صراط کی طرح ہے لیکن اس نے عہد کیا ہے کہ اسے اسی پل صراط پر چلنا ہے اور اس سفر میں اس کے ساتھ اسی جیسے اسکے دوست بھی ہیں۔

تیسرا حصہ اسید عبدالرحمٰن اور اس کے ساتھیوں کے اس سفر کی کہانی ہے جہاں محبت بھی اسید عبدالرحمٰن کے ساتھ ہو جاتی ہے یہاں میں نے ایک نئی تکنیک استعمال کی ہے پہلے دونوں حصے آپ بیتی کی صنف میں ہیں تیسرا افسانے کی شکل میں ہے کتاب آپ کے سامنے ہے امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

نگہت سیما۔ چکوال

15 مئی 2011ء

حقیقت کا اعتراف

نگہت سیما کو جب بھی میں نے پڑھا اس کی تحریر کی سچائی اور اثر پذیری نے مجھے حیرت میں ڈال دیا کیونکہ نگہت سیما۔۔۔۔۔ جیسا کہ میں نے ان کی کتاب ''فرینڈلی فائر'' کے بارے میں ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہونے والا تبصرہ پڑھا۔ آپ بھی پڑھیں۔۔۔۔۔

''محترمہ نگہت سیما صاحبہ نے بچوں کی کہانیاں لکھنے سے آغاز کیا سکول کے زمانے میں ایک ویت نامی بچے کی تصویر دیکھی جو زمین پر اوندھا پڑا ہوا تھا اور ایک امریکن فوجی اسے ٹھوکریں مار رہا تھا۔ وہ بچہ مصنفہ کی عمر کا تھا سکول کی اس طالبہ نے اس بچے کے دکھ کو اپنا دکھ بنالیا اور کہانی لکھی ''وانگ ہو کی کہانی'' یہاں سے ان کے قلمی سفر کے ایک نئے مرحلے کا آغاز ہوا۔ ''مسجد اقصیٰ کی کہانی'' ان کی دوسری کہانی تھی ۔نوحہ گری کا یہ سفر فلسطین ،مشرقی پاکستان ،افغانستان ،کشمیر، بوسینیا سے ہوتا ہوا عراق اور وزیرستان تک آن پہنچا ہے۔''

غالب گمان ہے کہ محترمہ اب تک ایک ہزار کے قریب کہانیاں، افسانے اور ناول لکھ چکی ہیں اور ان کی کہانیوں کے مجموعوں اور ناولوں کو عصر حاضر کے معتبر ناول نگار، ادیب اور مدیر طارق اسماعیل ساگر، قدسیہ ہاشمی، خالد محمود، بشریٰ رحمٰن ،ریاض محمود، رفیع الدین ہاشمی اور مسلم سجاد جیسی شخصیات خراج تحسین پیش کر چکی ہیں اور اس حقیقت کا اعتراف بھی کہ نگہت سیما نے معاشرتی المیوں سے لے کر ملکی اور عالمی اسلام دشمن قوتوں کی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے ان کے خلاف حقائق کو دلچسپ انداز میں ناول کی صورت میں لکھا ہے اور جہاد بالقلم کا حق ادا کیا ہے۔

''المجاہد پبلشرز'' کے تحت شائع ہونے والے ناولوں ''جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا'' ''فرینڈلی فائر'' اور ''نجات دہندہ'' ہمارے معاشرے کے تلخ حقائق کا ایک باب ہیں۔ ''پل صراط'' اس المناک اور خون آلود تاریخ کا اگلا باب ہے اور یہ ناول اس قدر تاریخی اور تازہ ترین ہے کہ کبھی آپ کہیں گے کہ یہ رپورٹنگ تو شہید صلاح الدین (تکبیر والے) پر کی گئی ہے مگر نہیں آج آپ کو یہ کہانی دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قلم کی طاقت اور کیمرے کی آنکھ سے حقائق منظر عام پر لانے والے مجاہد صفت صحافیوں ولی خان بابر، سلیم شہزاد کی المناک شہادتوں کی داستان محسوس ہوگی۔ میں آپ کو بتاؤں کہ یہ ابھی ادھوری کہانی ہے کل آپ کو یہ کہانی کسی اور زرد صحافت کے خلاف جہاد بالقلم کرنے کی سزا پانے والے مجاہد کی کہانی آنکھوں میں فلم کی طرح گھومے گی کیونکہ کہانی یہی ہوگی مگر حق کی اذان دینے والے کردار بدلتے رہیں گے۔

ناصر اقبال مجاہد

چیف ایڈیٹر ماہنامہ ''فخر عدالت''

''پل صراط'' میرے سامنے ہے

تخلیق کار نے انسان بنا کر سوچ دی، کردار دے دیا، پابندی دے دی، آزادی دے دی، راستے سمجھا دیئے اور پھر ایک دوسرے عبد نے تخلیق کار کی تخلیق کو ایسے ہی سمجھ لیا کہ وہ حافظ ہو گیا احساسات کا اور وہ کردار کی سوچ اور سٹرکچر کو بالکل ویسے ہی بیان کرتا ہے جیسے تخلیق کار نے بنا دیا۔ یہ سوچ کی معراج اور رب کی عطائے ربوبیت ہے کہ کسی کے لیے لوہا نرم کر دیا، تو کسی کو ید بیضا عطا کر دیا اور عصا کو سانپ بنا دیا، کسی کو کلیم اللہ کر دیا اور کسی کو جانوروں، پانیوں اور ہواؤں پر حکومت دے دی اور کسی کو سوچ کی معرفت عطا کر دی۔

نگہت سیما بھی کردار تخلیق نہیں کرتی تخلیق کی اصل ڈھونڈ نکالتی ہے اور امر ربی کی تشریح کرتی ہے۔ Simple یہ کہ نگہت سیما انسانوں کو Explain کرتی ہے بالکل ایسے ہی جیسے قدرت نے انہیں Programme کیا۔

یہ Supernatural ذہنی قوت ہے، ارتکاز بھی ہے، فکر بھی ہے، اثر پذیری بھی ہے اور قوت جاذبہ بھی۔ یہ جن Humantrage کو تحریر کرتی ہے وہ اتنے ظالم اور کربناک احساسات ہیں کہ انہیں پڑھا تو بعد میں جانا انہیں لکھنا اور اتنی گہرائی میں بیان کرنا ہی بے حد المناک اور تکلیف دہ ہے۔

یہ سارا Metamorphic یعنی جاننا اور برداشت کرنا، لکھنا

اور کسی احساس کی روح کو پا جانا بے حد کربناک ہے۔نگہت سیما نے جتنا اندر اتر کر، کرداروں میں تحلیل ہو کر، انسانی فطرت و جذبات اور ردعمل کو جان کر لکھا ہے وہ بے حد حیران کر دینے والا بہت خصوصی ہے۔وہ بیک وقت بہت سے کردار Explain کرتی ہے اور اُن کی اُن سوچوں کو بے دھڑک لکھ دیتی ہے جو کم و بیش ہر انسان کے ذہن میں اترتی ہیں لیکن کوئی بھی انہیں بتاتا یا ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔نگہت سیما صرف کردار تخلیق نہیں کرتی بلکہ ظاہری طور پر چاک کر کے چھپے ہوئے کردار Explain کرتی ہے اور یہ تب تک ممکن نہیں ہوتا جب تک کسی ذہنی سوچ کو من وعن سمجھ جانے کی خداداد صلاحیت موجود نہ ہو۔

نگہت واقعات کو originnality کے رنگ میں دیکھتی ہے یہ Justify نہیں کرتی کہ جو ہوا غلط تھا یہ نہیں ہونا چاہیے تھا اور کمال یہ ہے کہ فطری کردار کی تشریح کے ساتھ ہیومن سائیکالوجی کا امتزاج گفتگو اور مکالموں کے نتیجے میں پیدا ہونے والا احساس، کسی فزیکل عمل کے جواب میں ترتیب پانے والے موسم اور مختلف کردار کا Reaction سب حیران کن ہیں۔

"پل صراط" میرے سامنے ہے نگہت نے اس میں ایک مکمل Circumfrance کے اندر ایک مخصوص سوچ Existance اور Behaviour کو زندگی دے ڈالی ہے۔انسانی ذہن کی سوچ کا اس سے بڑا سچ اور کوئی نہیں کیا اسے کشف ہوتا ہے ان سوچوں کا بھی جسے رب کریم کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔

محمد ضیغم مغیرہ

شاعر، ادیب

(ڈائریکٹر غزالی گروپ آف سکولز اینڈ کالجز پنجاب)

ادھوری کہانی

بڑے دنوں سے میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اس کی کہانی لکھوں۔اسید عبدالرحمٰن کی کہانی، لیکن ابھی یہ کہانی ادھوری ہے بڑے عرصہ سے میں دل میں یہ خواہش پال رہا ہوں لیکن کہانی مکمل ہونے میں ہی نہیں آتی اسید عبدالرحمٰن وہاں ہی کھڑا ہے۔جہاں پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا اور میں ہسپتال میں وی۔آئی۔پی روم میں تنہا پڑا ہوں اور قطرہ قطرہ گلوکوز میرے رگوں میں اتر رہا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ کہانی لکھوں اس سے پہلے کہ موت کا ہرکارہ اپنا بگل بجاتا آ جائے پتہ نہیں کیوں میں اسید عبدالرحمٰن کی کہانی لکھنا چاہتا ہوں۔حالانکہ مدت ہوئی میں نے قلم نہیں اٹھایا اور لوگ بھول بھی چکے ہونگے کہ کبھی کوئی آفتاب حسین ہوا کرتا تھا جو انسانیت کا علمبردار تھا جو اپنی ہر کہانی میں انسانیت اور محبت کا درس دیتا تھا جو سچائی اور دیانت کی کہانیاں سناتا تھا۔جو وفا کا پرچار کرتا تھا وہی آفتاب حسین جب صحافت کی دنیا میں آیا تو اس نے معاشرے کے ناسوروں میں نشتر چبھونے شروع کر دیئے وہ اس معاشرے کو سنوارنا چاہتا تھا اس ملک کو ہر طرح کی برائیوں سے پاک دیکھنا چاہتا تھا جسے حب الوطنی کا دعویٰ تھا جو زرد صحافت کے خلاف لمبے لمبے کالم لکھتا تھا جو ایسے صحافیوں کو قلم توڑ دینے کے مشورے دیتا تھا لیکن ایک کمزور لمحے نے اس سے اس کا

ساراغرور چھین لیا اور اس نے خود اپنا قلم توڑ دیا لیکن وہی آفتاب حسین اب اسید عبدالرحمٰن کی کہانی لکھنا چاہتا ہے حالانکہ اس کے ہاتھ تو قلم تھامنا بھول گئے ہیں۔

ہاں مدت ہوئی میرے قلم نے انسانیت کا پرچار نہیں کیا۔ محبت و وفا کی کہانیاں نہیں سنائیں۔ حب الوطنی کے ترانے نہیں گائے۔ میرے قلم نے تو صرف ہندسوں کا کھیل کھیلا ہے۔ صرف لمبی لمبی رقموں کے چیک پر دستخط کیے ہیں۔ یا پھر اپنے مختلف اکاؤنٹس میں لمبی لمبی رقمیں جمع کروائی ہیں۔ میں جو لفظوں کا بادشاہ کہلاتا تھا مدت ہوئی سارے لفظ بھول بیٹھا تھا۔ کبھی لوگ کہا کرتے تھے کہ آفتاب حسین کے ہاتھوں میں قلم آ کر بولنے لگتا ہے اور لفظ اس کے قلم سے یوں نکلتے ہیں جیسے سیپ سے موتی۔ مگر مدت ہوئی اس کے قلم نے موتی اگلنا چھوڑ دیے تھے لیکن اس اسید عبدالرحمٰن نے مجھے جانے کیا کیا یاد دلا دیا ہے۔ یہ اسید عبدالرحمٰن میرا کچھ نہیں پھر بھی مجھے لگتا ہے جیسے یہ میرا سب کچھ ہو، جب جب میں نے اسید عبدالرحمٰن کو دیکھا مجھے لگا جیسے میں اسید عبدالرحمٰن کو نہیں آفتاب حسین کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ آفتاب حسین جو آج سے پچیس سال پہلے تھا یہ آفتاب حسین نہیں جو آج ہے۔ یہ وہ آفتاب حسین تو نہیں یہ تو صرف سیٹھ آفتاب حسین ہے۔ بگ باس ہے۔ ایم۔ پی۔ اے ہے نہ جانے اس کے کتنے چہرے ہیں لیکن اس آفتاب حسین کا تو صرف ایک چہرہ تھا اس نے اپنے چہرے پر کوئی نقاب نہیں لگا رکھا تھا۔ وہ اندر باہر سے ایک جیسا تھا پھر پتا نہیں کب اس نے بھیس بدلنا اور نقلی چہرے لگانا شروع کر دیے۔

کبھی ایک کاروباری کا چہرہ، کبھی ایک سیاسی لیڈر کا چہرہ، کبھی ایک خطرناک گروہ کے بگ باس کا چہرہ، جسے سب بگ باس کہتے ہیں اور ان سارے چہروں کے پیچھے وہ ایک چہرہ چھپ گیا ہے۔ آفتاب حسین کا اصل چہرہ۔ وہ آفتاب حسین جو محبت و سچائی، نیکی و دیانت کا داعی تھا۔ ہاں وہ آفتاب حسین اتنے سارے چہروں کے دبیز نقاب کے پیچھے چھپ گیا تھا لیکن یہ اسید عبدالرحمٰن ۔۔۔۔۔ پتا نہیں اس کے پاس کیا جادو ہے کہ اس نے آفتاب حسین کے چہرے سے سارے نقاب نوچ کر پھینک دیے ہیں اور اس کے پیچھے سے جو آفتاب حسین برآمد ہوا ہے وہ آفتاب حسین تو اس آفتاب حسین سے بہت مختلف ہے۔ ڈرا سہما اپنے گھر کے برآمدے میں ستون سے ٹیک لگائے وہ نو سالہ آفتاب حسین حیرت

سے اپنی دادی کو دیکھ رہا ہے جسے وہ پہلی بار اتنے غصے میں دیکھ رہا ہے۔ اس کی بے حد سفید گوری رنگت والی دادی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا ہے جیسے قندھاری انار۔

''یہ کیا تھا حسین احمد! ۔۔۔۔۔ وہ شخص کون تھا! ۔۔۔۔۔ اور پھلوں کے ٹوکرے کے ساتھ وہ بھاری لفافہ ۔۔۔۔۔ جس میں نہ جانے کتنی رقم تھی۔''

''وہ ۔۔۔۔۔ اماں وہ لفافہ کہاں ہے؟ اور ۔۔۔۔۔'' ہاتھ میں پکڑا بریف کیس برآمدے میں پڑی کرسی پر رکھتے ہوئے حسین احمد کے ہونٹوں سے آدھا ادھورا سا جملہ نکلا تھا۔

''وہ لفافہ اور وہ پھل جس طرح آئے تھے میں نے اس طرح لوٹا دیے، حسین احمد تم سے میں پوچھ رہی ہوں یہ سب تم نے کیا شروع کر دیا ہے؟ ۔۔۔۔۔ یہ لوگوں کی آمد و رفت ۔۔۔۔۔ تمہارا رات گئے تک باہر رہنا، ابھی تین دن پہلے ایک شخص آموں کی پیٹی دے کر گیا ہے۔''

''اماں آپ بھی بس ۔۔۔۔۔'' حسین احمد جھنجلا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

''دوست تھے میرے انہوں نے بھجوائی تھی آموں کی پیٹی ۔۔۔۔۔''

''اور یہ جو آج شخص آیا تھا یہ بھی دوست تھا تمہارا ۔۔۔۔۔ یہ یکا یک تمہارے اتنے دوست کیسے پیدا ہو گئے۔ آج سے پہلے تو کسی دوست نے تمہیں ایک مالٹا تک نہیں بھیجا اور یہ وزیروں، بادشاہوں سے کب سے دوستی ہو گئی تیری، یہ پھل کسی وزیر نے بھجوائے تھے تمہیں ۔۔۔؟''

''اوہ ۔۔۔ اماں! آپ بھی ۔۔۔۔۔ صحافی ہوں، لکھتا ہوں، لوگ جانتے ہیں، فنکشنز میں جاتا ہوں تو آفیسروں اور وزیروں سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔''

''ماں کی آنکھوں میں دھول مت جھونکو، حسین احمد!'' دادی بہت جلال میں تھیں اور حسین احمد جھنجلائے ہوئے تھے۔

''کس بات کی رشوت بھیجی تھی اس وزیر نے؟''

''اماں! میں ایک صحافی ہوں کسی گورنمنٹ کے محکمے کا کوئی افسر نہیں ہوں۔''

''ادھر میری طرف دیکھ کر بات کرو حسین احمد! تمہارے باپ نے تو تمہیں رزق حلال

سے پالا تھا حرام کا ایک لقمہ تک تمہارے منہ میں نہیں ڈالا پھر یہ حرام تیرے منہ کو کیوں لگ گیا۔"

"اماں۔۔۔!" حسین احمد کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن دادی کی نظر اس پر پڑ گئی تھی۔

"تم یہاں کیوں کھڑے ہو، تابی! جاؤ ٹیوشن پڑھنے نہیں جانا؟"

اور چھ سالہ تابی دوسری جماعت کا طالب علم دادی پر ایک ناراض سی نظر ڈالتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ اسے دادی پر بہت غصہ تھا جو اس کے ہنی بابا کو ڈانٹتی تھیں۔ اس کے ہنی بابا کتنے اچھے اور خوبصورت تھے اور پھر ہر روز ان کی تصویر اخبار میں چھپتی تھی۔ اس نے کئی اخباروں میں سے ان کے کالم کاٹ کر اپنے بیگ میں رکھے ہوئے تھے اور اپنے دوستوں کو دکھاتا تھا اور بڑے فخر سے انہیں بتاتا کہ اس کے بابا کتنے مشہور ہیں۔ یوں تو دادی سے بھی اسے بہت پیار تھا لیکن وہ دادی سے ناراض سا تھا۔ ہنی بابا جب بھی گھر آتے تھے اسے کتنا پیار کرتے تھے اس کے لئے چاکلیٹ لاتے اور پھر اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے لیکن آج ہنی بابا ابھی گھر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ دادی نے انہیں روک لیا۔ وہ ٹیوشن کے لئے جا رہا تھا اور وہ وقت سے پہلے ہی آ گئے تھے۔ ٹیچر عامرہ کا گھر ان کی گلی میں ہی تھا دادی پڑھی لکھی نہیں تھیں اور ہنی بابا دیر سے گھر آتے تھے ان کے پاس وقت نہیں تھا اس لئے وہ مس عامرہ کے پاس پڑھنے جاتا تھا۔ وہ اسے ہوم ورک کرواتی اور اسے سبق یاد کرواتی تھیں کیونکہ اس کی امی اس دنیا میں نہیں تھیں۔ دادی نے اسے بتایا تھا کہ وہ اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں۔ دادی اس کے بابا کو ہنی کہہ کر بلاتی تھیں چنانچہ جب اس نے بولنا شروع کیا تو وہ بھی انہیں ہنی بلانے لگا۔ تب دادی نے بتایا کہ "نہیں۔۔۔ تمہارے بابا ہیں وہ۔۔۔" اور وہ انہیں ہنی بابا کہہ کر بلانے لگا۔ اور آج ہنی بابا کو دادی نے ڈانٹا تھا اس لئے وہ دل ہی دل میں ان سے ناراض ہو گیا ٹیوشن سے واپس آ کر اس نے دیکھا کہ دادی مغرب کی نماز پڑھ رہی ہیں وہ خاموشی سے آ کر کمرے میں لیٹ گیا۔ اس نے آج دادی سے کہانی سنانے کے لئے بھی نہیں کہا تھا۔۔۔ اسے اپنے ہنی بابا سے بہت پیار تھا دادی رات کو جب عشاء کی نماز پڑھ کر کمرے میں آئیں تو وہ منہ پھلائے دیوار کی طرف کروٹ کئے لیٹا تھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" دادی نے اس کی پیشانی کو چھوا تھا۔

"اٹھو کھانا کھالو۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

حالانکہ اسے بہت بھوک لگی ہوئی تھی لیکن وہ دادی سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔

"نہیں میرے چاند بھوکا نہیں سوتے چلو اٹھو شاباش دیکھو میں نے تمہارے لئے کھیر بھی بنائی ہے اور تمہاری پسندیدہ آلو کی بھجیا بھی ہے۔" تب وہ مزید برداشت نہیں کر سکا تھا اور اٹھ بیٹھا تھا۔ دادی ٹرے میں کھانا لائی تھیں جو ٹیبل پر پڑا تھا۔

"ہنی بابا کھانا نہیں کھائیں گے۔"

"وہ گھر پر نہیں ہیں۔" دادی نے ٹرے اٹھایا اور اب اس کے سامنے ہی بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔ جب کبھی ہنی بابا گھر پر نہ سوتے یا لیٹ آتے تھے تو دادی یونہی کھانا کمرے میں لے آتی تھیں اور پھر وہ دونوں چار پائی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ دادی کبھی کبھی اپنے ہاتھوں سے بھی لقمہ بنا کر اس کے منہ میں ڈال دیتی تھیں۔ دادی انار دانہ ڈال کر آلو کی بہت مزیدار سی بھجیا بناتی تھیں جو اسے بہت پسند تھی۔

"آپ نے ہنی بابا کو کیوں ڈانٹا تھا دادی!" رغبت سے کھانا کھاتے ہوئے اس کی ناراضگی کسی حد تک کم ہو گئی تھی۔

"وہ ناراض ہو گئے ہوں گے۔"

"جب بچے کوئی غلط کام کریں تو کیا انہیں ڈانٹنا نہیں چاہئے؟"

دادی نے پوچھا تھا تب اس نے جواب دیا تھا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن ہنی ابا تو بڑے ہیں وہ تو غلط کام نہیں کر سکتے نا۔"

"کبھی کبھی بڑے بھی غلط کام کر جاتے ہیں پھر ان کے بڑوں کا فرض ہوتا ہے نا انہیں سمجھائیں تا کہ وہ آئندہ غلط کام نہ کریں۔"

"تو اب ہنی بابا بھی آئندہ غلط کام نہیں کریں گے۔"

آفتاب حسین نے پوچھا تھا۔ دادی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور آفتاب حسین نے بھی جواب کا انتظار نہیں کیا تھا۔

"دادی! آپ ہنی بابا کو نہ ڈانٹا کریں وہ مجھے اچھے لگتے ہیں نا، مجھے تکلیف ہوتی ہے، جب آپ انہیں ڈانٹ رہی تھیں تو مجھے بہت رونا آیا تھا۔"

"اچھا۔۔۔۔" دادی نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا اور اس روز دادی نے اسے علامہ اقبال کی والدہ کی کہانی سنائی تھی۔ آج میں تمہیں ایک سچی بات سناتی ہوں۔ علامہ اقبال ہمارے بڑے قومی شاعر ہیں ہاں ان کی نظم "لب پہ آتی ہے دعا" ہماری کتاب میں ہے۔۔۔۔"

ابھی آج ہی تو مس عامرہ نے اسے بتایا تھا یہ نظم شاعر مشرق علامہ اقبال نے لکھی ہے۔

"تو علامہ اقبال کی والدہ کو اپنے بچوں سے بہت محبت تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ انہیں رزق حلال کھلائیں، رزق حلال سمجھتے ہونا؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"ایسی کمائی جو محنت سے حاصل کی جائے، جھوٹ، دھوکے اور فریب سے نہیں۔ تو بیٹا! ایک بار انہیں شک ہوا کہ علامہ اقبال کے والد جہاں کام کرتے ہیں وہاں کی کمائی جائز نہیں تو انہوں نے اپنا زیور بیچ کر ایک بکری خرید لی جس کا دودھ وہ علامہ اقبال کو پلاتی تھیں کہ حرام کا قطرہ بھی ان کے جسم میں نہ جائے یہاں تک کہ شک دور ہوا اور۔۔۔۔"

اسے اس کہانی میں ذرا بھی مزا نہیں آیا تھا اسے تو بادشاہوں اور شہزادوں کی کہانیاں اچھی لگتی تھیں اور پھر اسے کچھ خاص سمجھ بھی نہیں آئی تھی اس رات دادی نے اسے اور کوئی کہانی نہیں سنائی تھی۔ صبح ناشتہ کرتے ہوئے اس نے ہنی بابا سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ مس عامرہ کی، میڈم مارتھا کی اور اپنے دوستوں کی اور ہمیشہ کی طرح ہنی بابا نے بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سنی تھیں۔

البتہ دادی بہت خاموش تھیں۔ دادی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اب ہنی بابا کو نہیں ڈانٹیں گی لیکن ہفتہ بھر بعد ہی اس نے سنا دادی ہنی بابا کو غصے ہو رہی تھیں۔۔۔۔ وہ باہر سے کھیل کر آیا تھا اور اس نے دیکھ لیا تھا، دادی بابا کے کمرے میں کھڑی تھیں اور ہنی بابا اپنی کرسی پر بیٹھے تھے۔ شاید وہ کچھ لکھ رہے تھے کیونکہ ان کی ڈائننگ ٹیبل پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے اور ان کی ہاتھ میں قلم تھا۔ وہ ہنی بابا کے کمرے میں جانا چاہتا تھا لیکن پھر دادی

کی آواز سن کر رک گیا۔ دادی کی آواز معمول سے قدرے بلند تھی اور اس میں غصہ بھی تھا اور بے بسی بھی۔

"ہنی تم کیوں بھول گئے ہو کہ تم وقار احمد کے بیٹے ہو؟ اس وقار احمد کے جس نے کبھی کسی سے رشوت نہیں لی، کبھی۔۔۔۔۔"

"اماں! آپ پرانے زمانے کی باتیں نہ کریں۔ یہ 1850ء نہیں ہے۔ اس زمانے کے تقاضے اور ہیں۔"

"کیا اس زمانے میں رزق حلال کے بجائے رزق حرام۔۔۔۔"

"اماں پلیز۔۔۔۔ مجھے بہت اہم رپورٹ تیار کرنی ہے۔" ہنی بابا اس روز کی طرح جھنجلائے ہوئے تھے۔

"تم نے حسین احمد آج عمر بھر کی محنت رائیگاں کر دی ہے۔ میرے دودھ میں تو حرام کی آمیزش نہ تھی پھر تجھے یہ لت کیوں لگ گئی؟"

"اللہ کا دیا سب کچھ تو تھا۔ اچھا گھر، کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور کیا چاہیئے تھا تجھے۔۔۔۔ جو تو سیدھے راستے سے ہٹ گیا۔"

"صرف پیٹ بھر لینا اور تن ڈھانپ لینا ہی زندگی نہیں ہے۔"

"تو نے تو اپنے نام کی بھی لاج نہیں رکھی حسین احمد!" دادی کی آواز میں آنسو گھل گئے تھے۔ اب وہ ہنی بابا کی منتیں کر رہی تھیں کہ وہ جن راستوں کا راہی بن گیا ہے ان سے پلٹ آئے اور ہنی بابا جھنجلا رہے تھے۔

"اب یہ ممکن نہیں اماں پلیز مجھے کچھ مت کہو۔"

اور دادی نے اس روز کے بعد چپ سادھ لی تھی۔ دادی نے ہنی بابا اور آفتاب حسین کے ساتھ کھانا چھوڑ دیا تھا وہ اپنا الگ کھانا پکاتی تھیں۔

دو دکانیں جو انہیں میکے سے وراثت میں ملی تھیں ان کا کرایہ آتا تھا جو پہلے وہ ہنی بابا کو دے دیا کرتی تھیں اب وہ اسے اپنے پاس رکھنے لگیں۔۔۔۔ پندرہ سولہ سو روپے کرایہ۔ آفتاب حسین نے کتنی ہی بار کہا تھا دادی آپ ہمارے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھاتیں اور "وہ بھوک نہیں ہے" کہہ کر ٹال دیتی لیکن اس نے کئی بار انہیں سوکھی روٹی پر اچار کی

پھانک رکھ کر یا ابلے ہوئے آلو کے ٹکڑے پر نمک مرچ چھڑک کر کھاتے دیکھا تھا اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ دادی ہنی بابا کا لایا ہوا چرغا یا روسٹ کلیجی تک نہیں کھاتی تھیں۔۔۔گھر میں گوشت پکے یا پھل آئے اور آئسکریم آئے، دادی نے کبھی نہیں کھایا تھا وہ اپنا آٹا بھی الگ برتن میں رکھتی تھیں۔کبھی کبھی ہنی بابا بہت چڑتے، بہت بولتے، دادی خاموش رہتیں لیکن کبھی جب ہنی بابا بہت شور مچاتے تو وہ صرف اتنا ہی کہتیں۔

"اب جب میں تمہیں تمہارے راستے پر چلنے سے نہیں روک رہی تو تم بھی مجھے کچھ مت کہو۔ساری عمر رزق حلال کھلایا ہے تمہارے باپ نے، اس سے پہلے تمہارے نانا نے، اب آخری عمر میں حرام سے اپنا پیٹ نہیں بھروں گی۔"

"اماں مجھے تکلیف ہوتی ہے جب گھر میں اتنا کچھ آتا ہے اور آپ بغیر تڑکے کی دال سے روکھی روٹی کھاتی ہیں۔"

"مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے بچے! جب میں سوچتی ہوں تمہارے اس جسم کو میں نے انگلی سے چھوا تک نہیں اور دوزخ میں جلایا جائے گا۔"

اور ہنی بابا پاؤں پٹختے گھر سے باہر نکل جایا کرتے۔ان دنوں انہیں بہت غصہ آنے لگا تھا اور وہ بہت اونچا اونچا بولنے لگے تھے۔مجھ سے بھی کم بات کرتے لیکن ایک روز ان کا موڈ بہت خوشگوار تھا اس روز وہ کچن میں روٹی بناتی دادی کے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے میں پاس ہی بیٹھا دودھ میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا۔

"اماں میں نے اقبال ٹاؤن میں گھر لے لیا ہے اور یہ گھر۔۔۔۔۔میں چاہتا ہوں چند دنوں تک ہم اس گھر میں چلے جائیں۔"

دادی نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر ہنی بابا کو دیکھا تھا۔

"تم چلے جاؤ۔۔۔۔۔میں یہاں ہی رہوں گی۔"

ہنی بابا کا خوشی سے چمکتا چہرہ کچھ دیر کے لئے بجھ گیا تھا لیکن پھر اس پر وہی جھنجھلاہٹ نظر آنے لگی تھی۔

"ساری دنیا کی مائیں اپنی اولاد کی کامیابیوں پر خوش ہوتی ہیں ایک آپ ہیں جنہیں میری کوئی کامیابی اور خوشی خوش نہیں کرتی۔"

"مجھے اب یہاں نہیں رہنا اماں۔۔۔۔۔!"

"میں نے روکا تو نہیں ہے۔"

"میں تابی کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔میرا ایک اسٹیٹس ہے اب میں ساری زندگی کنویں کا مینڈک بن کر نہیں رہنا چاہتا۔" وہ کھڑے ہو گئے تھے۔

"لے جاؤ۔۔۔۔" دادی نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا اور جس طرح کہا تھا ایسا ہی کیا اور جب اسلامیہ پارک کے اس چار کمروں والے اچھے خاصے کشادہ گھر کو چھوڑ کر حسین احمد اقبال ٹاؤن گئے تو انہوں نے انہیں روکا نہیں اور وہ بھی آفتاب حسین کو ساتھ لے کر چلے گئے۔آفتاب حسین مڑ مڑ کر دادی کی طرف دیکھتا رہا جو عین اس وقت نماز کے لئے کھڑی ہو گئی تھیں۔

آفتاب حسین کو وہ گھر بھی پسند آیا تھا اور اس گھر میں اپنا کمرہ بھی لیکن دادی کے بغیر اسے اکیلے کمرے میں نیند نہیں آتی تھی اسے دادی بہت یاد آتی تھیں جو رات کو اسے کہانی سناتی تھیں اور جن کے ساتھ روٹی پر اچار کی پھانک رکھ کر کھانے کا مزا چکن اور بریانی سے زیادہ آتا تھا وہ سارا دن گھر میں اکیلا ہوتا۔۔۔۔پرانے گھر کے پاس تو اس کے دوست رہتے تھے وہ شام کو گلی میں ان کے ساتھ جا کر کھیلتا تھا۔سکول میں بھی اس کے دوست تھے لیکن یہاں نئے سکول میں کوئی اس کا دوست نہ تھا۔ ہنی بابا نے اسے گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا تھا وہ خود تو صبح کے نکلے شام کے بعد گھر آتے تھے۔گھر میں چوکیدار تھا۔خانساماں تھا اور صفائی کرنے والی عورت صبح صبح آ کر صفائی کر جاتی تھی۔پھر بھی وہ تنہا تھا اور دادی سے بچھڑ کر جیسے اس کا دم گھٹنے لگا تھا وہ بیمار ہو گیا۔اتنا شدید بیمار کہ ہنی بابا دادی کی منت کر کے انہیں گھر لے آئے۔

"وہ آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ڈاکٹر کہتے ہیں اگر اسے دادی سے جدا رکھا گیا تو۔۔۔اماں! میرے بیٹے کے لئے اپنے پوتے کے لئے یہاں آ جائیں۔بے شک آپ اپنا کھانا پکائیں اپنی دکان کے کرائے سے، بلکہ مکان بھی کرائے پر دے دیں۔"

اور دادی آفتاب حسین کی محبت سے مجبور ہو کر اقبال ٹاؤن آ گئیں لیکن یہاں بھی وہ اپنا ہی کھانا کھاتیں اپنے پیسوں سے لباس خریدتیں، ہنی بابا کا لایا ہوا لباس انہوں نے

کبھی نہیں پہنا تھا۔ اس روز جب وہ ہنی بابا کے ساتھ ہاسپٹل میں آئی تھیں اور آفتاب حسین کے سرہانے بیٹھے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے حسین احمد سے کہا تھا۔

"حسین احمد! تم شادی کرلو۔ ساری عمر پڑی ہے جب پیسہ اتنی فراوانی سے ہو تو برائیاں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ پھر میں کب تک اور جیوں گی آفتاب کو ماں کی ضرورت ہے۔"

اور ہنی بابا نے دادی کے اقبال ٹاؤن آنے کے تین ماہ بعد شادی کرلی۔ نسرین عرف نینا سے جو ایک ماڈل گرل تھی۔ نہایت خوبصورت تھی۔ نیلی آنکھیں، دلکش سراپا۔۔۔اور پھر نینا کے آنے کے بیس دن بعد ہی دادی مرگئیں۔ کیا دادی کو پتا تھا کہ انہیں مرجانا ہے اس لئے انہوں نے ہنی بابا کی شادی کروائی تھی۔ اس رات گھر میں کوئی ڈنر پارٹی تھی۔ دادی سرشام ہی اوپر اپنے بیڈروم میں آ گئی تھیں۔ نیچے گراؤنڈ فلور پر ہنی بابا اور نینا ماما کے دوست اکٹھے ہوئے تھے پتا نہیں یہ گیدرنگ کس سلسلے میں تھی لیکن لان پر باربی کیو کا انتظام بھی تھا۔ گوشت بھننے کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور وہ مزے سے دادی کے ساتھ بیٹھا مسور کی بغیر تڑکے کی دال کے ساتھ روٹی کھا رہا تھا اور کبھی کبھی اچار کی ڈلی کا ننھا سا ٹکڑا دانت سے کاٹ لیتا۔ دادی نے اسے دوبار کہا تھا کہ وہ کچن میں جاکر خانساماں سے کہے کہ وہ اس کے لئے کھانا لگائے لیکن اس نے انکار کردیا تھا۔

"میں آج آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔"

اور اس رات دادی نے پہلے کی طرح لقمے بنا بنا کر اس کے منہ میں ڈالے تھے اور پھر رات سونے سے پہلے اسے کہانی بھی سنائی تھی۔ وہ کہانی بھی رزق حلال کے متعلق ہی تھی لیکن وہ کہانی اسے اچھی لگی تھی کیونکہ اس میں ایک شہزادہ بھی تھا اور ایک پری بھی اور کہانی سنتے سنتے وہ وہاں دادی کے بیڈ پر ہی سوگیا تھا اور صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دادی کمرے کے وسط میں جائے نماز پر اوندھی پڑی تھیں۔

"دادی!۔۔۔دادی!" اس نے انہیں جھنجوڑا تھا اور پھر چیختا ہوا باہر کی طرف بھاگا تھا۔ دادی اس کی خاطر آ تو گئی تھیں لیکن رہ نہیں سکی تھیں۔

دادی چلی گئی تھی ماما کی طرح اللہ کے پاس اور وہ اکیلا ہوگیا تھا۔ نینا ماما سنڈریلا

کی ماں کی طرح ظالم اور سنگ دل نہیں تھیں، وہ اس پر ظلم نہیں کرتی تھیں، مارتی پیٹتی نہیں تھیں، لیکن وہ سگی ماؤں جیسی بھی نہیں تھیں۔ بہت کم ان کی اس سے بات ہوتی تھی۔ دراصل وہ مصروف بھی تو بہت رہتی تھیں۔ ہنی بابا اور وہ صبح ہی گھر سے نکل جاتے تھے۔ اسے سکول میں ڈرائیور چھوڑنے جاتا تھا پھر کچھ دن وہ اسے گھر پر نظر آئیں ان دنوں وہ اس سے دو تین باتیں بھی کرلیا کرتی تھیں۔ پھر ایک روز وہ ہاسپٹل چلی گئیں۔ ہنی بابا نے اسے بتایا کہ "اس کا بھائی پیدا ہوا ہے۔" اور جب نینا ماما اسے لے کر گھر آئیں تو وہ ہر وقت اس کے آس پاس رہنے لگا اسے بہت پیارا لگا تھا بلکہ وہ تھا ہی بہت پیارا۔ بالکل نینا ماما جیسا نیلی نیلی آنکھوں والا جو تھوڑی تھوڑی سی سرمئی لگتی تھیں اسے۔ وہ جو دادی کے جانے سے بہت اداس تھا۔ نایاب کے آنے سے سنبھل گیا تھا۔ اس کا نام نینا ماما نے نایاب احمد رکھا تھا۔

"یہ کچھ لڑکیوں والا نام نہیں ہے۔" ہنی بابا ہنسے تھے۔

"ہوتا رہے مجھے پسند ہے۔" نینا ماما نے لاپروائی سے کہا تھا اور آفتاب حسین کو بھی یہ نام بہت اچھا لگا تھا۔

آفتاب نے دادی کی یاد بہت حد تک بھلادی تھی پھر بھی کبھی کبھی اسے دادی بہت یاد آتیں اور کھانے کی بھری ہوئی ٹیبل سے وہ اٹھ جاتا پتہ نہیں کیوں ہر چیز بے ذائقہ اور بے مزہ لگتی تھی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ سادا سے پھلکے پر اچار کی پھانک یا ابلا ہوا آلو رکھ کر روٹی کھائے۔۔۔۔۔

اور پتہ نہیں کیوں یہ آفتاب حسین مجھے آج ہاسپٹل کے اس بستر پر لیٹے ہوئے بے طرح یاد آرہا ہے۔ یہ آفتاب حسین جسے میں نے عرصہ ہوا ماضی کے کباڑ خانے میں پھینک دیا ہے۔ حالانکہ میں تو اسید عبدالرحمٰن کی کہانی لکھنا چاہتا ہوں یہ اسید عبدالرحمٰن جو پتا نہیں کیوں مجھے اتنا اچھا لگتا ہے۔۔۔۔۔ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بھی میرا دل چاہتا ہے وہ یہاں میرے پاس ہاسپٹل کے کمرے میں ہو اور میں اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کروں وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو میں نایاب سے کیا کرتا تھا۔ نایاب جسے نینا ماما بوبی کہتی تھیں لیکن مجھے اسے نایاب کہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ میں اسے ہمیشہ نایاب کہہ کر ہی بلاتا تھا۔ وہ مجھ سے پورے آٹھ سال چھوٹا تھا لیکن وہ بھی مجھے میرا نام لے کر ہی بلاتا تھا اور یہ اسید

عبدالرحمٰن یہ شاید نایاب کی طرح ہے اس کی اونچی اٹھتی ہوئی ناک، اس کی لانبی مڑی ہوئی پلکیں شاید نایاب کی طرح ہیں۔ جب پہلے روز ہی اس نے مجھے اٹریکٹ کیا تھا اور جب وہ میرے آفس سے چلا گیا تھا تو میرا دل چاہتا تھا سے روک لوں اسے کہوں اسید عبدالرحمٰن کچھ دیر اور بیٹھو میرے پاس، مجھے تمہارے قرب سے نایاب کی خوشبو آ رہی ہے۔۔۔۔۔۔

نایاب جو مجھے بہت پیارا تھا بہت عزیز تھا۔۔۔۔ مجھ سے آٹھ سال چھوٹا میرا بھائی۔۔۔۔ جو بہت نازک سا تھا۔۔۔۔ کئی بار میں نے اسے مس کیا تھا۔

”یار! تمہیں تو لڑکی ہونا چاہئے تھا۔“ اور وہ ہمیشہ شرما جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت خوبصورت تھے۔ لانبی پتلی آرٹسٹک انگلیوں والے۔۔۔۔۔ میں کہتا تھا۔

”نایاب! تم آرٹسٹ بنو گے اور بہت مشہور ہو گے۔“ لیکن وہ تو ڈاکٹر بننا چاہتا تھا اور چودہ سال کی عمر میں اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا اور سولہ سال کی عمر میں ایف ایس سی میں بورڈ ٹاپ کر کے وہ کنگ ایڈورڈ میں چلا گیا تھا اور اب میں کہتا تھا۔

”نایاب! تم سرجن بنو گے۔ تم آرٹسٹ نہیں بنے تو اب تمہیں سرجن ہی بننا ہے۔ یہ جو تمہاری انگلیاں ہیں ناں یہ بتاتی ہیں کہ تم بہت کامیاب سرجن بنو گے بہت زبردست۔۔۔۔“

وہ مسکرا دیتا۔۔۔۔ وہ بہت کم گو تھا۔۔۔۔ زیادہ تر پڑھتا رہتا۔۔۔۔ نینا ماما کے پاس اس کے لئے کبھی وقت نہیں رہا تھا۔ وہ بے حد مصروف رہتی تھیں اور ہنی بابا تو ہمیشہ ہی مصروف رہتے تھے۔ کبھی کبھی جب میں اسے بتاتا کہ دادی مجھے بچپن میں بہت کہانیاں سناتی تھیں تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت اور حسرت ایک ساتھ اتر آتی تھی۔ نینا ماما نے تو کبھی اسے کوئی کہانی بھی نہیں سنائی تھی وہ تو یوں ہی آیاؤں کے ہاتھوں پل کر بڑا ہوا تھا۔۔۔۔ وہ جب تین سال کا تھا تو ہنی بابا نے ڈیفنس میں گھر لے لیا تھا اور ڈیفنس کے اس گھر میں ہمہ وقت دو دو گاڑیاں کھڑی رہتیں۔ ملازموں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔ ہنی بابا جو کبھی ایک اخبار کے صحافی تھے اور ہفتہ وار کالم لکھا کرتے تھے۔ اب خود ایک اخبار نکالتے تھے اور اس اخبار کی سرکولیشن کئی پرانے اخباروں سے بہت زیادہ تھی۔ ایک دم ہی ہنی بابا بہت مشہور ہو گئے تھے۔ ان کا اخبار ”صبح نو“ ہر حلقے میں ہی مقبول تھا۔ جہاں کہیں کوئی مسئلہ ہوتا

ہنی بابا پہنچ جاتے تھے۔ کسی غریب کے ساتھ زیادتی ہوتی ان کا اخبار اس کی مدد کرتا۔

نایاب بابا کو بہت آئیڈیلائیز کرتا تھا۔ وہ جب بھی ان کے متعلق بات کرتا اس کے لہجے میں فخر ہوتا۔ پنجاب کے ایک دور دراز گاؤں میں ایک مزارع پر زمیندار نے ظلم کیا اس کے خاندان کی عورتوں کو بے عزت کیا۔ تو ہنی بابا اپنے اخبار کے عملے کے ساتھ وہاں گئے۔ وہاں کے تھانے میں رپورٹ درج کروائی اور ان کے لئے اپنے اخبار میں کالم لکھے۔ اس طرح کراچی میں ایک بیوہ عورت کی زمین پر ایک حکومتی عہدے دار نے قبضہ کر لیا تو ہنی بابا کے اخبار نے تہلکہ مچا دیا یہاں تک کہ اس شخص کو وہ زمین واپس دینا پڑی۔

میں سوچتا تھا شاید ہنی بابا بدل گئے ہیں۔ شاید دادی کی موت کے بعد انہوں نے رزق حلال کا مفہوم سمجھ لیا ہے۔ لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ہنی بابا کے پاس اتنی بے تحاشا دولت کہاں سے آ گئی ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ میں دادی کی بتائی ہوئی کہانیاں اور باتیں بھولتا جا رہا تھا۔ میری بیسویں سالگرہ پر ہنی بابا نے مجھے گاڑی گفٹ کی تھی اور یہ انہی دنوں کی بات ہے میں بی۔اے فائنل میں تھا۔ جب میں نے ہنی بابا کا ایک دوسرا رخ جانا تھا۔ میں نایاب کی طرح جینئس نہیں تھا میں نے سولہ برس کی عمر میں میٹرک کیا تھا اور اب بیس سال کی عمر میں گریجویشن کر رہا تھا۔ بابا چاہتے تھے کہ میں انجینئر یا ڈاکٹر بننے کے بجائے صحافی بنوں اور ان کا اخبار سنبھالوں۔ مجھے خود بھی سائنس پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگرچہ میٹرک میں، میں نے 75 % نمبر لئے تھے پھر بھی بابا کے کہنے پر میں نے آرٹس لے لی تھی اور جرنلزم کا سبجیکٹ رکھا تھا۔ اس روز میں کالج سے جلدی گھر آ گیا تھا۔ مجھے فلو ہو رہا تھا۔ اور پھر شام کو مجھے نایاب کے سکول میں بھی جانا تھا اسے آٹھویں کے امتحان میں فرسٹ آنے پر میڈل ملنا تھا اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کے سکول کے فنکشن میں ضرور آؤں گا۔ ہنی بابا کو آج شام کراچی جانا تھا اور نینا ماما کسی پروڈکٹ کی ماڈلنگ کے لئے دوبئی گئی ہوئی تھیں۔ فنکشن شام کو چار بجے تھا میں نے سوچا کہ میں کچھ دیر آرام کر لوں گا تو سر درد میں آرام آ جائے گا۔ سو میں صرف ایک پیریڈ اٹینڈ کر کے گھر آ گیا تھا۔ گیارہ بجے تھے۔ میں جب صبح کالج گیا تھا تو ہنی بابا سو رہے تھے۔ وہ عموماً دس ساڑھے دس بجے آفس جاتے تھے۔ میرا خیال تھا بابا جا چکے ہوں گے لیکن وہ لاؤنج میں تھے اور موبائل پر کسی سے

بات کر رہے تھے۔

"تو ملک صاحب! سوچ لیں صبح کے اخبار میں سب چھپ جائے گا کہ آپ نے کیا کیا کمایا ہے اور کیسے؟"

دوسری طرف سے جانے کیا کہا گیا تھا تو وہ جواباً بولے تھے۔

"نہیں نہیں۔۔۔۔۔ ملک صاحب! سب پروف ہیں میرے پاس، حسین احمد اس طرح بغیر پروف کے بات نہیں کرتا۔ آج کا اخبار تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔"

"اور اگر نہیں دیکھا تو اب دیکھ لیں۔ یہ تو صرف معمولی سی جھلک ہے۔"

ان کی پیٹھ تھی میری طرف، پھر وہ بات کرتے کرتے میری طرف مڑے تھے اور اشارے سے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا تھا۔ میں خاموشی سے ایک طرف صوفے پر بیٹھ گیا۔

"او کے۔۔۔۔ پھر شام میں بات ہوگی۔" فون آف کر کے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے تھے۔

"خیریت آج کالج نہیں گئے۔"

"گیا تھا آ گیا ہوں کچھ فلو کی شکایت ہے۔"

"ڈاکٹر عثمانی کے پاس چلے جاؤ۔" ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے ہنی بابا! میں ابھی اسپرین لے کر سو جاؤں گا۔"

"او کے۔۔۔۔ تو پھر میں چلتا ہوں۔"

کرنڈی کے شلوار قمیض میں ملبوس قیمتی گھڑی کلائی پر باندھے خوشبو میں بسے وہ بے حد شاندار لگ رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے ان پر فخر محسوس کیا اور پھر نایاب کو بتا کر کہ میں آ گیا ہوں اور اگر میں سو گیا تو وہ مجھے اٹھا دے۔ اپنے کمرے میں آ گیا۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے نیند نہیں آئی۔ میں بابا کے متعلق سوچ رہا تھا اور ان کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر لیٹے لیٹے مجھے کئی باتیں یاد آئی تھیں۔ ایک بار جب کلاس میں ہنی بابا کی یتیم بچوں کے لئے کی جانے والی کوششوں کا ذکر ہو رہا تھا اور پروفیسر ہنی بابا کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ تب میں وہاں سٹاف روم میں سر حیدر سے کوئی بات پوچھنے گیا تھا اور پروفیسر منیر کے ہاتھ میں "صبح نو" کا آج کا اخبار تھا اور سر حیدر نے اطمینان سے پروفیسر منیر کی

بات سننے کے بعد کہا تھا۔

"منیر صاحب! آپ حقیقت نہیں جانتے یہ شخص جو بڑا ریفارمر بنا ہوا ہے اندر سے پورا بلیک میلر ہے یلیو جرنلزم کا علمبردار۔"

"لیکن حیدر صاحب۔۔۔۔۔۔!" پروفیسر منیر بحث کرنے لگے تھے اور میں باہر آ گیا تھا۔ یہ کوئی دو سال پہلے کی بات ہے اور بستر پر لیٹے لیٹے مجھے کئی اور باتیں بھی یاد آئی تھیں۔ کسی فنکشن کسی ڈنر میں ہونے والی دبی دبی سرگوشیاں۔ میں لیٹے لیٹے سب کا تجزیہ کر رہا تھا اور پھر مجھے یہ جان لینے میں زیادہ دن نہیں لگے تھے کہ ہنی بابا بڑے لوگوں اور کالی بھیڑوں کو بلیک میل کرتے ہیں۔

سندھ کے کسی دور دراز گاؤں میں ایک غریب عورت پر ظلم ہونے پر تڑپ جانے والے ہنی بابا کے دو روپ تھے۔ بڑے آفیسرز، اعلیٰ عہدیداروں کی کمزوریاں، خامیاں وہ کیسے جانتے تھے میں نے اس کے متعلق معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہنی بابا بھی اب مجھ سے زیادہ احتیاط نہیں کرتے تھے۔ میں نے کئی بار انہیں اپنے سامنے فون کرتے دیکھا تھا۔ بی۔ اے کے ایگزام کے بعد میں فارغ ہوا تو مجھے ہنی بابا کے بارے میں اور بھی بہت کچھ معلوم ہوا تھا۔۔۔۔۔ وزیراعظم ہاؤس تک ان کی رسائی تھی۔ وہ وزراء کے ہاں پارٹیوں اور ڈنرز میں مدعو کئے جاتے تھے۔ اور نینا ماما بھی ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔

وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ آفس جایا کروں اور ابھی سے عملی طور پر ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دوں۔ لیکن پتا نہیں کیوں میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے جرنلسٹ نہیں بننا۔ میں نے دادی کی طرح بابا سے کچھ کہا تو نہیں تھا لیکن شاید یہ دادی کی چند سالہ تربیت اور سبق آموز کہانیوں کا اثر تھا کہ مجھے صحافت سے نفرت سی ہو گئی تھی اور ایک صبح ناشتے کے بعد میں نے حتمی فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے جرنلزم نہیں پڑھنا۔ اس روز ناشتے کے بعد بابا نے کسی صاحب کا نمبر ملایا تھا اور چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ایک مسکراتی نظر نینا ماما اور مجھ پر ڈالی تھی۔ نایاب اپنے سکول جا چکا تھا۔

"تو شیخ صاحب! کیسی لگی آپ کو یہ خبر؟"

"ارے نہیں شیخ صاحب! جھوٹ کہاں ہے؟"

"پرواہ کیسے نہیں ہوگی آپ کو، جب اخبار میں خبر کی پوری وضاحت آئے گی۔
احتساب ہوگا۔۔۔۔ بھلے آپ کا کچھ بھی نہ بگڑے لیکن بدنامی تو ہوجائے گی نا شیخ صاحب!
لیکن کس کس سے وضاحتیں کرتے پھریں گے آپ، کہ جھوٹی خبر تھی، سازش تھی۔۔۔۔۔ یہ
تو ٹریلر ہے شیخ صاحب!"

"بکومت۔۔۔۔"

فون میں سے اُن صاحب کی دھاڑ صاف سنائی دی تھی۔ نینا ماما لاپروائی سے
گھونٹ گھونٹ چائے حلق سے اتار رہی تھیں۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے میں ہنی بابا کی
بات بہت دھیان سے سن رہا تھا۔

"میں تو بک نہیں رہا شیخ صاحب! صرف بتا رہا ہوں۔۔۔۔ خبر تو چھوٹی سی
ہوگی لیکن کئی کھاتے کھل جائیں گے۔"

"جو مرضی کرلو ذلیل۔۔۔۔ بلیک میلر۔۔۔۔ میرا دامن صاف ہے اور مجھے ایسی
خبروں کی پرواہ نہیں۔" ایرپیس سے پہلے سے زیادہ بلند دھاڑ سنائی دی تھی اور ساتھ ہی
ریسور پٹخ کر رکھ دیا گیا تھا۔

"بڑا ٹیڑھا آدمی ہے یہ شیخ کرامت بھی۔" نینا ماما نے تبصرہ کیا تھا۔

"میں تو کہتی ہوں چھوڑ دو اسے۔"

"اب تو نہیں، اس نے مجھے گالی دی ہے کچھ تو مزا چکھے گا اب۔۔۔۔"

"یہ کون تھا۔۔۔؟" میں نے لاپروائی سے پوچھا تھا۔

"شیخ کرامت علی، ایک حکومتی ادارے کا چیئرمین۔"

ہنی بابا نے بتایا تھا اور مجھے اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اس کا بیٹا میٹرک
تک میرے ہی سکول میں پڑھتا تھا بعد میں وہ کہیں اور چلا گیا تھا میں نے دو ایک بار انہیں
دیکھا تھا۔ بے حد پرہیزگار اور ایماندار آفیسر کے طور پر ان کی شہرت تھی اور بعد کی تحقیق نے
بھی یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ ایک ایماندار شخص ہے۔ میں جو سمجھتا تھا کہ ہنی بابا صرف لوگوں کی
کمزوریوں کو بلیک میل کرتے ہیں۔ یہ جان کر ذرا حیران ہوا تھا کہ وہ شیخ صاحب جیسے
شریف آدمیوں کو بھی زچ کرنے سے باز نہیں آتے۔ اگلے دن سے ہی شیخ صاحب کے

خلاف "صبح نو" میں خبریں آنی شروع ہوگئی تھیں اور وہ فیصلہ جو اس روز ناشتے کی ٹیبل پر
بیٹھے بیٹھے میں نے کیا تھا کہ مجھے خود کو ذلیل، بلیک میلر نہیں کہلوانا۔ بعد کے واقعات نے اس
پر مہر ثبت کردی تھی۔ ہنی بابا حیران ہوئے تھے۔

"تم جرنلزم نہیں لے رہے تو پھر کیا کرو گے۔"

"پتا نہیں ابھی میں نے کچھ نہیں سوچا۔" اور اس سوچنے میں ایک سال
ضائع ہوگیا تب اگلے سال میں نے انگلش لٹریچر میں ایڈمیشن لے لیا۔ ان دنوں اچانک ہی
مجھے ادب سے لگاؤ ہوگیا تھا اور میں نے اردو انگریزی کا سارا نیا پرانا ادب پڑھ ڈالا تھا اور
پھر ایک روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں لکھ سکتا ہوں اور میں نے ایک عام سی رومانی کہانی لکھ
کر ایک غیر معروف سے پرچے میں بھیج دی تھی جو چھپ بھی گئی تھی۔

"یعنی چور چوری سے چلا جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔"

یہ نینا ماما کا تبصرہ تھا جو میری چند کہانیاں چھپنے کے بعد انہوں نے کیا تھا۔

"ظاہر ہے خون کا اثر تو ہوگا۔ لکھنے کی صلاحیت اس کے خون میں ہے۔"

اس سے ہنی بابا نے مجھے یعنی آفتاب حسین کو بڑے فخر سے دیکھا تھا۔ لیکن میں
نے سوچا تھا کہانیاں لکھنا اخباری کالم لکھنے سے ہزار ہا درجہ بہتر ہے۔ کم از کم میں ان کہانیوں
سے کسی کو بلیک میل تو نہیں کر رہا۔ جلد ہی یونیورسٹی میں بھی کہانی نگار کی حیثیت سے شہرت
ہوگئی تھی کئی لڑکیاں میری طرف بڑھی تھیں۔ وقتی طور پر لڑکیوں سے دوستی کرنا گپ شپ
لگانا، کہیں بیٹھ کر کافی یا چائے پی لینا اور ٹھیک تھا لیکن جب عارفہ عبدل کے ساتھ میرا نام
آنے لگا اور وہ اپنی بدنامی کا خیال کئے بغیر مجھے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے لگی اور مجھے لمبے
لمبے لیٹر لکھنے لگی تو میں یکا یک بیزار ہوگیا حتیٰ کہ اس کی جنونی محبت سے اور میں نے یونیورسٹی
آنا بھی چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ ایگزام تک نہیں دیا حالانکہ وہ فائنل سمسٹر تھا۔ یوں دو سال
ضائع ہوگئے تھے ہنی بابا نے مجھے کچھ نہیں کہا تھا۔ نہ ہی نینا ماما نے۔ لیکن نایاب نے ضرور
پوچھا تھا۔

"تابی! آپ نے پیپر نہیں دیئے اس طرح تو دو سال ضائع ہوجائیں گے۔"

وہ ان دنوں ایف۔ ایس۔ سی کے ایگزام سے فارغ ہو چکا تھا۔ مجھ سے آٹھ

سال چھوٹا میرا بھائی اب میڈیکل کالج میں داخلے کی تیاری کر رہا تھا جبکہ میرے پاس سمپل بی۔اے کی ڈگری تھی۔ مجھے آگے کیا کرنا چاہئے مجھے سمجھ نہیں آتا تھا۔ہنی بابا کے پاس مجھے گائیڈ کرنے کے لئے وقت ہی کہاں تھے۔ وہ آفس سے فارغ ہوتے تو نینا ماما کے ساتھ کہیں نہ کہیں، کسی فنکشن، کسی پارٹی یا ڈنر میں چلے جاتے۔۔۔۔وہ مطمئن تھے کہ میں لکھ رہا ہوں۔ بھلے وہ بے مقصد کہانیاں ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔۔

ایک روز انہوں نے کچھ کہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو وہ ایک میگزین کا ڈیکلریشن لے لیتے ہیں میں اپنا میگزین نکال لوں۔۔۔۔لیکن میں ان دنوں شدید پچھتاوے میں گھرا ہوا تھا اس سے تو اچھا تھا میں بھی سائنس سبجیکٹ لے لیتا تو انجینئر یا ڈاکٹر بن جاتا یا اگر نہ بن سکتا تو کسی بھی مضمون میں ایم ایس سی کی ڈگری لے لیتا۔

اس روز میں ایک دوست کے ساتھ یونیورسٹی گیا تھا اس کی بہن کے لیے ایڈمشن فارم لینا تھا وہ کون تھی میں نہیں جانتا تھا لیکن اس کی سادگی میں بلا کی اپیل تھی اس کی خوبصورتی میں عجیب طرح کی پاکیزگی اور معصومیت تھی اور اس میں بلا کا اعتماد بھی تھا وہ بالکل اکیلی تھی۔اعظم کہیں چلا گیا تھا اب وہ میرے پاس آئی تھی۔

''آپ نیو ہیں یا پرانے سٹوڈنٹ ہیں۔''

''ایکچولی مجھے ماس کمیونیکیشن میں ایڈمیشن کے لیے داخلہ فارم جمع کروانے ہیں اور مجھے پتا نہیں چل رہا کہ کہاں کرواؤں۔''

''لائیے مجھے دے دیجیے میں بھی ماس کمیونیکیشن میں ایڈمشن لے رہا ہوں اور میں نے صرف اس لڑکی کی خاطر ماس کمیونیکیشن میں ایڈمیشن لے لیا۔ہنی بابا کے تعلقات میرے ایڈمیشن کے سلسلے میں کام آئے تھے اور انہوں نے میرے اس فیصلے پر بہت زیادہ اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ مجھے پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی تو نہ تھی لیکن فاطمہ افتخار کی خاطر میں دلچسپی لیتا تھا۔

فاطمہ افتخار یونیورسٹی کی ساری لڑکیوں سے مختلف تھی نہ تو وہ حجاب لینے والی کچھ لڑکیوں کی طرح خود کو پوز کرتی تھی اور نہ ہی ماڈرن لڑکیوں کی طرح جینز کی ٹی شرٹ پہننے والے طبقے سے اس کا تعلق تھا۔ سادا سی شلوار قمیض اور بڑے سے ڈوپٹے میں ملبوس وہ بے

حد اعتماد سے ہر ایک سے بات کرتی تھی کسی سے اس کی فرینڈ شپ نہیں تھی اور کسی سے اس کی دشمنی نہیں تھی وہ لڑکوں سے بات کرتے ہوئے شرم اور گھبراہٹ کی ایکٹنگ نہیں کرتی تھی اور نہ ہی وہ اوور ہوتی۔ پروفیسر اسے اس کی ذہانت کی وجہ سے پسند کرتے تھے اور کلاس فیلوز اس کا احترام کرتے تھے اور میں یعنی آفتاب حسین، میں نے کبھی خود کو ٹٹولنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن میں یہ جانتا تھا کہ جس روز وہ نہیں آتی تھی میرا وہ دن بہت اداس اور بے چین گزرتا تھا۔ شاید یہ محبت تھی لیکن میں ابھی اسے Judge نہیں کر پا رہا تھا بس میں صرف اس کی خاطر اس شعبے میں آیا تھا ورنہ میں ہنی بابا کی تجویز پر غور کر رہا تھا یعنی اپنا ایک میگزین نکالنے کی۔

سلام ودعا تو تقریباً روز ہی ہوتی تھی لیکن کبھی کبھار سلام ودعا سے ہٹ کر بھی کوئی بات ہو جاتی کبھی کسی لیکچر کے متعلق، کبھی ہو نہی کسی کرنٹ افیر پر، لیکن بس چند جملے اور میں ہر روز اعتراف کرتا کہ فاطمہ بہت مختلف ہے بہت منفرد ہے اور پھر جب اسے پتا چلا کہ میں کہانیاں لکھتا ہوں اور اس نے میری دو ایک کہانیاں پڑھیں تو ان پر کھل کر تبصرہ کیا۔

''آپ کی تحریر میں تاثر ہے اور اس میں خوبصورتی ہے، حسن ہے، پڑھنے والے آپ کی تحریر سے متاثر ہوتے ہیں۔تو پھر آپ ایسی کہانیاں کیوں نہیں لکھتے جو بے مقصد نہ ہوں، سچائی کی علمبردار ہوں، معاشرے کے ناسوروں کو ختم کرنے کی کوشش کریں، اپنی تحریر سے لوگوں کو کمینکیٹ کریں، انہیں جہالت کے اندھیرے سے نکالیں۔'' اور مجھے پتا بھی نہیں چلا تھا کہ کب میرے قلم نے اسی راہ پر قدم رکھ دیا تھا۔اس نے میری کہانی سراہا تو میرا قلم سرپٹ دوڑنے لگا لوگ مجھے بھی پہنچاننے لگے۔یونیورسٹی سے ہٹ کر باہر بھی میرا ایک نام بننے لگا تھا میں نے ان دنوں کچھ نظمیں بھی لکھی تھیں اور تب اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''آپ نظمیں لکھنے کی کوشش نہ کریں تو اچھا ہے کہیں دوسرا تاثر پہلے تاثر کو خراب نہ کر دے۔''

اس روز اس نے بے بی پنک کلر کا کاٹن کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کی گندمی رنگت پر بھی گلابی رنگ بکھرا ہوا تھا۔ حبیب احمد کلاس میں میری نظم پڑھ کر سنا رہا تھا جب اس

نے تبصرہ کیا تھا اس روز وہ اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

اس روز میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کی تعریف کروں لیکن پھر چاہنے کے باوجود میں کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔اس روز یونیورسٹی میں موسم گرما کی چھٹیاں ہوگئی تھیں اور ان ساری چھٹیوں میں کتنی ہی بار میں نے سوچا تھا کہ کاش میں کبھی فاطمہ افتخار کے گھر کا فون نمبر لے لیا۔پتا نہیں وہ اس طرح بات کرنا پسند بھی کرتی ہے یا نہیں اور ان چھٹیوں میں ایک ہزار بار میں نے اعتراف کیا تھا کہ مجھے فاطمہ افتخار سے محبت ہوگئی ہے۔نایاب بھی ان دنوں اپنے ایگزام میں مصروف تھا اور میں اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ میرا دل چاہتا تھا میں اپنے سے آٹھ سال چھوٹے اپنے اس بھائی سے اپنا راز کہوں اور اسے بتاؤں کہ مجھے اس بظاہر عام سے گندمی رنگت والی لڑکی سے محبت ہوگئی ہے۔خدا خدا کر کے اس کے پیپرز ختم ہوئے تھے تو میں نے سوچا تھا کہ وہ ریلکس کر لے تو پھر کہیں گھومنے کا پروگرام بناتے ہیں کاغان، مری کہیں بھی جہاں اس کا دل چاہے۔

وہ کالج سے آکر سو گیا تھا اور میں حبیب کی طرف چلا گیا تھا اور پھر رات چند دوستوں کے ساتھ ڈنر کر کے میں بہت لیٹ گھر آیا تھا اس لیے میں نے نایاب کو ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔پڑھتا بھی تو بہت تھا نا شاید دو تین گھنٹے ہی سوتا ہوگا۔کل تک بالکل ریلکس ہوجائے گا تو پھر دونوں کہیں گھومنے پھرنے نکل جائیں گے۔میں نے ہنی بابا سے بات کر لی تھی انہیں کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ وہ تو خوش ہوئے تھے کہ اس طرح نایاب بھی کچھ تفریح کر لے گا۔ہنی بابا اور نینا ماما بہر حال نایاب سے اور مجھ سے محبت کرتے تھے۔

میں اگرچہ بستر پر لیٹتے ہی سو گیا تھا لیکن صبح نو بجے ہی آنکھ کھلی تھی یوں بھی یونیورسٹی بند تھی اور ان دنوں میں لیٹ ہی اٹھ رہا تھا تیار ہو کر گنگناتے ہوئے میں ڈائننگ ٹیبل پر آیا تو ناشتہ ٹیبل پر لگ چکا تھا چھٹیوں میں اکثر ناشتہ ہم سب اکٹھا ہی کرتے تھے۔

"آؤ یار! تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے، پوریاں اور نان منگوائے ہیں۔"

"نایاب نہیں آیا۔"

میں نے ماما کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے صابر سے کہا ہے اگر وہ سو رہا ہے تو اسے نہ جگائے۔"

نینا ماما نے ایک پوری نکال کر میری پلیٹ میں رکھی اور چنوں کا ڈونگا میری طرف بڑھایا تب ہی نایاب نے اندر داخل ہوتے ہوئے سب کو سلام کیا میں نے اسکی طرف دیکھا اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئیں اور سرخ ہو رہی تھیں وہ میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"نایاب! تم رات بھر سوئے نہیں۔"

میں نے بغور اسے دیکھا تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر نفی میں سر ہلا دیا۔

"بھئی ---یہ تابی کاغان وغیرہ جانے کا پروگرام بنا رہا ہے کیا خیال ہے تمہارا---؟"

ہنی بابا نے بڑی خوش دلی سے پوچھا۔لیکن نایاب نے جواب نہیں دیا تھا وہ پتہ نہیں کیا سوچ رہا تھا۔نینا ماما نے سلائیس میں مکھن لگا کر اس کی پلیٹ میں رکھا کیونکہ وہ پوریاں نہیں کھاتا تھا اور نینا ماما ایسی مہربانی کبھی کبھی ہی کرتی تھیں۔لیکن اس نے پلیٹ میں رکھے سلائیس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"بوبی ڈیئر کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

نینا ماما اسے ہی دیکھ رہی تھیں اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اب کے بھی وہ کچھ نہیں بولا تھا اور ٹی پاٹ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے اس نے ایک کپ قہوہ انڈیلتے ہوئے ہنی بابا کی طرف دیکھا۔

"ہنی بابا! آپ نے جوہر ٹاؤن میں کوئی پلاٹ خریدا ہے کیا؟"

"ہاں---" ہنی بابا کی آنکھوں میں ذرا سی حیرت نمودار ہوئی تھی۔وہاں ایک ساتھ کنال کنال کے تین پلاٹ تھے میں نے خرید لیے فی الحال تو بہت مناسب ریٹ پر ملے ہیں جلدی وہاں بھی قیمتیں بڑھ جائیں گی ابھی وہاں اتنی آبادی نہیں ہوئی کئی پلاٹ خالی پڑے ہیں۔ان پلاٹس کے ساتھ ایک اور کنال کا پلاٹ تھا لیکن اس پر نامکمل سی تعمیر ہے لیکن وہاں کوئی رہتا ہے میں تو سوچ رہا ہوں وہ جگہ بھی خرید لوں اس طرح چار کنال پر بہت خوبصورت گھر بنے گا۔میں نے ایک گھر دیکھا تھا بہت پہلے، تب سے میں سوچتا ہوں کہ ویسا ایک گھر بناؤں گا۔یوں سمجھ لو ایسا گھر بنانا ایک خواب ہے میرا، لیکن چوتھے پلاٹ پر جو

ناکمل گھر ہے اس کا مالک اسے بیچنے پر تیار نہیں،' ہنی بابا نے پوری تفصیل بتائی۔

''اور آپ نے اس گھر کی مالکہ کو مجبور کیا ہے کہ اگر اس نے وہ گھر نہ بیچا تو آپ اس کی بیٹیوں کو اغوا کر لیں گے کیوں۔۔۔؟ بابا۔۔۔! کیوں۔۔۔؟''

نایاب نے یکدم تیز لہجے میں کہا تھا۔ وہ ہنی بابا کی طرف دیکھ رہا تھا جن کے چہرے کا رنگ یکدم بدلا تھا میں نے جو بہت رغبت سے پوریاں کھا رہا تھا کھانا چھوڑ کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ بابا نے خود کو کمپوز کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔

''یار! تمہیں کس نے یہ بتایا ہے میں نے یہ ضرور کہا ہے کہ میں وہ جگہ خریدنا چاہتا ہوں منہ مانگی قیمت دینے پر تیار ہوں لیکن ایسی کوئی دھمکی وغیرہ نہیں دی ہے۔''

لیکن نایاب نے جیسے ان کی بات نہیں سنی تھی وہ ان کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

'ہنی بابا! مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ شخص جو ایک غریب اور نادار عورت کا حق دلوانے کے لئے ایوان صدر تک ہلا دیتا ہے، ریلیاں نکالتا ہے، اخبار میں کالم چھاپتا ہے، وہ خود ایک بیوہ سے اس کے سر چھپانے کا ٹھکانہ چھین رہا ہے اور اس کی جوان بچیوں کے اغوا کی دھمکی دیتا ہے محض اپنا محل تعمیر کرنے کیلئے۔''

''نایاب۔۔۔بوبی۔۔۔'' ہنی بابا اور نینا ماما کے لبوں سے ایک ساتھ نکلا تھا۔

''میں تو بہت آپ کو آئیڈلائیز کرتا تھا ہنی بابا! آپ کی پرستش کرتا تھا فخر کرتا تھا کہ میرا باپ مظلوموں کی دادرسی کرتا ہے۔'' اب اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی تھی اور آواز بھی بھرا گئی تھی۔

''آپ نے میرا مان توڑ دیا، میرا فخر چھین لیا۔'' وہ یکدم کھڑا ہو گیا تھا۔

''سنو۔۔۔سنو! میری جان وہ گھر تو میں تمہارے لیے صرف تمہارے لیے بنانا چاہ رہا تھا یہ گھر تابی کا ہے وہ۔۔۔'' اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا لیکن آواز میں وہی اعتماد تھا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔

''نہیں چاہیے مجھے وہ گھر۔ جو ایک بیوہ کے آنسوؤں اور یتیم بچیوں کی آہوں پر تعمیر کر رہے ہیں آپ۔۔۔''

وہ زور سے چیخا تھا۔ وہ جو بہت آہستگی اور نرمی سے بات کرتا تھا جس کی بات

سننے کے لیے بعض اوقات مجھے اپنی سماعت پر اچھا خاصا زور دینا پڑتا تھا۔

''اس کے بجائے میں ایک جھونپڑی میں رہنا پسند کروں گا۔'' وہ کرسی کو دھکیلتا ہوا تقریباً بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا۔ میں نے ایک نظر ہنی بابا اور نینا ماما کے چہرے پر ڈالی تھی اور پھر کرسی گھسیٹ کر کھڑا ہوا تھا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ نایاب اپنے بیڈ پر اوندھا لیٹا رو رہا تھا۔

''نایاب۔۔۔!'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے روتے روتے سر اٹھایا۔

''تابی! میں تو بابا کو بہت آئیڈلائیز کرتا تھا بھائی! وہ تو میرا آئیڈیل تھے۔'' میں نے ہاتھ پھیلا کر اسے ساتھ لگا لیا اور پھر ہولے ہولے تھپکنے لگا میں نے اسے پہلی بار روتے دیکھا تھا بچپن میں اگر کبھی وہ گر جاتا یا چوٹ لگ جاتی تھی تب بھی وہ نہیں روتا تھا لیکن یہ چوٹ بہت شدید تھی جس نے اس کے دل کے آئینے پر ضرب لگائی تھی۔

''بھائی۔۔۔!'' کچھ دیر بعد آنسو پونچھ کر وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا تو اس نے بتایا۔

''آج دوپہر میں باہر جانے کے لیے نکلا، مجھے کچھ کتابیں خریدنی تھیں کہ گیٹ پر ایک عورت اور اس کی ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی تھی وہ اندر آ کر ماما سے ملنا چاہتی تھی لیکن چوکیدار انہیں روک رہا تھا۔''

''بیگم صاحبہ گھر پر نہیں ہیں۔''

وہ بار بار کہتا تھا لیکن وہ نہیں مان رہی تھیں مجھے شکل سے وہ بہت پریشان لگیں تو میں نے انہیں بتایا کہ ''ماما واقعی گھر پر نہیں ہیں میں ان کا بیٹا ہوں آپ جو کہنا ہے مجھے کہہ دیں وہ جب گھر آئیں گی تو میں بتا دوں گا۔'' انہوں نے کہا کہ لمبی بات ہے یہاں گیٹ پر کھڑے کھڑے نہیں بتائی جاسکتی تب میں انہیں اندر لاؤنج میں لے آیا۔

میں بہت دھیان سے اس کی بات سن رہا تھا وہ بات کرتے ہوئے بھی بہت مضطرب سا تھا انہوں نے مجھے بتایا ''کہ چند سال قبل ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا ان کی دو بیٹیاں ہیں ایک وہ جوان کے ساتھ تھی اور ایک اس سے بڑی جو کالج میں پڑھتی ہے۔ انتقال سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے جگہ لے کر گھر بنانا شروع کیا تھا ابھی گھر نامکمل تھا کہ ان

کے شوہر کو ہارٹ کی تکلیف شروع ہوگئی تو وہ اس نامکمل گھر میں ہی شفٹ ہوگئے کیونکہ کرائے کے جس گھر میں وہ رہتے تھے وہ خالی کرالیا گیا تھا۔شوہر کی بوڑھی والدہ بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں شفٹ ہونے کے تقریباً چھ ماہ بعدان کے شوہر کا انتقال ہو گیا وہ خاتون اب کسی پرائیویٹ سکول میں جاب کرتی ہے۔''

وہ سانس لینے کے لیے ذرارکا۔''اب پچھلے تین ماہ سے بابا انہیں تنگ کر رہے ہیں کہ وہ یہ گھران کے پاس فروخت کردیں جبکہ وہ ایسا نہیں چاہتیں ان کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔بابا نے جتنی رقم کی آفر کی ہے انہیں،اتنے میں تو دومرلے کا ایک گھر بھی نہیں خرید سکتے اور یوں بھی اگر بابا زیادہ ہی آفر کریں تو وہ اپنے شوہر کا بنا ہوا یہ گھر نہیں بیچنا چاہتیں ۔ بھائی وہ بہت رورہی تھیں اور کہہ رہی تھیں اس گھر کے لیے ہم نے برسوں خواب دیکھے۔پائی پائی جمع کی اور پتا ہے بابا اب انہیں دھمکیاں دے رہے ہیں کہ وہ ان کی بیٹیوں کو۔۔۔۔''

اس کی آواز بھرا گئی تھی آنکھیں پھر نم ہوگئی تھیں میں نے ہولے اس کا ہاتھ تھاما مجھے یقین نہیں آتا تھا،بالکل بھی نہیں۔پھر بھی میں نے ان سے وعدہ کیا

''کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا اگر یہ سچ ہوا تو۔۔۔۔۔۔''

''لیکن یہ سچ تھا تاب! تم نے دیکھا تھا بابا کے چہرے پر لکھا تھا یہ سچ تھا۔۔۔۔''وہ ایک ایک لفظ سوچ کر بولنے والا میرا کم گو بھائی شاید اتنا بولنے سے تھک گیا تھا۔میں نے ایک بار پھر اسے اپنے ساتھ لگالیا میں جانتا تھا یہ سچ ہے بہت پہلے اسلامیہ پارک والے گھر کے برآمدے میں غصے میں بولتی دادی کا چہرہ میری نگاہوں میں آگیا تھا میں نے نایاب سے وعدہ کیا۔

''میں بابا سے بات کروں گا وہ بے فکر ہو جائے ان لوگوں کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔''اور بابا نے خود نایاب کو گلے لگا کر سوری کیا۔

''انسان ہوں ناں بس غلطی ہوگئی ہے۔اپنے بیٹے کے لیے ایک خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر پانے کے لیے راہ سے ہٹ گیا تھا۔''

نایاب اگرچہ مطمئن ہو گیا تھا پھر بھی وہ مجھے بہت مضطرب اور بے چین لگتا تھا۔

میں نے دیکھا تھا وہ کتاب سامنے کھولے سوچوں میں کھو جاتا تھا۔اس نے کہیں بھی جانے سے انکار کر دیا تھا۔تاہم میں ضد کر کے اسے دو دن کے لیے مری لے گیا تھا یہ دو دن میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے تھے ہم دونوں صبح ہوتے ہی ہوٹل سے نکل جاتے تھے اور گھومتے پھرتے ، مال روڈ، کشمیر پوائنٹ ،ہم نے مری کا چپہ چپہ چھان مارا تھا۔چیئر لفٹ پر بھی بیٹھے تھے ۔میں نے نایاب کی ڈھیروں تصویریں بنائی تھی اور وہیں پر میں نے اسے فاطمہ کے متعلق بتایا تھا اور وہ چمکتی شریر آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہوا مجھے چھیڑتا رہا تھا۔ہم ایک دن کے لیے بھوربن بھی گئے تھے۔

''یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے تاب! ہے نا۔۔۔۔یہ پہاڑ یہ جگہیں،دل چاہتا ہے میں کہیں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا کر رہ جاؤں۔''واپسی پر اس نے تبصرہ کیا تھا اور یہ واپس آنے کے بعد تیسرے دن کی بات ہے میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا میوزک سن رہا تھا جب وہ میرے کمرے میں آیا وہ بے حد اداس لگ رہا تھا۔

''بھائی !ایک بات پوچھوں؟''

میرے میوزک آف کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔۔ضرور لیکن فاطمہ کے متعلق نہیں۔''میں مسکرایا۔

''کیونکہ مجھے خود بھی کچھ نہیں معلوم اس کے متعلق سوائے اس کے کہ وہ ایک لڑکی ہے فاطمہ افتخار۔۔۔۔۔جس کے لیے میں نے ماس کیمونیکیشن میں داخلہ لیا اور جو مجھے بہت اچھی لگتی ہے اتنی اچھی کہ میں نے اسے لائف پارٹنر بنانے کا ارادہ کرلیا ہے۔''لیکن وہ میری بات پر مسکرایا تک نہیں۔

''بھائی!''وہ کچھ جھجکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''کیا ہنی بابا بلیک میلر ہیں؟ کیا وہ لوگوں کی کمزوریوں کو تلاش کر کے پھر انہیں بلیک میل کرتے ہیں؟''

پتا نہیں یہ بات اس سے کس نے کہی تھی لیکن اس آگاہی کا کرب اس کی آنکھوں سے اور اس کے چہرے سے عیاں تھا اور میں ایک بار پھر اسلامیہ پارک والے گھر میں پہنچ گیا تھا۔

”حسین! تم نے اپنے نام کی لاج تو رکھی ہوتی۔“

وہی کرب جو دادی کی آنکھوں میں تھا وہی کرب نایاب کی آنکھوں میں تھا میں نے سر جھکا لیا میرے پاس اس کے سوال کا جواب نہ تھا وہ کچھ دیر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا پھر شکست خوردہ سا اٹھ کھڑا ہوا۔

”نایاب۔۔۔۔۔!“

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکنا چاہا لیکن اس نے مجھے بات پوری نہ کرنے دی۔

”آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں بھائی! مجھے آپ کے جھکے ہوئے سر سے اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے۔“

وہ شکست خوردہ سا اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے بیدردی سے کچلتا ہوا واپس چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن میرے ایک دوست کا فون آ گیا اور جب میں فون سن کر باہر آیا تو صابر نے مجھے بتایا۔

”نایاب کہیں باہر چلا گیا ہے۔“

میرے پرانے کلاس فیلو عظیم کی شادی تھی۔ عظیم نے میرے ساتھ انگلش لٹریچر میں ایڈمیشن لیا تھا اور پھر ماسٹر کرنے کے بعد ایک کالج میں پڑھا رہا تھا میں اس کی شادی میں مصروف ہو گیا ہم سب پرانے دوست اکٹھے ہو گئے تھے اور خوب ہلہ گلہ رہتا۔ عظیم کو خوب تنگ کیا جاتا تقریباً ہفتہ بھر میں مصروف رہا اور عظیم کے ولیمے کے دوسرے دن ہی ہنی بابا مجھے اپنے ساتھ کراچی لے گئے۔ مقصد مجھے مختلف میگزین نکالنے والوں سے ملوانا اور اس بات کا جائزہ لینا تھا کہ کس طرح کا پرچہ نکالا جائے۔ نینا ماما کا خیال تھا کہ خواتین کا پرچہ ہو۔ جبکہ ہنی بابا شوبز کے متعلق پرچہ نکالنا چاہتے تھے میں نے اس سلسلے میں فی الحال کوئی رائے نہیں دی تھی۔ ہنی بابا میرے اور اپنے لیے سیٹ بک کروا چکے تھے اس لیے میں خاموشی کے ساتھ ان کے ساتھ چلا گیا۔ تاہم نایاب سے فون پر بات ہوتی رہتی تھی چند دن میں اس کا رزلٹ آنے والا تھا لیکن ہر بار وہ مجھے بہت اداس سا لگا تھا۔

”کیا بات ہے جانو!“

”کچھ نہیں بھائی! آپ کے بغیر دل نہیں لگ رہا، ماما کا تو پتا ہے آپ کو کتنی

مصروف رہتی ہیں؟“

”اور میرے تو گھٹنے سے لگ کر بیٹھے رہتے تھے تم؟“ میں ہنسا تھا۔

”تین تین گھنٹے میں اس انتظار میں بیٹھا رہتا تھا کہ حضور کی سٹڈی ختم ہو تو درشن کر لیا جائے۔“ اس سے مجھے اس پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا اور میں ہنی بابا کے مزید ایک دن رکنے کے باوجود واپس پلٹ آیا تھا میرا اپنا کون تھا اس دنیا میں سوائے ہنی بابا کے۔ لیکن وہ تو میرا واحد اثاثہ تھا میری زندگی تھا۔

☆ ☆ ☆

ڈرپ ختم ہو گئی تھی کچھ دیر بعد نرس نے آ کر ڈرپ نکال دی تھی۔

”ابھی ایک اور ڈرپ لگے گی سر!“

”فار گاڈ سیک سسٹر! کچھ دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو میں نے اس سے التجا کی۔“

”میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔“

”سر! آپ کی کنڈیشن۔۔۔۔۔“

”پلیز۔۔۔۔۔۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

”میں اپنی کنڈیشن کے متعلق اچھی طرح سے جانتا ہوں۔“

”اوکے سر! میں ڈاکٹر بھٹی سے بات کرتی ہوں۔“

وہ باہر چلی گئی اور میں ایک بار پھر اسید عبدالرحمٰن کی کہانی ترتیب دینے لگا ہوں دل ہی دل میں لفظوں کو پرکھنے لگا ہوں لیکن نہیں، اسید عبدالرحمٰن کی کہانی میں پھر سے نایاب آ گیا ہے نایاب۔۔۔۔ جو میرا بھائی تھا اور اسید نے جسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

پھر بھی اسید عبدالرحمٰن

اور وہ یہاں میرے پاس قلم کاغذ کچھ بھی تو نہیں ہے میں نے لیٹے لیٹے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی ہے اور پتا نہیں کب یہ لوگ مجھے یہاں سے ڈسچارج کریں گے۔ وہ اگست کا لاسٹ ویک تھا جب نایاب دوستوں کو ٹریٹ دینے گیا تھا اس نے پہلے سال کے امتحان میں پوزیشن لی تھی سب پرچوں میں اور اس کے کلاس فیلوز اس سے ٹریٹ

مانگ رہے تھے۔

''آپ بھی چلو نہ بھائی!''

''نہیں یار! تمہارے دوست کہیں گے یہ بڈھا ہم جوانوں میں کہاں آ گیا ہے بے شک میں ابھی یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہوں لیکن ہوں تو تم سے آٹھ سال بڑا۔''

''آپ بھی حد کرتے ہیں بھائی! 26 سال کی عمر میں آپ بڈھے کیسے ہو گئے؟''

''بھئی اٹھارہ سال کے بچوں میں تو بڈھا ہی لگوں گا نا۔''

میں نے پیار سے اس کے بال بکھرائے تھے اور یہ اس کے تین دن بعد کی بات تھی جب نایاب نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''آپ کے اکاؤنٹ میں اندازاً کتنی رقم ہو گی؟''

''معلوم نہیں یار!'' میں ریموٹ سے ٹی وی پر چینل سرچ کر رہا تھا کہیں بھی کوئی کام کا پروگرام نہیں تھا۔

''میں ابھی سکول میں ہی تھا تو بابا نے میرا اکاؤنٹ کھلوایا تھا اور تب سے لے کر اب تک وہ میرے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرواتے رہتے تھے لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی میرے اخراجات ہی کیا تھے نہ تو میں سگریٹ پیتا تھا اور نہ ہی میری کوئی اور ایکٹی ویٹیز تھیں۔ گاڑی میں پٹرول وغیرہ کا خرچ تھا جو میں نقد ہی بابا سے لیا کرتا تھا بلکہ مجھے مانگنے کی بھی کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی بابا خود ہی ہفتے دو ہفتے بعد پوچھ لیا کرتے تھے۔ پیسے تو نہیں چاہیے اور پھر خود ہی کچھ نوٹ پکڑا دیتے جو ہمیشہ میری ضروریات سے زیادہ ہی ہوتے تھے۔ میں نے پوری زندگی میں صرف ایک بار چیک کاٹا تھا اور وہ بھی ماما کو کچھ رقم کی ضرورت تھی تو بابا نے کہا تھا کہ تابی کے اکاؤنٹ سے نکلوا لو اور میں نے بلینک چیک پر دستخط کر کے انہیں چیک دے دیا تھا۔

''پھر بھی اندازاً ۔۔۔۔؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

میں نے ٹی وی آف کر کے اس کی طرف دیکھا وہ بہت ہی بے چین اور مضطرب لگ رہا تھا۔

''کیا بات ہے جانو! مجھ سے شیئر نہیں کرو گے؟''

''ابھی نہیں۔ لیکن مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔''

''اوکے۔۔۔۔'' میں نے بغیر مزید سوال کیے دس بارہ چیکوں پر دستخط کر کے چیک بک اس کے حوالے کر دی تھی۔

''ٹوٹل اماؤنٹ کتنا ہے ابھی فون کر کے معلوم کر لو۔ مینجر کو کہہ دینا کہ آفتاب حسین بول رہا ہے۔ بابا کا بہت اچھا دوست ہے۔'' وہ جب فون کر کے مڑا تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''آپ تو بڑے مالدار ہیں بھائی!''

''سب ہنی بابا کا ہی ہے یہ بتاؤ تمہارا کام تو بن جائے گا نا؟''

''ہاں ۔۔۔۔ میں بیس لاکھ روپے لوں گا لیکن بھائی آپ ابھی مجھ سے یہ نہ پوچھیے گا کہ مجھے اس رقم کا کیا کرنا ہے بعد میں بتا دوں گا۔''

''اوکے یار!'' میں نے اس کے بال بکھرائے۔

آپ کے اکاؤنٹ میں پچاس لاکھ ہیں اس کی آنکھوں میں پھر بے چینی نظر آنے لگی تھی۔

''اور کیا بابا نے ساری رقم بلیک میلنگ سے حاصل کی ہو گی۔''

وہ جیسے خود اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا میں بغور اسے دیکھتا رہا وہ کیا کرنے والا ہے وہ اس ساری رقم کا کیا کرے گا میں نے اس کے متعلق زیادہ نہیں سوچا تھا مجھے پتا تھا کہ وہ خود ہی جب مناسب سمجھے گا بتا دے گا یہ مجھے یقین تھا کہ اس نے یہ رقم کسی اچھے مقصد کے لیے لی ہے۔ کہیں چیرٹی میں دینے لیے یا کسی غریب کی مدد کے لیے اگلے دو تین دن وہ مجھے نظر نہیں آیا پتا نہیں کہاں مصروف تھا۔ میں جب بھی گھر آیا وہ گھر پر نہیں تھا صابر نے ہر بار ہی بتایا کہ وہ ابھی ابھی گھر سے نکلا ہے۔ دو دن بعد یونیورسٹی کھل رہی تھی ہم چند دوستوں نے مل کر عظیم کو اس کی فیملی سمیت ویلیج میں دعوت دی تھی میں نے صبح کا ناشتہ کرتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ۔

''ہم آج عظیم کو ڈنر دے رہے ہیں۔'' وہ برائے نام ناشتہ کر رہا تھا۔ آج ٹیبل پر ہم دونوں تنہا تھے۔ نینا ماما اور ہنی بابا کسی ڈنر سے بہت لیٹ واپس آئے تھے جو ابھی تک سو

رہے تھے۔

"کہاں کھوئے ہوئے ہو یار؟" اپنے لیے چائے بناتے ہوئے میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"کھو ہی تو گیا ہوں ۔۔۔۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"ایسا الجھا ہوا ہوں کہ راستہ ہی نہیں ملتا۔"

"نایاب بیٹا! کیا چیز پریشان کر رہی ہے تمہیں مجھے بتاؤ میں ہوں نا تمہارا بھائی تمہاری ہر آفات خود پر لے لوں گا میری جان! مجھ سے کچھ شیئر تو کرو۔" میرا دل اس کے لہجے پر جیسے پگھل کر پانی ہو گیا تھا۔

"او کے سائیں!" وہ جیسے زبردستی مسکرایا تھا۔

"ڈنر کے بعد بات کروں گا آپ سے۔"

"ڈنر پر چل رہے ہو نا۔"

"نہیں بھائی! بڈھوں میں جوانوں کا کیا کام ۔۔۔؟" اس نے میری ہی بات مجھے لوٹائی تھی اور میں ہنس دیا تھا لیکن وہ یوں ہی سنجیدہ سا بیٹھا رہا۔

"کوئی بات تو ہے؟"

"کوئی بہت بڑی بات ۔۔۔۔ جس نے چند دنوں میں نایاب کا خون نچوڑ لیا ہے اور کل مجھے ہر صورت میں اس سے بات کرنا ہے۔"

میں چائے پیتے ہوئے بھی سوچتا رہا تھا اس ڈنر سے فارغ ہوتے ہوئے ایک بج گیا پھر بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں یوں ہی جوتوں سمیت بستر پر نیم دراز ہو گیا تھا گو بہت انجوائے کیا تھا سب نے اور میں نے بھی پھر بھی عجیب سے بے چینی تھی جس کا سبب مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کچھ دیر میں یوں ہی لیٹا رہا پھر اٹھ کر جوتے اتارے اور ابھی بیڈ کی طرف مڑا ہی تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر نایاب اندر آ گیا۔

"ارے تم سوئے نہیں ابھی تک۔"

"ہاں نیند نہیں آ رہی۔" "نیند تو مجھے بھی نہیں آ رہی چلو ادھر بیڈ پر آ جاؤ کچھ دیر باتیں کرتے ہیں۔"

میں نے دیکھا اس کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو رہا تھا میں نے اسے بازوؤں سے تھام کر بیڈ پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"بھائی! آپ نے پوچھا نہیں میں نے وہ رقم کہاں لگائی۔"

"یار! تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ نہ پوچھوں؟"

"ہاں ۔۔۔" اس نے اپنے لبوں پر زبان پھیری۔

"میں نے پچیس لاکھ کا ایک گھر خریدا ہے عمر بلاک میں۔"

"کیا الگ گھر بنا رہے ہو؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"بھائی! بابا نے مجھ سے پرومس کیا تھا کہ اس خاتون اور اس کی یتیم بچیوں کا ٹھکانہ نہیں چھینیں گے لیکن بابا نے ایسا نہیں کیا انہوں نے اپنے غنڈے بھیج کر انہیں ڈرایا دھمکایا ان کا سامان باہر پھینک دیا اور زبردستی ان سے اشٹام پر دستخط کروائے وہ دستخط نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن انہوں نے ان کی چھوٹی بیٹی کو پکڑ لیا اور انہیں دھمکی دی کہ وہ سب ان کے سامنے اسے بے آبرو کریں گے اور وہ خاتون مجبور ہو گئی اور انہوں نے مکان کی رجسٹری ان کے حوالے کر دی۔"

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟" میں حیران ہوا۔

جس روز میں نے دوستوں کو ٹریٹ دیا تھا اس روز واپسی پر راستے میں گاڑی خراب ہو گئی میں اتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ شمو چاچا دیکھ رہے تھے کہ کیا مسئلہ ہے تو اس وقت وہ خاتون میرے پاس سے گزریں میں نے انہیں پہچان کر سلام کیا تو انہوں نے ایک نفرت بھری نظر مجھ پر ڈالی اور سلام کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئیں۔ کہیں کچھ غلط تھا مجھے لگ رہا تھا میں تیزی سے ان کے پیچھے لپکا۔

"پلیز ۔۔۔۔ پلیز آنٹی میری بات سنیں۔"

اور وہ بمشکل میری بات سننے پر رضامند ہوئی تھی واقعی کچھ غلط تھا نا، انہوں نے جب تفصیل بتائی تو میرا دل چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور میں زمین میں دھنس جاؤں۔

اتنی سی بات کرنے سے اس کا سانس پھولنے لگا تھا شاید وہ جذباتی

ہو رہا تھا۔ میں نے ہولے سے اسے تھپکا۔

''ریلکس میری جان!''

''بھائی! بابا نے اتنا ظلم کیوں کیا، کیا نہیں تھا ہمارے پاس۔ یہ آدمی کو مزید کی ہوس کیوں ہوتی ہے؟''

اس کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں اور اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو رہے تھے وہ بیڈ سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا تھا۔

''بھائی! بابا کے غنڈوں نے ان سے کہا کہ پہلے تو وہ انہیں قیمت دے رہے تھے اس گھر کی اب ایک پائی بھی نہیں دیں گے۔ وہ لاچار عورتیں، ایک بزرگ اور بے بس عورت اور دو معصوم لڑکیاں رات کے اس پہر تنہا کہاں جاتیں۔ غنڈوں کے جانے کے بعد انہوں نے کچھ فاصلے پر رہنے والے پڑوسیوں کی منت کی۔ سامان ادھر رکھوایا اور پھر ایک عزیزہ کے گھر چلی گئیں تھوڑا بہت زیور تھا ان خاتون کے پاس جسے فروخت کر کے وہ گھر خریدنا چاہتی تھی کسی پسماندہ علاقے میں دو کمروں کا گھر بھی نہیں مل رہا تھا انہیں۔

بھائی! میں نے ان سے معافی مانگی اور پھر ایک دوست کے والد جو پراپرٹی ڈیلر ہیں ان سے بات کر کے پچیس لاکھ کا یہ گھر خرید کر انہیں دیا ہے۔ بھائی! میں ان کا گھر تو انہیں بابا سے واپس لے کر نہیں دے سکتا تھا لیکن میں نے اپنے طور پر ان کے نقصان کی تلافی کی کوشش کی ہے۔ میں نے ان کی جگہ کی قیمت بھی لگوائی تھی میرے دوست کے والد کہہ رہتے۔ پینتیس لاکھ تک مل سکتے تھے اس جگہ کے۔ میں نے دل میں عہد کیا ہے جب بھی میرے پاس کچھ رقم ہوئی میں بقیہ رقم انہیں ادا کر دوں گا۔''

وہ جیسے بولتے بولتے تھک گیا تھا اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا میں نے ہولے سے دبایا۔

''ڈونٹ وری یار! تم صبح ہی میرے اکاؤنٹ سے دس لاکھ لے لو اور انہیں دے دو اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔''

اس کی آنکھیں یکا یک لو دینے لگی تھیں۔

''لیکن بھائی! وہ رقم ہنی بابا کی ہے نا۔ انہوں نے اگر آپ سے پوچھا کہ وہ رقم

کدھر گئی تو آپ کیا کہیں گے؟''

''کہہ دوں گا حق بہ حقدار رسید۔'' ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی اور اس نے کہنیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی۔

''بھائی! میں نے اس وقت آپ کو ڈسٹرب کر دیا آپ تھکے ہوئے آئے تھے لیکن مجھے بہت بے چینی تھی بہت گھبراہٹ تھی دل پر عجب سا بوجھ تھا مجھے یقین نہیں آتا تھا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تحقیق کی اور سوچا میرے ہنی بابا ایسے ہو سکتے ہیں اتنے ظالم اور اتنے لالچی۔''

''انسان بہت کمزور ہوتا ہے نا بس پھسل جاتا ہے کبھی کبھی اور پلیز تم اب اسکے متعلق زیادہ نہ سوچو یہ کیا حالت بنالی ہے تم نے۔'' میں نے محبت سے اسے دیکھا۔

''بھائی! آپ بابا کو یہ سب نہ بتانا انہیں پتا چل گیا نا تو وہ کہیں۔۔۔۔۔ وہ بہت ڈر رہی تھیں، بہت رو رہی تھیں، میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ بابا کو ان کے متعلق کبھی علم نہیں ہوگا۔'' وہ اٹھتے اٹھتے پھر لیٹ گیا پسینہ پانی کے قطروں کی طرح اس کی پیشانی پر نمودار ہوا۔

''نایاب۔۔۔۔ بولی۔۔۔۔۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اسکی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگی ہوئی تھیں اور جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور ہونٹ بھینچے جیسے کسی درد کو پینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''نایاب۔۔۔۔ نایاب۔۔۔۔'' میں نے اس کا بازو جھنجوڑ ڈالا۔

''کیا ہو رہا ہے تمہیں یار! کیا کر رہے ہو؟''

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

''I am Going bhai.'' اس نے بمشکل آنکھیں کھولی تھیں۔

''بھائی! آپ وعدہ کریں اگر میں نہ رہا تو آپ ان کا حق انہیں ادا کریں گے۔''

''بکومت۔۔۔'' میں نے اپنے آنسو بمشکل رو کے تھے وہ کیوں کہہ رہا تھا ایسا۔

''بھائی پلیز۔۔۔۔'' اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

''او کے Promise''

میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اس کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے ابھی کچھ دیر پہلے وہ کتنے گلابی گلابی سے تھے اور اب۔

''میرا دل۔۔۔'' اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔ وہ ابھی میڈیکل کے دوسرے سال میں چند دن پہلے آیا تھا لیکن شاید اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کا دل اسے دغا دے رہا ہے۔

''بابا۔۔۔بابا۔۔۔۔ہنی بابا۔۔۔۔نینا ماما۔۔۔!'' اسے آنکھیں بند کرتے دیکھ کر میں دیوانہ وار بھاگا تھا اور ان کے بیڈروم کا دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔

''کیا ہوا؟۔۔۔۔کیا ہوا؟'' ہنی بابا نے گھبرائے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔

''ہنی بابا!۔۔۔نایاب۔۔۔۔ہمارا نایاب۔۔۔!'' میں واپس اپنے کمرے کی طرف بھاگا وہ دونوں بھی میرے پیچھے تھے۔

''نایاب!۔۔۔۔نایاب بیٹا!''

اس نے ذرا آنکھیں کھولیں اور پھر بند کرلیں وہ بمشکل سانس لے رہا تھا۔ میرے آنسو میرے رخساروں پر بہہ رہے تھے بابا نے ایک نظر مجھے دیکھا تھا اور پھر فون کی طرف بڑھ گئے تھے اور کچھ دیر بعد ہماری ایمبولینس ہاسپٹل کی طرف دوڑ رہی تھی اسے شدید ہارٹ اٹیک ہوا تھا اتنی کم عمری میں اس کا نازک دل اپنے بابا کا اصل جان کر بھڑک اٹھا۔ وہ بہت آئیڈلائیز کرتا تھا۔ برداشت نہیں کر پایا تھا۔ C.C.U کے باہر کھڑے کھڑے میں نے کتنی ہی دعائیں کر ڈالی تھیں لیکن شاید دعاؤں کا وقت گزر چکا تھا۔ بابا بے چینی سے ہر ڈاکٹر سے اس کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

''ڈاکٹر غازی، مشہور ہارٹ اسپیشلسٹ کو کال کیا ہے ہم نے، وہ صحیح کنڈیشن بتائیں گے۔''

''یہ اچانک کیا ہوا تھا نایاب کو؟'' بابا نے دوبارہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور میں نے جھٹک دیا۔ پھر ڈاکٹر غازی کے آنے سے پہلے ہی وہ زندگی ہار گیا میں بابا اور ماما تینوں ہی بیڈ کے پاس کھڑے تھے ابھی کچھ لمحے پہلے ہمیں سسٹر نے اندر بلایا تھا۔ نایاب نے خواہش کی تھی۔ وہ ہوش میں تھا وہ آنکھیں کھول کر ہمیں دیکھ رہا تھا۔

''میرے بچے کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' بابا نے جھک کر اس کی پیشانی چومی تھی۔

''یہ کسی یتیم کی آہ اور کسی بے بس کے آنسوؤں کی سزا ہے بابا!'' لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلے ہنی بابا یکدم چونکے تھے میں انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''بابا! میں نے کفارہ ادا کر دیا'' وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔

''بھائی اپنا وعدہ۔۔۔۔۔۔'' اس کی سانس یکدم بکھر گئی تھی۔

نینا ماما زور سے چیخی تھی۔ ''بوبی۔۔۔بوبی۔۔۔۔!''

اس نے ایک بے بس سی نظر ان پر ڈالی تھی اس کے ہونٹ ہلے تو تھے لیکن آواز نہیں نکلی تھی۔

ڈاکٹر غازی یکدم اندر آئے تھے۔

''حسین صاحب!'' انہوں نے ہنی بابا کے پیلے پڑتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور پھر مزید کوئی بات کیے بغیر وہ بیڈ کی طرف بڑھے تھے۔

''آکسیجن لگاؤ۔''

اس کے سینے پر دباؤ ڈال کر شاید وہ دل کی دھڑکن بحال کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن بے سود میرا وہ نازک دل بھائی لابنی آرٹسٹک انگلیوں والا جسے سرجن بننا تھا چلا گیا۔

اس سے پہلی بار ہنی بابا کے لیے اپنے دل میں نفرت محسوس کی۔ پہلے بھی میں نے ایک دو بار نفرت پیدا کرنا چاہی تھی۔ جب دادی سوکھی روٹی پر اچار کی پھانگ رکھ کر کھاتی تھیں اور جب دادی مرگئی تھی کیونکہ وہ ان کی لائی ہوئی دوائیاں استعمال نہیں کرتی تھیں لیکن مجھے لگا تھا میں ان سے نفرت نہیں کر سکتا، کبھی بھی نہیں، میں ان سے محبت کرتا ہوں، وہ جیسے بھی ہیں میرے ہنی بابا ہیں لیکن آج جب میرا لاڈلا میرا نایاب میرے سامنے آنکھیں موندھے پڑا تھا تو میرا دل چاہ رہا تھا میں اس شخص سے اتنی نفرت کروں کہ وہ اس نفرت کی وجہ سے مر جائے۔ اس سے میں نے ایسا ہی محسوس کیا تھا نایاب نہیں رہا تھا وہ سچ مچ نایاب ہو گیا۔ نینا ماما اور بابا کے آنسو، میری فریادیں کوئی بھی اسے واپس نہیں لا سکتے تھے۔ زندگی سے یکدم جیسے سارے رنگ اڑ گئے تھے، نینا ماما اور ہنی بابا بجھے بجھے لگتے تھے، خاموش چپ چاپ، وہ جو ناشتے کی ٹیبل پر یا کبھی کبھار رات کو ڈنر ٹیبل پر ان کی ہنسی کا جلترنگ بج اٹھتا تھا اب کہیں نہ تھا، ایک بوجھل خاموشی نے سارے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں سارا

دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا خاموش آنکھیں موندے۔ یونیورسٹی کھل گئی تھی لیکن میں یونیورسٹی نہیں گیا تھا بس میں صبح وشام کو کچھ دیر کے لیے باہر نکلتا پھول خریدتا اور نایاب کی قبر پر رکھ کر لوٹ آتا۔ کبھی کبھار مجھ سے پہلے یا بعد میں بابا اور ماما بھی آ موجود ہوتے۔ میں ان سے بات کیے بغیر پھول رکھ کر لوٹ آتا۔

میں نے نایاب کے بعد بابا کو ایک دن بھی مخاطب نہیں کیا تھا، میرے اندر غصہ تھا، رنج تھا اور ان کے لیے نفرت تھی۔ کئی بار مجھے لگا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں لیکن میں انہیں نظر انداز کر دیتا تھا اور پھر میں انہیں کیا بتاتا میرے پاس انہیں بتانے کے لیے تھا ہی کیا سوائے اس کے کہ وہ کانچ کا سا دل رکھنے والا میرا شہزادوں جیسا بھائی جس کی لمبی نفیس انگلیاں بتاتی تھیں کہ وہ بہت اچھا سرجن بنے گا وہ اپنے دل میں موجود اپنے باپ کے آئیڈیل کا بت ٹوٹ جانے پر خود بھی کرچی کرچی ہو گیا تھا بہت سارے دن یونہی گزر گئے تھے شاید بیس یا پچیس دن۔ جب ایک صبح ناشتے کے بعد بابا نے مجھے جالیا۔

’’تم یونیورسٹی نہیں جا رہے؟‘‘

’’ہاں دل نہیں چاہتا۔‘‘

’’دل کو سنبھالو میری جان! زندگی ایسے کیسے گزرے گی۔‘‘ انہوں نے ہولے سے میرے شانے تھپکے تھے اور پھر اپنے آنسو پیتے ہوئے نینا ماما کی طرف متوجہ ہو گئے تھے وہ اس گھر کے بڑے تھے انہوں نے ہی ہم سب کو سنبھالنا تھا وہ نینا ماما کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے ہولے ہولے کچھ کہہ رہے تھے اور نینا ماما کے آنسوان کے رخساروں پر بے حد خاموشی سے بہتے جا رہے تھے میں اپنے کمرے میں آ کر خاموشی سے یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہونے لگا تھا۔ زندگی ایسے نہیں گزرنی تھی اور پھر کیسے گزرنی تھی؟ میں نہیں جانتا تھا بس خاموشی سے تیار ہو کر یونیورسٹی آ گیا تھا اور یونیورسٹی میں سب سے پہلے میں نے جسے دیکھا وہ فاطمہ تھی۔

وہ جسے ہر لمحہ دیکھنے کی چاہ ساری چھٹیوں میں، میں نے کی تھی لیکن اس وقت میں اس کے متعلق نہیں سوچ رہا تھا بلکہ نایاب کے بعد ایک دن بھی میں نے اسے نہیں سوچا تھا لیکن اس وقت اپنی طرف تشویش اور پریشانی سے دیکھتی فاطمہ افتخار کو دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ

شاید مجھے اس وقت صرف اسکی ضرورت تھی اور شاید میں صرف اسی کی خاطر یونیورسٹی چلا آیا تھا۔ س

’’کیا ہوا تھا؟ آپ آئے کیوں نہیں؟ اتنی چھٹیاں؟ آپ کے گھر میں تو سب خیریت تھی نا؟‘‘

’’تاب! آپ جانتے ہیں کتنے لیکچر مس کر دیئے آپ نے؟ سر حمید انصاری سب ہی آپ کا پوچھ رہے تھے۔‘‘ وہ ایک سانس میں بولتی چلی گئی تھی اور میں ایک ٹک اسے دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کیا اس نے بھی مجھے مس کیا تھا میں ساکت کھڑا تھا۔ جب اس نے دوبارا پوچھا۔

’’آفتاب! سب خیریت تو تھی نا؟‘‘

’’نہیں۔۔۔‘‘ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

’’28 اگست کو میرا بھائی۔۔۔‘‘ میرے حلق میں آنسوؤں نے گولا سا بنا دیا لفظ اندر ہی کہیں ساکت ہو گئے۔

’’کیا ہوا بھائی کو؟‘‘ وہ جیسے بدحواس ہو گئی تھی۔

اور تب میں نے ہولے ہولے اسے نایاب کے بارے میں بتایا۔ میری پلکیں بار بار نم ہو جاتیں اور بار بار انہیں ہاتھوں کی پشتوں سے پونچھتا۔

’’اسے تمہیں دیکھنے کی بہت تمنا تھی فاطمہ!‘‘ میں روانی میں کہہ گیا اور پھر فوراً ہی سنبھلا تم سب کا میں نے غائبانہ تعارف کروا رکھا تھا۔

’’وہ مجھ سے کہتا تھا اب کے جب یونیورسٹی کھلی تو میں ایک روز تمہارے ساتھ چلوں گا۔‘‘

پھر جیسے پورے ڈپارٹمنٹ کو خبر ہو گئی وہ سب میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ کوئی گلے لگ رہا تھا، کوئی تسلی دے رہا تھا، حسین احمد کے نوجوان بیٹے کی موت کی خبر تو سب اخباروں میں ہی چھپی تھی لیکن میں نے یونیورسٹی میں خود کو کبھی حسین احمد کے حوالے سے متعارف نہیں کروایا تھا، پتا نہیں میرے لاشعور میں کیا تھا۔

’’تم نے کبھی اپنے متعلق بتایا ہی نہیں، نہ ہمیں تمہارے گھر کی خبر تھی، تمہارا حال

پوچھتے اور تمہارا سیل فون بند تھا کتنی بار ٹرائی کیا۔“ حبیب نے گلہ کیا تو نہ جانے کیسے میں نے اسے بتا دیا کہ ”میں صبح نو والے حسین احمد کا بیٹا ہوں۔“

”ارے۔۔۔ارے۔۔۔ان کے بیٹے کے متعلق تو پڑھا تھا میں نے۔“

میں نے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا تھا بابا اور نینا ماما بھی اپنی زندگی میں مصروف ہو گئی تھیں سب کچھ ویسے ہی ہو گیا تھا جیسے پہلے تھا بس نایاب نہیں رہا تھا اس کے کمرے میں اب رات گئے تک لائٹ نہیں جلتی تھی اور مجھے اب اس کے کمرے میں جا کر کہنا نہیں پڑتا تھا۔

”کہ بابی! پلیز سو جاؤ اب بیمار پڑ جاؤ گے۔ کیا کرو گے اتنا پڑھ کر۔“

میں نے دم آخر اس سے کیا ہوا وعدہ نبھا دیا تھا اور دس لاکھ روپے اپنے اکاؤنٹ سے نکلوا کر اس خاتون کے اکاؤنٹ میں منتقل کروا دیئے تھے اور فون کر کے انہیں اطلاع بھی دے دی تھی میں خود وہاں نہیں گیا تھا حالانکہ میرا جی چاہتا تھا وہاں جاؤں انہیں بتاؤں کہ وہ آپ کا دکھ اپنے دل پر جھیل کر چلا گیا لیکن میری ہمت نہیں پڑتی تھی۔

”میں نے اپنا وعدہ نبھا دیا تھا لیکن بابا!“ میں نے سوچا تھا کہ نایاب کے اس طرح چلے جانے پر وہ بدل جائیں گے ان کا طرز زندگی بدل جائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا یہ کوئی کہانی یا افسانہ نہیں تھا، کوئی فلمی سٹوری نہیں تھی جس میں کسی کی موت کسی اپنے کی بگڑے ہوئے کو سنوار دیتی ہے، برے کو نیک بنا دیتی ہے، سب کچھ تو ویسا ہی ہو گیا تھا وہی فون کالز وہی انداز۔

”ارے نہیں چوہدری صاحب! ہمارے ہوتے ہوئے ایسی خبر نہیں لگ سکتی۔“

”جی نہیں۔ آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب! کل ہی خبر کی تردید اور معذرت چھپ جائے گی ظاہر ہے جناب یہ دنیا تو کچھ دو کے اصول پر ہی چلتی ہے نا۔“

بلند قہقہہ۔۔۔۔۔

”سوچ لیں نیازی صاحب! آپ کی عمر بھر کی شہرت داؤ پر لگی ہے۔“

ناشتہ کرتے ہوئے لانچ میں بیٹھے ہوئے میں ایسے جملے سننے لگا تھا اور پھر نایاب کی موت کے ٹھیک چھ ماہ بعد ہنی بابا بڑے جوش و خروش سے پشاور کے قریب ایک گاؤں میں

قصاص کے طور پر بوڑھے شخص سے نکاح ہو جانے والی تیرہ سالہ لڑکی کا کیس لڑ رہے تھے اخبار کے ذریعے میڈیا کے ذریعے این جی اوز کے ساتھ مل کر۔

ہاں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ بس نایاب نہیں تھا، یہ نہیں کہ ہنی بابا کو نایاب کے جانے کا دکھ نہیں تھا ان کا دل نایاب کی جدائی میں روتا تھا، کڑھتا تھا۔ میں نے کئی بار انہیں نایاب کے کمرے میں بیٹھے اس کی کتابوں کو سینے سے لگائے اس کے تکیے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اکثر وہ اس کی تصویروں کے سامنے کتنی ہی دیر تک خاموش کھڑے رہتے تھے۔ لانچ میں لگی فل سائز کی ان تصویروں میں وہ میٹرک اور ایف ایس سی میں ٹاپ کرنے پر گولڈ میڈل لے رہا تھا۔ پھر وہ گیلی آنکھوں کے ساتھ وہاں سے لوٹ آتے تھے۔ یہ تو نہیں تھا کہ انہیں نایاب سے محبت نہیں تھی یا وہ انہیں یاد نہیں آتا تھا بس زندگی نے انہیں اپنے اندر انوالو کر لیا تھا اور یہ زندگی ایسے ہی کرتی ہے یوں ہی الجھا لیتی ہے اپنے اندر کہ اپنوں کا دکھ اس میں الجھ کر پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ اتنی ظالم ہے یہ زندگی مجھے بھی تو زندگی اپنے اندر الجھائے ہوئے تھی میرے سامنے فاطمہ تھی۔

فاطمہ افتخار جو مجھے ساری دنیا کی لڑکیوں سے مختلف لگتی تھی۔ پتا نہیں اس میں کیا مختلف تھا اس کی پاکیزگی، سادگی اور معصومیت۔ اس کی ذہانت اور اس کا اعتماد کچھ بھی تھا وہ میرے دل کے اندر گہرائیوں میں اتر چکی تھی اور ان دنوں غیر ارادی طور پر وہ میرے قریب آ چکی تھی۔

”آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا، لکھا کریں۔ آپ کے پاس آپ کا قلم قوم کی امانت ہے۔“

اور میں نے پھر سے قلم اٹھا لیا۔

”کہانیوں کے علاوہ حقائق بھی بڑے تلخ ہیں آفتاب حسین!“ ایک روز اس نے کہا تھا۔

”آپ کالم لکھیں اخباروں میں۔ آپ کی تحریر میں تاثر ہے۔ شاید لوگ سنور جائیں۔“ ایک روز اس نے کہا تو میں نے اخبار میں لکھنا شروع کر دیا۔

موضوعات کا انتخاب اکثر وہی کرتی تھی۔

بنگلہ دیش سے آنے والی عورتیں ،معصوم بچوں کا اغوا،انسانی اسمگلنگ،منشیات،لینڈ مافیا کتنے ہی موضوع تھے جن پر میں نے لکھا تھا۔کئی کئی مہینے ایک ہی موضوع پر لکھتا رہتا تھا۔ایک معروف اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں چھپنے والے میرے یہ تحقیقی مضامین ''راز دار'' کے نام سے چھپتے تھے ایک روز میرے سیل پر بابا کا فون آ گیا انہوں نے غالباً میرے اخبار سے میرا نمبر لیا تھا۔بابا کے پاس میرا دوسرا نمبر تھا میں نے دو تین کمپنیوں کی سم لے رکھی تھیں۔

''راز دار صاحب! آپ ہمارے اخبار کے لیے لکھیں۔''

''سوری بابا! یہ ممکن نہیں ہے۔'' مجھے دل ہی دل میں ہنسی آئی تھی اور میں نے فون بند کر دیا تھا۔

''یہ تم ہو تابی۔۔۔؟'' فوراً ہی بیل ہوئی ان کے لہجے میں خوشگوار سی حیرت تھی۔

''لیس ہنی بابا!''

اور اس رات میں اور بابا ڈنر ٹیبل پر اکیلے تھے۔نینا ماما اپنے کسی شوٹ کے لیے دبئی گئی ہوئی تھیں۔

''تم میرے اخبار میں کیوں نہیں لکھنا چاہتے؟''

''سوری بابا! مجھے زرد صحافت سے نفرت ہے۔بابا نے مجھ پر ایک گہری اور سنجیدہ سی نظر ڈالی تھی۔میں کسی کو بلیک میل کرنے کے لیے یہ سب کچھ نہیں لکھ رہا بابا! میں واقعتاً چاہتا ہوں کہ معاشرے سے یہ برائیاں ختم ہو جائیں۔یہ بچھو،سانپ،جو میرے پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں کچل دیئے جائیں۔''

مجھے ایک دم لگا تھا جیسے میرے لبوں سے فاطمہ کے لفظ نکل رہے ہوں میں یکدم خاموش ہو گیا تھا بابا نے پھر کچھ نہیں کہا وہ خاموشی سے سر جھکائے نوڈلز کو کانٹے پر لپیٹ رہے تھے کھانا ختم کرنے کے بعد انہوں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے اکاؤنٹ میں سے تیس لاکھ روپے مختلف اوقات میں نکالے گئے ہیں ایسی کیا ضرورت تھی؟''

ان کا انداز سرسری سا تھا میں چونکا تو کیا وہ میرے اکاؤنٹ کو چیک کرتے رہتے

ہیں۔

''یہ تمہارے اکاؤنٹ کی Statment آئی ہے آج۔جولائی سے دسمبر تک۔'' وہ جیسے میرے دل کی بات جان گئے تھے یوں ہی دیکھ لی تھی۔

''وہ رقم نایاب کو ضرورت تھی۔آپ جانتے ہیں کہ میرے لیے وہ جیب خرچ ہی کافی ہوتا ہے جو آپ دیتے ہیں۔''

وہ چونکے تھے۔''نایاب کو کس لیے؟ سوری بابا! میں یہ نہیں بتا سکتا۔''

وہ لمحہ بھر مجھے دیکھتے رہے تھے وہ کوئی معمولی آدمی نہ تھے ان کی نظریں تو پاتال تک کی خبریں لے آتی تھیں۔پھر بھلا انہیں کیسے خبر نہ ہوتی کہ نایاب کی وہ آخری باتیں۔ انہوں نے سر جھکا لیا تھا مجھے لگا تھا جیسے ان کی آنکھوں میں نمی سی پھیلی ہے۔جیسے وہ کمال ضبط سے پی گئے ہیں اس وقت میرے سامنے (حسین احمد) مشہور و معروف صحافی اور اخبار کا مالک نہیں تھا وہ صرف نایاب حسین کا باپ تھا۔

''بابا! مجھے کبھی پیسوں کی ضرورت نہیں پڑی آپ چاہیں تو وہ ساری رقم اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کروالیں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' وہ یکدم کھڑے ہو گئے۔

''وہ رقم تمہاری ہے جہاں چاہو خرچ کرو۔''

اس سے پتا نہیں کیوں مجھے ان پر ترس آیا اور اتنے دنوں سے جو نفرت ان کے لیے پال رہا تھا پانی کے جھاگ کی طرح غائب ہو گئی تھی۔وہ ایک بہترین باپ تھے،انہوں نے کبھی ہمیں جھڑکا نہیں تھا،ہمارے ساتھ ان کا رویہ دوستوں جیسا تھا،کبھی ہم پر انہوں نے اپنی مرضی مسلط نہیں کی،کبھی بے جا مداخلت نہیں کی،زندگی کی ہر آسائش ہمارے پاس تھی، انہوں نے کبھی مجھے مجبور نہیں کیا کہ میں ان کے اخبار میں کام کروں،انہی کے قدم پر چلوں، وہ اپنی ذات میں جو کچھ بھی تھے ہمارے لیے وہ ایک محبت کرنے والے،چاہنے والے باپ تھے۔میں ٹیبل پر ہاتھ رکھے انہیں سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھتا رہا تھا۔اس رات میرا دل ان کے لیے گداز ہوتا رہا لیکن اگلی صبح ایک بار پھر میں نے ان کے لیے اپنے دل میں شدید نفرت محسوس کی تھی میں فاطمہ کو ڈھونڈتا ہوا لائبریری کی طرف چلا آیا تھا

دراصل میں اور فاطمہ مل کر یونیورسٹی میگزین کے لیے مواد اکٹھا کر رہے تھے۔ میں میگزین مدیر تھا تو وہ میری معاون تھی۔ وہ لائبریری کے باہر کھڑی تھی اخبار سٹینڈ کے پاس اور اس کے ساتھ زینب، مدثر اور نوید تھے۔ مدثر بڑے زور شور سے حسین احمد کے متعلق بول رہا تھا اس کے ہاتھ میں ''صبح نو'' کا پرچہ تھا۔

''تم لوگوں نے دیکھا حسین احمد نے کیسے اس غریب کلرک کے بیٹے کے قاتل کو پکڑوایا ہے حالانکہ پولیس والے تو اس کے خلاف تھے۔ ایف آئی آر بھی نہیں لکھ رہے تھے اتنے بڑے آدمی کا بیٹا جو تھا۔''

''ہاں یار! میں کہتا ہوں اس معاشرے میں دو چار بندے ہی حسین احمد جیسے ہو جائیں تو معاشرہ سنور جائے۔''

یہ نوید تھا۔ میں نے اپنے بڑھتے قدم وہاں ہی روک لیے تھے ان تینوں کی میری طرف پیٹھ تھی۔ زینب سٹینڈ پر جھکی اخبار دیکھ رہی تھی جبکہ اس کے بالکل نزدیک فاطمہ کھڑی تھی وہ جب بولی تو میں نے اس کی آواز سے اسے پہچانا تھا۔

''کسی کے متعلق جانے بغیر کمنٹس نہیں دینے چاہیے۔''

''کیا مطلب؟'' نوید نے کہا تھا۔

''حسین احمد کو کون نہیں جانتا ان کا اخبار۔۔۔۔''

''کئی لوگ انہیں جانتے ہوں گے لیکن تم نہیں جانتے اس جیسے چند اور افراد اس معاشرے میں ہو جائیں تو معاشرہ تباہ ہو جائے گا دوغلا بلیک میلر۔''

فاطمہ کے الفاظ زہر میں ڈوبے ہوئے تھے میں سن ہو گیا تھا۔

''وہ کیسے جانتی ہے ہنی بابا کو اسے کیا خبر کہ بابا۔۔۔!''

''گڈریے کے روپ میں بھیڑیا ہے وہ لالچی۔۔۔۔''

میں مڑنا چاہتا تھا لیکن میرے قدم جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔

''تم۔۔۔۔تم یہ کیا کہہ رہی ہو فاطمہ!'' مدثر کے لہجے میں حیرت تھی۔

''حسین احمد تو ایسے نہیں وہ ایسے نہیں ہو سکتے۔''

''وہ کیسے ہیں میں تم سے بہتر جانتی ہوں۔'' اس کا لہجہ بدستور زہر میں بجھا

ہوا تھا۔

''تم جانتی ہو فاطمہ! آفتاب، حسین احمد کا بیٹا ہے۔'' مجھے حبیب نے بتایا تھا۔

''اپنا آفتاب۔۔۔۔'' نوید کے لہجے میں حیرت تھی۔

''نو۔۔۔نیور۔۔۔اتنے کرپٹ شخص کا بیٹا آفتاب نہیں ہو سکتا۔''

یہ فاطمہ تھی جس کے لہجے میں دکھ بھی تھا، بے یقینی بھی اور میں نے اس سے دوسری بار حسین احمد سے نفرت محسوس کی تھی اور سوچا تھا کہ کاش میں حبیب کو نہ بتاتا پھر جیسے کسی غیبی طاقت نے مجھے آگے دھکیلا تھا۔ میں فاطمہ کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بے یقین سی کھڑی تھی۔ جیسے اسے یہ جان کر بہت رنج پہنچا تھا۔

''ہاں فاطمہ! میں حسین احمد کا بیٹا ہوں لیکن میں نے اس عورت کی آغوش میں پرورش پائی ہے جس نے حسین احمد کی کمائی کی ایک پائی بھی استعمال نہیں کی تھی، جو روٹی پر اچار کی پھانک اور ابلا ہوا آلو رکھ کر کھاتی تھی، جس نے بیماری سے لے کر موت کی اذیت سہنے تک حسین احمد کی لائی ہوئی دوائیاں اس لیے استعمال نہیں کی تھیں کہ اسے شک تھا کہ یہ رزق حلال سے نہیں خریدی گئیں۔''

میں نے خود کو کہتے سنا تھا میری آواز قدرے بلند تھی مجھے خود نہیں پتا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں میں تو بس فاطمہ کی نظر میں سرخرو ہونا چاہتا تھا اور جو کچھ میں نے کہا تھا وہ جھوٹ بھی نہیں تھا۔

''اور میں حسین احمد کا بیٹا ہونے کے ساتھ ساتھ نایاب کا بھائی بھی ہوں۔۔۔نایاب حسین۔۔۔'' اور میری آواز جیسے میرے حلق میں ہی پھنس گئی تھی۔

''نایاب۔۔۔۔'' میں نے فاطمہ کا رنگ بدلتے دیکھا تھا۔

''نایاب! تمہارا بھائی تھا وہ نایاب اور۔۔۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی میں بھی اس کی بات سننے کے لیے نہیں رکا تھا اور تیزی سے واپس پلٹا تھا۔

''سنو!۔۔۔سنو آفتاب! ایک منٹ رکو۔۔۔'' فاطمہ میرے پیچھے لپکی تھی۔

''نایاب تمہارا بھائی تھا۔۔۔۔ہاں۔۔۔تم نے مجھے بتایا تھا نا۔ وہ مجھے گماں بھی نہیں گزرا کہ وہ۔۔۔۔ میں نے ایک بار اسے دیکھا تھا وہ بہت پیارا تھا اور اس کا دل

اس سے بھی زیادہ پیارا تھا۔"

کچھ دیر بعد کیفے ٹیریا میں وہ میرے سامنے بیٹھی کہہ رہی تھی۔

"خالہ اسے بہت یاد کرتی ہیں وہ پھر آیا ہی نہیں حالانکہ اس نے خالہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آتا رہے گا ان کی خبر گیری کرتا رہے گا اور یہ کہ وہ اسے اپنا بیٹا سمجھیں اور۔۔۔۔"

اس کی آنکھوں میں نمی تھی اس کی پلکوں پر موتی اٹکے ہوئے تھے وہ اس بیوہ خاتون کے رشتے میں اس کی بہن کی بیٹی تھی جس کے ہاں انہوں نے پناہ لی تھی۔ تب ہی وہ ہنی بابا کے متعلق جانتی تھی ورنہ بھلا کوئی غیر متعلق شخص ہنی بابا کے متعلق کیسے جان سکتا تھا کہ وہ۔۔۔

اس روز فاطمہ مجھے اپنے ساتھ اپنی خالہ کے گھر لے گئی تھی۔ جو نایاب نے انہیں لے کر دیا تھا۔

"خالہ! یہ نایاب کے بھائی حسین احمد کے بیٹے، میرے یونیورسٹی فیلو۔۔۔"

"اور نایاب۔۔۔! وہ کیسا ہے؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔

"وہ پھر آیا ہی نہیں، میرا ہر موئے جسم اس کے لیے دعا گو رہتا ہے۔ خدا سے بلند مرتبے دے وہ۔۔۔۔"

"خالہ! نایاب تو اسی رات جس صبح یہاں آیا تھا اور اس نے رجسٹری آپ۔۔۔"

فاطمہ بتا رہی تھی سب، میں سر جھکائے بیٹھا تھا اور پھر اس روز نایاب کا غم اس گھر میں ایسے منایا گیا جیسے وہ ابھی ابھی دنیا سے رخصت ہوا ہے۔ خالہ مجھے گلے لگائے یوں رو رہی تھی جیسے وہ ان کا کوئی بہت اپنا سگا تھا۔ دونوں لڑکیاں ایک طرف کھڑی مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔

"وہ ایک بات کا دھنی تھا میں کہتی تھی گل اور سنبل سے اس نے وعدہ کیا تھا وہ آئے گا پھر۔۔۔"

نایاب کا غم پھر سے تازہ ہو گیا تھا اس رات میں بہت بے چین رہا تھا اور آخر آدھی رات کو اٹھ کر نایاب کے کمرے میں چلا گیا تھا اور اس کے بیڈ پر گر کر دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔ جانے کس وقت بابا میرے رونے کی آواز سن کر کمرے میں آ گئے تھے۔ انہوں نے

میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اپنے بازو پھیلائے تھے مجھے گلے لگانے کے لیے، لیکن میں ان کے ہاتھ جھٹک کر روتا ہوا کمرے میں آ گیا تھا۔

"آپ قاتل ہیں نایاب کے۔۔۔ آپ۔۔۔!"

بابا کے ہاتھ نیچے گر گئے تھے اور وہ وہیں کھڑے رہ گئے تھے پھر بہت سارے دن میرے اور بابا کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ہاں فاطمہ مجھے وقت دینے لگی تھی ہم ڈھیروں باتیں کرنے لگے تھے لیکن وہ ایک بات جو مجھے اس سے کہنا تھی وہ میں اس سے کبھی نہیں کہہ پایا تھا۔ کبھی کبھی میری کسی بے اختیار بات پر وہ چونک جاتی تھی لیکن میں خود ہی موضوع بدل دیتا تھا پتا نہیں کون سا خوف تھا جو مجھے اس سے کچھ کہنے نہیں دیتا تھا۔

فاطمہ کی آنکھوں میں بہت سے خواب سجے تھے۔ اس ملک کے لیے کچھ کرنے کے خواب، اس معاشرے سے برائیوں کو دور کر دینے کے خواب۔۔۔

"ہمارے قلم ہمارے پاس امانت ہیں آفتاب! ہمیں ان کو بیچنا نہیں ہے ہمیں ان سے اس معاشرے کو سدھارنا ہے۔"

وہ اکثر کہتی تھی اور اس کا ہر لفظ میرے دل پر رقم ہو جاتا تھا۔ ماسٹر کرنے کے بعد ہم دونوں نے ایک ہی اخبار میں ملازمت کر لی تھی۔ اخبار میں ملازمت ملنے سے پہلے میں نے کچھ عرصہ ریڈیو پر بھی جاب کی اور پھر فاطمہ نے مجھے بتایا کہ اس کے اخبار میں ایک جگہ ہے اس اخبار کے سنڈے میگزین میں تو پہلے سے ہی لکھ رہا تھا ان دنوں پی ٹی وی کے علاوہ ورلڈ انڈس ویژن بھی متعارف ہو چکے تھے۔ ہنی بابا نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا انہوں نے میرے کسی بھی معاملے میں مداخلت نہیں کی تھی۔ میں کیا لکھ رہا ہوں کہاں جاب کر رہا ہوں۔ انہوں نے اس پر کبھی تبصرہ نہیں کیا تھا وہ یوں بھی مصروف رہتے تھے اور پھر ان دنوں تو وہ قومی اسمبلی کے الیکشن کے لیے کھڑے ہو رہے تھے وہ اور ماما گھر پر ہوتے تو کوئی نہ کوئی آتا رہتا۔ ڈسکشن چائے، کھانا۔ میں کبھی بابا یا ماما کے مہمانوں کے پاس جا کر نہیں بیٹھا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ہنی بابا کی محفلوں میں کبھی کبھار میرا ذکر بھی ہوتا ہے اور ایسے میں ان کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ اتنا ہی مشہور ہو رہا تھا میں ان دنوں۔ یکدم ہی لوگ مجھے میری تحریروں کے حوالے سے پہچاننے لگے تھے اور میرے لکھے ہوئے کو معتبر سمجھا جانے لگا

تھا۔ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ میں حسین احمد کا بیٹا ہوں۔ نہ بابا نے کبھی کسی کو بتایا تھا۔ وہ
ایک اجنبی کی طرح میری تعریف سنتے اور مسکراتے رہتے۔

''یار! کسی طرح اس رازدار کے قلم کو روکو۔''

ایک روز میں اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا جب میں نے ایک صاحب کو کہتے
سنا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا اور اندر کوئی ہنی بابا کے ساتھ تھا میرے قدم ٹھہرے۔

''سب کے کچے چٹھے کھول رہا ہے کہیں کا۔''

''ارے نہیں۔۔۔'' بابا ہنسے تھے۔

''مجھے کوئی ڈر نہیں ہے۔''

ان دنوں میں الیکشن کے حوالے سے لکھ رہا تھا۔ ''نیا جال پرانے شکاری'' کے
عنوان سے ہر ہفتے میرا ایک آرٹیکل چھپتا تھا۔

اور ہنی بابا کے یقین پر ایک لمحے کے لیے میرا دل کانپا تھا۔ آج صبح میں سوچ رہا تھا
کہ اوروں کی طرح مجھے ہنی بابا پر بھی لکھنا چاہیے۔ میں نے کچھ پوائنٹ بھی لکھے تھے لیکن اس
روز میں نے کمرے میں آ کر وہ کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ میں اندر سے ایک کمزور انسان تھا
جسے لوگوں نے پتا نہیں کیا سمجھ لیا تھا۔ فاطمہ ان دنوں مجھے اتنا Admire کرتی تھی کہ مجھے
خود پر رشک آتا تھا اور یہ اسی رات کی بات تھی جب میں ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز
ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کا سراپا تھا اور سماعتوں میں اس کی آوازیں
تھیں جب نینا ماما اور بابا اندر داخل ہوئے تھے نہ جانے کسی بات پر ماما ہنس رہی تھیں۔

''حسین! اب تابی کی شادی کا سوچیں پڑھ لیا ہے، جاب کر رہا ہے۔ یہی وقت
ہے کہ اپنا گھر بنائے کیوں جانو؟''

''وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔'' میں مسکرا دیا تھا۔

''ہاں۔۔۔ دیکھو نا تم کوئی لڑکی تلاش کرو۔'' بابا کہہ رہے تھے۔

''کیا خبر تابی نے کسی کو پسند کر رکھا ہو۔''

''کیوں جانم؟''

بابا بڑے دنوں بعد مجھ سے مخاطب تھے۔

''ہاں بابا ایک لڑکی ہے تو۔۔۔۔''

''گڈ۔۔۔ پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ اپنی ماما کو اس کا اتا پتا بتاؤ تو وہ بات کرتی
ہیں۔'' بابا میرے سامنے بیٹھے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''ہاں۔۔۔ گھر میں دلہن آ جائے گی تو کچھ زندگی نظر آئے گی۔ ورنہ تو بوبی کے
بغیر گھر کھانے کو دوڑتا ہے وہ اتنی جلدی چلا گیا۔۔۔ آج ہوتا تو تابی کی شادی کا سن کر ہی
بھنگڑا ڈالنے لگتا۔'' ماما نے کہا تھا۔

ماحول یکدم اداس ہو گیا۔ بابا کے مسکراتے لب بھنچ گئے تھے۔ ماما کی پلکیں بھیگ
گئی تھیں اور میرا دل تو جیسے بین کرنے لگا تھا۔ میں ریموٹ صوفے پر ڈال کر اپنے کمرے
میں آ گیا تاہم میں نے سوچا تھا کہ ماما سے فاطمہ کے متعلق بات کرنے سے پہلے ایک بار
فاطمہ سے بات کر لوں۔ گو میں جانتا تھا کہ فاطمہ مجھے ناپسند نہیں کرتی پھر بھی۔۔۔ لیکن انہی
دنوں فاطمہ پندرہ دن کی چھٹی لے کر کراچی اپنی کسی کزن کی شادی میں شرکت کے لیے چلی
گئی اور اچانک ماما بھی انگلینڈ چلی گئیں۔

''کیا کسی کمرشل کی شوٹنگ تھی؟'' میں نے بابا سے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں۔''

بابا اس روز بہت پژمردہ سے لاؤنج میں بیٹھے تھے اور پھر اس روز پہلی بار میں نے
دیکھا بابا لاؤنج میں ہی ڈرنک کر رہے تھے۔ شاید پہلے بھی کرتے ہوں گے لیکن اپنے بیڈروم
میں یا باہر کہیں۔ یوں اس طرح میرے سامنے میں ان سے نظریں چرا کر اپنے کمرے میں
آ گیا اور پھر اگلے کئی دن میں نے بابا کو یونہی پریشان اور بے تحاشہ ڈرنک کرتے
دیکھا۔ میں پریشان تو تھا لیکن میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن فاطمہ کراچی سے
واپس آئی تو اس نے مجھے وہاں کے ایک مقامی پرچے میں چھپنے والی خبر سنائی۔

''حسین احمد کی بیوی مشہور ماڈل نینا آج کل ایک صوبائی وزیر کے ساتھ دیکھی
جا رہی ہیں۔ سنا ہے جلد ہی حسین احمد میں اور ان میں علیحدگی ہو جائے گی۔''

''یہ ان صحافیوں کی ناک بھی بہت لمبی ہوتی ہے بے پر کی اڑاتے رہتے
ہیں۔'' میں نے خبر پڑھ کر کہا تھا لیکن یہ بے پر کی نہ تھی۔ بابا نے میرے پوچھنے پر بتایا تھا۔

"ان کے تعلقات کافی دنوں سے خراب چلے آرہے تھے اور وہ ان سے طلاق مانگ رہی ہیں۔"

"تو آپ کیا کریں گے اب؟"

"کسی کو زبردستی تو اپنے ساتھ باندھا نہیں جا سکتا نا۔"

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے تھے۔ میں اسے ڈائیورس کر رہا ہوں ایک دو روز تک پیپر تیار ہو جائیں گے۔ مجھے دکھ ہوا تھا نینا ماما نے کبھی میرے ساتھ سوتیلی ماؤں جیسا سلوک نہیں کیا تھا۔ گو بہت زیادہ محبت یا توجہ بھی نہیں دی تھی اور محبت اور توجہ تو انہوں نے نایاب کو بھی نہیں دی تھی۔ ان کی نیچر ہی ایسی تھی لیکن ان کا گھر میں ہونا میرے لیے کتنا اہم تھا۔ یہ اب ان کے جانے کے بعد میں نے جانا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ گھر میں ہوتی تھیں تو ملازم کے سر پر کھڑے ہو کر کام کرواتیں اور میرا اور نایاب کا کمرہ اپنے ہاتھوں سے صاف کرتیں۔ میں سات سال کا تھا جب وہ آئی تھیں اس گھر میں۔ میں نے انہیں سمجھانے کے لیے فون کیا تھا لیکن بے سود۔ نایاب ہوتا تو شاید وہ نہ جاتیں لیکن اب ایسا کون تھا جس کی خاطر وہ رک جاتیں اور بابا سے طلاق لے کر انہوں نے اس صوبائی وزیر سے شادی کر لی تھی۔ گو اس کی پہلے سے بھی ایک بیوی موجود تھی اور وہ ہنی بابا کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ بابا کتنے شاندار تھے اور کتنے ہینڈسم تھے اب بھی اور الیکشن جیت کر ایم این اے بن چکے تھے۔ اب ان کی مصروفیات اور بڑھ گئی تھیں۔ کبھی اسلام آباد، کبھی لاہور، جب وہ گھر پر ہوتے تو بے تحاشہ ڈرنک کرتے۔ انہوں نے پھر مجھے شادی کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس بات کو چھ ماہ ہو گئے تھے اور میں نے سوچا تھا مجھے فاطمہ سے بات کر لینا چاہیے اور جب میں نے فاطمہ سے بات کی۔ تو بے حد خاموشی سے اس نے میری بات سنی۔ اس کی آنکھوں میں اضطراب تھا۔

"مجھے اس بات کا ڈر تھا۔ میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن پھر میں نے سوچا میرا وہم نہ ہو، ورنہ کبھی تو تم اس کا اظہار کرتے، آفتاب تم بہت اچھے انسان ہو لیکن میں تمہارے لیے ایسا نہیں سوچتی میں اپنے ماموں زاد سے منسوب ہوں بچپن سے ہی۔"

"فاطمہ تم اس شادی سے انکار کر دو۔" میں مچلا۔

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا فاطمہ! میں نے صرف تمہارے ساتھ کے خواب دیکھے ہیں۔"

"سوری آفتاب! یہ ممکن نہیں، کوئی وجہ نہیں کہ میں اس شادی سے انکار کر دوں۔ شکیل میں کوئی برائی نہیں ہے۔"

"اور میں۔۔۔۔ میں کیا کروں گا فاطمہ! کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔" میں سسکا۔

"آفتاب! ہم اچھے دوست ہیں میں تم سے محبت کرتی ہوں ایک دوست کی طرح، شادی کے حوالے سے کبھی نہیں۔ سوری آفتاب! یہ ممکن نہیں ہے۔"

وہ بہت منطقی بات کر رہی تھی اسکے ہاں ذرا سی لچک نہیں تھی۔ میرا دل پاتال میں گر گیا میں لٹا لٹا سا گھر آ گیا۔ کیا سب میرے اپنے مجھے ایک ایک کر کے چھوڑ دیں گے پہلے ماں پھر دادی پھر نایاب پھر نینا ماما اور اب فاطمہ۔

فاطمہ سے میں محبت تو نہیں کرتا تھا، عشق کرتا تھا۔ میں نے وہی کیا تھا۔ اب تک جو فاطمہ نے چاہا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر خود کو اسی سانچے میں ڈھال لیا تھا جو فاطمہ کو پسند تھا۔

☆ ☆ ☆

بابا آج پھر لانج میں اکیلے محفل سجائے بیٹھے تھے ان کے ہاتھ میں جام تھا اور ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں وہ نشے میں نہیں تھے لیکن انہوں نے بہت پی رکھی تھی شاید وہ نینا ماما کا غم بھلا رہے تھے یا پھر انہیں نایاب یاد آرہا تھا۔ انہوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پلکوں پر آنسو اٹکے ہوئے تھے شاید وہ روتے رہے تھے۔ میں وہاں ہی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا میرا دل چاہ رہا تھا میں بھی دھاڑیں مار مار کر روؤں۔۔۔۔ میں کتنا خالی ہو گیا تھا کتنا ہی۔۔۔۔۔ دامن میں کتنی شدید محبت تھی فاطمہ افتخار سے۔۔۔۔ میں نے شاید عشق کیا تھا اس سے۔۔۔۔

اس کی محبت تو میرے اندر سرایت کر گئی تھی۔ میں نے تو کبھی اپنی کسی کھردری سوچ کا سایہ بھی اس پر پڑنے نہیں دیا تھا لیکن اس نے ساری کی ساری دنیا چند دنوں میں تباہ

کردی۔ وہ میرے لیے کیا تھی۔ کاش وہ جان سکتی لیکن میں کیا کرتا، کیا کرسکتا تھا، کوئی راستہ کوئی روشنی کی ننھی سی کرن، کوئی امید، کچھ بھی نہیں تھا ایک آگ سی میرے دل میں لگی تھی جو مجھے جلا کر بھسم کیے جا رہی تھی۔

شاید بابا نے میرے چہرے سے اور میری آنکھوں سے میرے دل کا حال پڑھ لیا تھا شاید انہیں وہ آنسو نظر آ گئے تھے جو میرے اندر گر رہے تھے وہ یکدم بازو پھیلا کر کھڑے ہو گئے تھے میں ان کے پھیلے بازوؤں میں سما گیا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا اب ہم دونوں رو رہے تھے۔ نایاب کے بعد پہلی بار میں ان کے گلے سے لگا تھا۔ ہاسپٹل میں بھی جب ڈاکٹر نے سر جھکائے بتایا تھا کہ ایکسپائر ہو گیا ہے تو میں ان کے پھیلے بازوؤں کو نظر انداز کر کے ماما کے بازوؤں میں سما گیا تھا۔ میں سب کے ساتھ لگا تھا اس کے دوست، اسکے پروفیسر، اس کے کلاس فیلو، کالج فیلو بس میں نے بابا کی طرف نہیں دیکھا تھا لیکن آج میں ان کے بازوؤں میں سمٹا آنسو بہا رہا تھا۔ ہم دونوں کے آنسو ایک دوسرے کے کندھے بھگو رہے تھے۔ ہم کس کے لیے رو رہے تھے نایاب کے لیے، یا ہم دونوں کو اپنا اپنا دکھ رلا رہا تھا، بابا کو نینا ماما کا اور مجھے فاطمہ کا۔۔۔۔ بہت دیر بعد پہلے ہنی بابا سنبھلے تھے انہوں نے مجھے اپنے سے الگ کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھے تھے، بہت دیر تک مجھے اپنے سے لگائے تھپکتے رہے تھے، اس رات انہوں نے بہت بچپن کی طرح میرے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا پلیٹ میں ڈالا تھا اور مجھے لقمے بنا بنا کر میرے منہ میں ڈالے تھے، مجھے بھوک نہیں تھی، مجھ سے جیسے سب کچھ چھین لیا گیا تھا، میرا اپنا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا، میں اس رات سو نہیں سکا تھا اور یہ اس کے چار دن بعد کی بات تھی جب صابر نے مجھے بتایا۔

''کہ ہنی بابا کو بہت تیز بخار ہے۔'' میں ان کے کمرے میں آ گیا ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ ڈریسنگ کے ساتھ کھڑے بالوں میں برش کر رہے تھے شاید وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

صابر نے بتایا ہے کہ ''آپ کو ٹمپریچر ہے۔''

''ہاں'' انہوں نے مڑ کر مجھے دیکھا۔

''آفس میں ضروری کام ہے۔''

''کیا میں وہ کام نہیں کر سکتا میں چلا جاتا ہوں؟''

میں نے خود کو کہتے سنا انہوں نے مجھے مڑ کر دیکھا ان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''تم نے اپنے آفس نہیں جانا''۔ میں نے جاب چھوڑ دی ہے۔

''میں نے ان سے برش لے کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا ان کا ہاتھ دہک رہا تھا آپ کو بہت ہائی ٹمپریچر ہے، آپ لیٹ جائیے، میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں اور جو کام ہے اگر میرے کرنے کا ہے تو مجھے بتا دیں۔''

مجھے لگا دوسری بار میں نے جو نفرت اپنے دل میں پائی تھی وہ نفرت یکدم ختم ہو گئی ہے میں نے ان کو زبردستی بیڈ پر لٹا دیا ان کے چہرے پر یکایک جیسے رونق آ گئی تھی وہ خاموشی سے بنا کچھ کہے لیٹ گئے تھے۔ وہ میرا واحد رشتہ تھے۔ میرا دل ان کے لیے گداز ہو رہا تھا میں سر جھکائے ان سے ہدایات لیتا رہا۔ وہ ٹھیک بھی ہو گئے آفس بھی جانے لگے لیکن غیر محسوس طور پر میں بھی ان کے ساتھ ہر کام میں شامل رہنے لگا۔ ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا شاید میری اپنی مرضی کبھی شامل نہیں رہی تھی۔ میری زندگی میں دادی نہیں تھیں تب بھی میں غیر ارادی طور پر دادی کے کہنے پر چلتا تھا۔ مجھے ہر وہ کام برا لگتا تھا جو بابا کرتے تھے۔ نایاب چلا گیا اور پھر میں وہی کرنے لگا جو فاطمہ سوچتی تھی، کہتی تھی۔ میں اپنی مرضی کی زندگی تو کبھی نہیں جیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میں نے خود سے کبھی اچھائی اور برائی کو جانچنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔ اب بھی بلا سوچے سمجھے ہنی بابا کے پیچھے چلنا شروع کر دیا تھا۔ دن بھر کی مصروفیات کے بعد رات کو جب بستر پر لیٹتا تو آنسو ہمراہ ہو جاتے۔ کاش وہ میرے پاس ہوتی لیکن وہ میرا نصیب نہیں تھی میرا تکیہ گیلا ہوتا رہتا اور میں جانے کب سو جاتا۔

اسمبلیاں اپنی مدت پوری کیے بغیر ٹوٹ گئی تھیں۔ بابا نے کہا۔

''اب کی بار میں بھی صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑوں۔'' اور میں نے کاغذات جمع کرا دیئے۔ میں وہ سب کچھ کر رہا تھا جو بابا کہتے تھے کسی روبوٹ کی طرح۔ لیکن میں نے اس روز کے بعد قلم نہیں اٹھایا تھا حالانکہ بابا نے کئی بار کہا تھا۔

''جانو! تھوڑا وقت اپنے قلم کے لیے بھی نکالو۔۔۔۔ زنگ لگ رہا ہے اسے اتنی صلاحیت دی ہے اللہ نے تمہیں لکھنے کی۔''

لیکن فاطمہ کہتی تھی ''اگر تم اپنے قلم کی حرمت برقرار نہیں رکھ سکتے تو بہتر ہے کہ قلم توڑ دو۔ سو میں نے قلم توڑ دیا تھا۔ کچھ عرصہ لوگوں نے مجھے یاد کیا خط لکھے، پکارا اور پھر ہولے ہولے بھول گئے۔ یہی انسانی فطرت ہے جب لوگ پس منظر میں چلے جائیں تو انہیں بھلا دیا جاتا ہے اور مجھے خود بھی یاد نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ قلم تھامے ہوئے ہیں۔ سچے، جھوٹے، منافق، دیانت دار، بددیانت۔ قلم لکھنے والے ہاتھ کا آئینہ ہوتا ہے، لکھنے والے کا عکس اسکے قلم سے جھلکتا ہے، سو میں نے قلم رکھ دیا تھا اور اب دو جمع دو کا کھیل کھیلنے لگا تھا۔

''یار! شادی کا کیا پروگرام ہے؟ عورت کے بغیر گھر بڑا سونا سونا سا لگتا ہے۔''

''میرا تو کوئی پروگرام نہیں آپ سوچ لیں۔''

''ارے میں اس عمر میں۔۔۔۔؟'' وہ ہنس دیئے۔

''اتنے سمارٹ سے تو ہیں آپ!''

''تمہارا پروگرام کیوں نہیں ہے اور وہ لڑکی کہاں ہے جسے تم پسند کرتے تھے؟'' اس بار بابا نے مجھے گھیر لیا۔

''وہ لڑکی مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''کیوں؟ کیا کمی ہے میرے بیٹے میں؟'' بابا کو شاک سا لگا تھا۔

''مجھے اس کا اتا پتا بتاؤ تو میں۔۔۔۔'' ان کی ادھوری بات اخذ کرنے میں مجھے دیر نہیں لگی تھیں۔

''نہیں بابا ہرگز نہیں۔'' میرا لہجہ بہت سخت تھا۔

''آپ زبردستی کسی دل میں اپنے لیے محبت پیدا نہیں کر سکتے اور پھر کسی کو زبردستی اپنی زندگی میں شامل کر لینے سے آپ اس کے جسم پر تو قابض ہو سکتے ہیں لیکن روح و دل میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔'' بابا نے میری بات تفصیل سے سنی تھی۔

''یہ کہاں دل لگا بیٹھے ہو میری جان!'' انہیں دکھ ہوا تھا۔

''چلو یوں کرو کسی بھی اچھی لڑکی سے شادی کر لو، گھر بنا لو، بچے ہوں گے تو زندگی کو جینے کا ایک جواز مل جائے گا۔ میرے لیے تو تم ہو تمہارے لیے بھی تو کوئی جواز ہونا

چاہیے۔۔۔۔'' وہ دل گرفتہ ہو رہے تھے۔

''ٹھیک ہے بابا! لیکن ابھی نہیں، ابھی تو زخمی دل سے خون رستا ہے ابھی تو یادوں کے پاؤں میں کانٹے چبھے ہیں ابھی نہیں بابا!''

''یار! بہت دیر نہ کر دینا۔ اس سے پہلے کہ پیغام اجل آ جائے۔''

وہ ہنسے تھے لیکن ان کی ہنسی میں کیا تھا کہ میں اندر تک لرز گیا اور میں نے سوچا تھا کچھ بھی ہو فاطمہ کے ساتھ کتنی ہی شدید محبت کیوں نہ ہو اور اس کے سوا اپنی زندگی میں شامل کرنے کا کسی کا بھی نہ سوچا ہو پھر بھی بابا کی خاطر ہی بابا کی خاطر میں اپنے دل کو جلد سے جلد کسی دوسری ہستی اور رفاقت کے لئے قائل کرنے کی کوشش کروں گا لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قدرت ہمارے فیصلوں اور ارادوں پر ہنستی ہے اس کے فیصلے اور ہوتے ہیں ابھی میں دل کو سمجھا بھی نہ پایا تھا کہ پیغام اجل آ گیا بابا کا بہت خطرناک ایکسیڈنٹ ہو گیا وہ جائے حادثہ پر بغیر کچھ کہے فوت ہو گئے۔

میں یکدم تنہا ہو گیا تھا پچھتاوا میری رگوں میں پنجے گاڑھے مجھے اپنے ناخن چبھو رہا تھا میں نے اتنی دیر کیوں کر دی۔ کوئی تو ہوتا اس گھر میں جس کے کندھے پر سر رکھ کر میں روتا اس شخص کے لیے جس سے میں نے محبت بھی کی تھی نفرت بھی کی تھی اور جو اس بھری دنیا میں میرا واحد اپنا تھا پھر نہ جانے کتنے دن گزر گئے شاید آٹھ یا شاید دس دن۔

لوگ مسلسل آ رہے تھے افسوس کر رہے تھے اخباروں میں ان پر کالم لکھے جا رہے تھے ایک بے باک صحافی۔۔۔ اچھا صحافی۔۔۔ اچھا انسان۔۔۔

کسی نے انہیں برا بھلا نہیں کہا تھا کسی نے ان کے متعلق کچھ اور نہیں لکھا تھا۔

اور فاطمہ افتخار۔۔۔ فاطمہ افتخار اگر وہ لکھتی تو کیا لکھتی۔۔۔ اور اگر وہ لکھتی بھی تو کیا وہ چھپ جاتا کہیں۔

میں نے ایک روز سوچا تھا اب تو مجھے بھی لگنے لگا تھا کہ بابا جیسا عظیم صحافی اس دور میں پیدا نہیں ہوا تھا کسی نے نہیں لکھا کہ وہ سملگنگ کرتے تھے کسی نے انہیں بلیک میلر نہیں کہا تھا۔ تو کرتے کیا یہاں تو سب ہی سمگلر تھے اور سب ہی بلیک میلر تھے۔ میں یونہی گھر میں ادھر سے ادھر کمروں میں پھرتے ہوئے سوچتا رہتا تھا۔ خالی کمرے انسانوں کے

بغیر۔۔۔نایاب کا کمرہ اب بھی ویسا ہی تھا وہی شیلف پر اس کی میڈیکل کی کتابیں سجی تھیں، ایک طرف ٹرالی پر ٹی وی تھا دوسری طرف کمپیوٹر تھا ماؤس ایسے پڑا تھا جیسے ابھی ابھی وہ کمرے سے باہر نکلا ہو اور اس کا ہاتھ ماؤس کو ادھر ادھر کر رہا تھا۔

بابا کا کمرہ بھی ایسے ہی تھا بیڈ پر ابھی ان کا کمبل بھی یوں ہی ادھ کھلا پڑا تھا۔رائٹنگ ٹیبل پر کلپ بورڈ میں کاغذ لگے، پاس ان کے تین چار پوائنٹر پڑے ہوئے تھے، ایک طرف دیوار میں دروازے کے ساتھ زمین سے چھت تک بک شیلف بنی ہوئی تھی۔طرح طرح کی کتابوں سے بھری۔ وہ لکھنے پڑھنے کا سارا کام اپنے بیڈ روم میں ہی کرتے تھے حالانکہ فرسٹ فلور پر الگ سے سٹڈی روم بھی تھا۔ کمرے میں ابھی تک ان کی خوشبو بکھری تھی وہ دونوں نہیں تھے اور میں کمروں میں ان کی خوشبو محسوس کرتا پھرتا تھا اور وہ آٹھواں دن تھا یا شاید دسواں جب صابر نے آ کر مجھے بتایا۔

’’کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔‘‘

’’اچھا! انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔‘‘

لوگ تو روز ہی آتے رہتے تھے لیکن یہ لوگ جو آج آئے تھے یہ روزمرہ آنے والے لوگوں سے بالکل مختلف تھے وہ نو کے نو آدمی مجھے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے تھے ۔میں نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا تو تب ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والے نہ تو کسی اخبار سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کا تعلق لکھنے لکھانے سے ہے اور نہ ہی یہ کسی انتظامی ادارے سے متعلق بیوروکریسی کے لوگ ہیں۔

’’ہمیں حسین احمد صاحب کا بہت افسوس ہے۔‘‘ ان میں سے ایک شخص نے کہا۔

میں الجھا الجھا سا بیٹھ گیا تھا۔

’’ہم گو جنازے میں شریک ہوئے تھے لیکن آپ کے پاس اس لیے حاضر نہیں ہو سکے تھے کہ ہم چاہتے تھے آپ سنبھل جائیں کچھ اور پھر لوگ بھی بہت آ جا رہے تھے ہم اکیلے میں آپ کے پاس آنا چاہتے تھے۔‘‘

میں خاموشی سے ہاتھ گود میں دھرے انہیں سن رہا تھا۔

’’حسین احمد بہت اچھے انسان تھے اور بہت اچھے باس تھے۔‘‘ اب دوسرا بول رہا

تھا۔

’’اب وہ چلے گئے ہیں تو ہم اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آج سے آپ ہمارے باس ہیں اور ہم آپ سے عہد کرتے ہیں کہ ہمیشہ آپ کے وفادار رہیں گے۔ حسین احمد صاحب نے یقیناً آپ سے ذکر تو کیا ہوگا۔‘‘

بابا نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا لیکن میں خاموش ہی رہا تھا۔

’’ہم سب حاضر ہیں یہاں ہم نے مناسب نہیں سمجھا۔‘‘ اب پہلے والا مجھے تفصیل بتا رہا تھا۔

ہنی بابا کی زندگی کا یہ پہلو مجھ سے مخفی تھا۔ بابا نے کبھی ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ کسی اسمگلنگ کرنے والے گروہ سے بھی منسلک ہیں یہ لوگ منشیات کے علاوہ ہر چیز کی اسمگلنگ کرتے تھے۔ پتا نہیں بابا کیسے اس گروہ میں اور کب شامل ہوئے تھے یا میری طرح حادثاتی طور پر انہیں اس گروہ کی سربراہی مل گئی تھی جس طرح بابا کی ہر شے رقم، جائیداد مجھے منتقل ہوئی تھی اسی طرح میں اس تنظیم کا بگ باس بھی بن گیا تھا۔ بابا کو شاید موقع نہیں ملا تھا مجھے کچھ بتانے کا ورنہ۔۔۔

اور زندگی اسی ڈگر پر چلنے لگی تھی کبھی کبھی لمحہ بھر کے لیے مجھے خیال ضرور آتا تھا کہ بابا کو اتنی دولت کی ہوس کیوں تھی اور اب میں کیوں دونوں ہاتھوں سے دولت کمائے جا رہا ہوں، کس کے لیے، لیکن سارا سیٹ اپ تو بنا ہوا تھا اور دولت خود بخود آتی جاتی تھی یہ میں کس جال میں پھنس گیا تھا کیسی بھول بھلیاں تھیں جن میں ہر نیا دن مجھے الجھاتا جا رہا تھا پیچھے جانے کا راستہ میں کھو بیٹھا تھا اور آگے سب اندھی بھول بھلیاں تھیں۔

’’کیا میں شادی کر لوں تاکہ اس اتنی بے تحاشہ دولت کو سنبھالنے والا کوئی ہو؟‘‘

ایک بار میں نے سوچا تھا ’’لیکن نہیں مجھے اپنے پیچھے کسی کو ان بھول بھلیوں میں پھنسنے کے لیے نہیں چھوڑنا۔۔۔‘‘

میں کون سا آفتاب حسین۔۔۔

ایک بڑے اخبار کا مالک۔۔۔

صوبائی اسمبلی کا ممبر۔۔۔۔

اور ایک تنظیم کا بگ باس۔۔۔۔

لیکن آفتاب حسین کہاں تھا۔

وہ آفتاب حسین جو دادی کی گود میں سر رکھ کر سبق آموز کہانیاں سنتا تھا۔ جو جھوٹ سے کرپشن سے نفرت کرتا تھا جو فاطمہ کے ساتھ مل کر اس معاشرے سے ہر برائی کو دور کر دینے کے خواب دیکھتا تھا۔ شاید کہیں بھی نہیں وہ تو کمزور تنکے جیسا تھا جو پانی کے ریلے میں بہتا چلا جاتا ہے جس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی بس پانی کا بہاؤ جہاں چاہے اسے بہا لے جائے وہ بہتا رہا تھا۔

جب اسید عبدالرحمٰن ان کی زندگی میں داخل ہوا وہ اسید عبدالرحمٰن۔۔۔۔ جس کی کہانی لکھنے کی چاہ ہے مجھے، اپنی زندگی کی آخری کہانی۔۔۔۔ لیکن پتا نہیں میں یہ کہانی لکھ بھی پاؤں گا یا نہیں یہ نرس میرے منع کرنے کے باوجود پھر مجھے آ کر گلوکوز لگا گئی ہے پتا نہیں یہ بار بار گلوکوز کیوں لگا جاتی ہے، شاید اس بوتل میں کچھ انجکشن ڈال رکھے ہیں اس نے اور شاید کئی دنوں سے میرے اندر کوئی فوڈ نہیں گیا اور اس کے ذریعے یہ مجھے توانائی بحال رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، میں چند دن پہلے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوا تھا۔ گاڑی کے حادثے میں بظاہر تو میں زیادہ زخمی نہیں ہوا تھا۔ میرا ایک معمولی سا آپریشن ہوا تھا لیکن پتا نہیں کیوں ڈاکٹر مجھے ڈسچارج نہیں کر رہے ہیں شاید اندر کہیں کوئی گڑبڑ نظر آ گئی ہے ان کو اور میرا کتنا دل چاہتا ہے کہ وہ اس وقت یہاں ہاسپٹل کے اس کمرے میں میرے پاس ہوتا۔ میرا خیال رکھتا ہوتا۔ وہ اسید عبدالرحمٰن جو میرا کچھ نہیں ہے پھر بھی جب وہ میرے آفس میں آیا تھا تو میں نے اس کے لیے بڑی اپنائیت محسوس کی تھی اپنی لمبی انگلیوں والے ہاتھوں کو بے چینی سے ملتا ہوا وہ بہت مضطرب سا لگ رہا تھا اور اس کے ہاتھ دیکھ کر مجھے نایاب یاد آ گیا تھا۔

”سر! وہ۔۔۔ ہمارا ایک کلاس فیلو ہے اسے بلڈ کینسر ہے ہم اس کے علاج کے لیے پیسے اکٹھے کر رہے ہیں وہ ایک بیوہ کا اکلوتا بیٹا ہے۔“

مجھے لگا جیسے نایاب میرے سامنے بیٹھا ہے۔

”بھائی! وہ عورت بیوہ ہے اس کی یتیم بچیاں۔۔۔۔؟“

”اوکے! کتنی رقم چاہیے؟“

”سر! جو آپ دینا چاہیں۔“

اس کی آنکھوں سے یکایک احسان مندی جھلکنے لگی تھی۔ میں نے دراز سے چیک بک نکال کر دستخط کیے اور چیک بک اس کی طرف بڑھا دی۔

”اپنی مرضی سے اس میں رقم لکھ لو۔“

”سر! آپ۔۔۔۔!“ اس کی آنکھوں میں حیرت سی نمودار ہوئی اور پھر فوراً ہی وہاں سے شک جھلکنے لگا۔

”میرا اکاؤنٹ خالی نہیں ہے چاہو تو ابھی فون کر کے معلوم کر لو میں بھی حسین احمد کا بیٹا تھا میں نے اس کے دل میں ابھرتے ہوئے شک کو جان لیا۔

”سر! اگر میں بیس پچیس لاکھ لکھ لوں تو۔۔۔۔“ اب وہ قدرے اعتماد سے بات کر رہا تھا۔

”اگر تم سمجھتے ہو کہ اس بچے کے علاج کے لیے اتنی رقم کی ضرورت ہے تو لکھ لو۔“

اب اپنی حیرت چھپانے کے لیے اس نے فوراً نظریں جھکا لیں تھیں اور کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”سر پچیس ہزار لکھ لوں۔“

”ایک لاکھ لکھ لو اگر میری ہی مرضی سے لکھنا ہے تو۔ ورنہ جو چاہے لکھ لو۔“

”تھینک یو سر!“ اس نے چیک لکھ کر مجھے دکھایا۔

”اگر پھر کبھی ضرورت پڑے تو بلا جھجک آ جانا خدا تمہارے دوست کو صحت و تندرستی اور زندگی دے اگرچہ اس مرض میں زندگی کا امکان زیرو پرسنٹ ہی ہوتا ہے۔“

”جانتا ہوں سر! لیکن اسے اذیت میں بھی تو دیکھا نہیں جاتا۔“

”اگر باہر بھجوانا ہو تو میں بھجوا دیتا ہوں سب خرچ میرے ذمے ہو گا۔“

”اوکے سر!“ وہ ممنون ہوا۔

دل نے خواہش کی کہ وہ پھر آئے کبھی اور وہ پھر آ گیا۔ صرف تین دن بعد پہلے روز کی طرح مضطرب اور انگلیاں چٹختا ہوا۔

”آؤ آؤ۔۔۔۔“ میں دروازہ کھول کر آفس سے نکل رہا تھا کہ وہ مجھے نظر آ گیا

میرے آفس کے باہر کھڑے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے میں واپس پلٹ آیا۔

''کیا حال ہے تمہارے دوست کا؟''

اس نے جواب نہیں دیا تھا لیکن وہ بے حد مضطرب تھا۔

''کیا مزید رقم کی ضرورت ہے؟''

''نہیں!''

اس نے چیک جیب سے نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

''سر! یہ آپ کا چیک۔''

''کیوں؟'' میں اس سے زیادہ مضطرب ہو گیا تھا۔

''کیا تمہارا دوست۔۔۔۔''

''نہیں ابھی تو علاج ہو رہا ہے اس کا، ایک دو روز تک باہر لے کر جانے کا انتظام ہو جائے گا۔''

''تو پھر۔۔۔؟'' میں نے نظریں اٹھائیں وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

''تو پھر۔۔۔۔'' اس نے میری بات دہرائی اور پھر جیسے وہ پھٹ پڑا۔

''میں نے ان تین دنوں میں کتنا سوچا آپ کو اور کتنی بلندی پر بٹھایا آپ کو اپنے دل میں سب سے اونچی مسند پر بٹھایا تھا آپ کو، آپ آسمان تھے اور۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن آپ۔۔۔۔۔!''

اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن میں اسے تو نہیں دیکھ رہا تھا میں تو نایاب کو دیکھ رہا تھا۔

''کتنا آئیڈلائز کرتا تھا میں آپ کو، کتنا بلند سمجھتا تھا آپ کو۔۔۔۔''

جب میں نے اس کے دادا جان کو بتایا کہ یہ چیک آپ نے دیا ہے تو انہوں نے اسے لینے سے انکار کر دیا انہوں نے کہا۔

''کہ حسین احمد ایک بلیک میلر تھا اور اس کا بیٹا۔۔۔!''

وہ پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا میں تو اپنی جگہ بیٹھے سن ہو گیا تھا مجھے لگا تھا جیسے اس نے

اس اسید عبدالرحمٰن نے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔

''وہ کہتے ہیں ساری زندگی اسے رزق حلال کھلایا اب آخری لمحوں میں اس کے جسم میں حرام کی آمیزش کیسے کروں؟''

میرے کانوں نے سنا تھا میں اسید عبدالرحمٰن کے ہلتے لبوں کو دیکھ رہا تھا لیکن میرے کانوں میں ایک اور آواز بھی زندہ ہو گئی تھی۔

''ساری زندگی رزق حلال کھایا ہے حسین احمد اب کیسے۔۔۔؟''

یہ دادی تھیں میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا کیا دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں اور اسید عبدالرحمٰن اپنی بات کہہ کر اور چیک میری ٹیبل پر رکھ کر واپس چلا گیا تھا۔

''ہوتے ہوں گے لیکن بہت کم۔۔۔''

میں نے خود ہی جواب دیا تھا اور کتنے لوگ ہیں جو حسین احمد اور آفتاب حسین کے اصل چہرے کو جانتے ہیں۔۔۔۔ اور پھر پتا نہیں کیوں مجھے فاطمہ کا خیال آ گیا۔۔۔ اور کیا وہ فاطمہ کا بیٹا ہے میں نے سوچا اور فاطمہ۔۔۔۔ میرا دل جیسے ڈوب کر ابھرا اس کے والد کی ڈیتھ ہو چکی ہے اور والدہ پہلی ملاقات میں اسید عبدالرحمٰن نے اس کے متعلق بتایا تھا تو کیا فاطمہ۔۔۔۔؟''

اور اس روز جب میں آفس سے اٹھا تو میری گاڑی اقبال ٹاؤن کی طرف جا رہی تھی اقبال ٹاؤن میں عمر بلاک کے اس گھر کے سامنے میں نے گاڑی روکی تو ایک لمحے کو خود بھی ٹھٹک گیا میں کتنے عرصہ بعد یہاں آیا تھا آخری بار میں فاطمہ کے ساتھ یہاں آیا تھا جب۔۔۔۔

''کون؟'' ایک لڑکی ٹیرس سے پوچھ رہی تھی

''میں آفتاب حسین۔۔۔ حسین احمد کا بیٹا۔۔۔''

حسین احمد نے جوان کی زندگی میں کردار ادا کیا تھا وہ اسے کبھی نہیں بھلا سکتے تھے دروازہ فوراً ہی کھل گیا وہی مہربان چہرے والی خاتون حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

''اے بیٹا! تم ہو آجاؤ نا۔۔۔ آجاؤ۔۔۔ میں تو تمہیں بہت یاد کرتی رہی تمہارے ابا کی وفات کی خبر پڑھی تھی فون بھی کیا تھا فاطمہ سے نمبر لے کر۔''

کتنے ہی تعزیت کے فون آئے تھے شاید ان کا بھی ہوگا میں ان کی باتیں سنتے ہوئے ان کے ساتھ چلتا ہوا ٹی وی لاؤنج میں آ گیا۔

"بیٹا ڈرائنگ روم میں چلو۔"

"نہیں میں یہاں ہی ٹھیک ہوں۔"

آخری بار جب میں فاطمہ کے ساتھ آیا تھا تو یہاں ہی بیٹھا تھا اور وہاں سامنے صوفے پر فاطمہ بیٹھی ہوئی تھی دونوں پاؤں صوفے پر دھرے وہ اپنے پاؤں دبا رہی تھی اور میں اس کے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا اس نے اس روز بہت اونچی ہیل پہنی ہوئی تھی اور چلتے چلتے اس کے پاؤں درد کرنے لگے تھے میں فاطمہ کے ساتھ اس کی ان خالہ کے گھر ٹوٹل تین بار آیا تھا۔

"فاطمہ یہاں تھی تو تم بھی کبھی کبھار اس کے ساتھ آ جایا کرتے تھے فاطمہ بیاہ کر کراچی کیا گئی تو تم نے مڑ کر خبر تک نہ لی۔"

"فاطمہ کہاں ہے آج کل؟"

"کراچی میں اپنے گھر میں، خوش ہے دو بچے ہیں اس کے۔"

میں نے ایک اطمینان بھری سانس لی پتہ نہیں کیوں میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ لڑکا فاطمہ کا ہی بیٹا ہوگا۔ کہانیوں افسانوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرے ساتھ تو کبھی کہانیوں اور افسانوں جیسا نہیں ہوا تھا اور میں بھی کس قدر احمق تھا میرے تنے ہوئے اعصاب ذرا ڈھیلے ہوئے۔ ضروری تو نہیں کہ دنیا میں صرف ایک فاطمہ ہی ہے جو حسین احمد کو جانتی ہے اور بھی تو لوگ ہوں گے وہ جن کے ساتھ کچھ غلط ہوا یا وہ جو کسی نہ کسی حوالے سے حسین احمد کا اصل چہرہ پہچانتے تھے اور وہ شخص بھی کوئی ایسا ہی ہوگا مجھے اس شخص کی استقامت پر رشک آیا جس نے دم مرگ پوتے کی زندگی پر رزق حلال کو ترجیح دی تھی۔

ایک لڑکی کولڈ ڈرنک لائی تھی اس نے اسلام کیا تھا۔

"یہ گل ہے نایاب میری چھوٹی بیٹی۔" خاتون بتا رہی تھیں۔

سنبل کی تو شادی کر دی تھی میں نے۔ فاطمہ کے بھائی کے ساتھ۔ ماشاءاللہ خوش ہے اپنے گھر میں، مسقط میں بہت اچھی جاب ہے اس کی، ہر چھ مہینے میں دونوں چھٹی لے کر

آتے ہیں۔"

میں خاموشی سے سن رہا تھا۔

انہوں نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا "میں بہت دنوں سے سوچ رہی تھی کسی روز اخبار کے دفتر سے تمہارا نمبر لے کر تم سے بات کروں۔"

"کہیے آنٹی! کوئی کام تھا آپ کو۔"

"بیٹا! خدا تمہارے بھائی کو آخرت کی ساری خوشیاں اور بلند مقام دے اس نے ہم پر بہت احسان کیا ہمیں شاید ہمارے حق سے زیادہ دیا لیکن بیٹا وہ جگہ میرے شوہر نے خریدی تھی وہ بڑے شوق سے وہاں گھر تعمیر کروا رہے تھے اس جگہ سے ہماری جذباتی وابستگی فطری ہے خاص طور پر سنبل اب بھی جذباتی ہو جاتی ہے ہم جب بھی اس طرف جائیں دیکھتے ہیں وہ تینوں پلاٹ یوں ہی خالی پڑے ہیں اور چوتھا ہمارے گھر والا اسطرح بند ہے۔"

وہ بول رہی تھیں اور مجھے یاد آیا ایک بار بابا کہہ رہے تھے میرا دل نہیں مانتا کہ وہاں کچھ تعمیر کرواؤں وہ نایاب کے لیے گھر بنانا چاہتے تھے اور نایاب ہی نہیں رہا تھا۔ نایاب نے کہا تھا مجھے یہ گھر نہیں چاہیے جس کی بنیادیں یتیموں کی آہوں اور آنسوؤں پر رکھی گئی ہوں اور شاید اسی لیے بابا کا دل نہیں مانتا تھا۔

"بیٹا! اگر کبھی وہ جگہ بیچنے کا ارادہ بنے تو سنبل خریدنا چاہتی ہے، وہ خرید سکتی ہے میں یہ نہیں کہہ رہی کہ ضرور بیچو لیکن اگر کبھی ارادہ ہو تو جو قیمت لگے گی۔۔۔۔"

مجھے خاموش دیکھ کر انہوں نے پھر کہا تھا اور میں نے سر ہلایا تھا۔

وہاں سے اٹھ کر میں بڑے دنوں بعد قبرستان گیا تھا نایاب، بابا اور دادی تینوں ساتھ ساتھ ہی منوں مٹی تلے آرام کر رہے تھے۔ میں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا رہا میری آنکھیں جل رہی تھیں لیکن ان میں آنسو نہیں تھے۔

"کیا تھی میری زندگی؟"

"میں کیا کر رہا تھا میرے پاس کیا مقصد، کیا جواز تھا، اس سب کا اور میں جو کر رہا تھا اس کے لیے میں نے خود کو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔"

بس ایک نیٹ ورک تھا بابا کا بنایا ہوا اور سب کام ہوتے رہے تھے میں تو بس آفس میں بیٹھ کر چیکوں پر دستخط کرتا تھا یا پھر فون پر سنتا تھا کہ کہاں کیا ہو رہا ہے بابا کے سب آدمی اپنی اپنی جگہ پرفیکٹ اور وفادار تھے لیکن میں یہ سب کیوں کر رہا تھا اور کس کے لیے آج سے پہلے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا یہ اسید عبدالرحمٰن نے لمحوں میں کیا جادو کر دیا تھا کہ میں وہ سوچ رہا تھا جو پچھلے سالوں میں نے کبھی نہیں سوچا تھا میں قبرستان سے اٹھا تو جوہر ٹاؤن کے اس بلاک میں پہنچ گیا جہاں وہ پلاٹ تھے تینوں پلاٹوں میں جھگیاں بنی ہوئی تھیں اور وہ چوتھا پلاٹ جس پر ان کا گھر تھا اس گھر کا مین دروازہ کھلا تھا اور اندر ایک سائیکل مکینک بیٹھا پنکچر لگا رہا تھا مجھے دیکھ کر گھبرا گیا۔

”وہ جی میں نے حاجی صاحب کی اجازت سے یہاں سامان رکھا ہے۔“

حاجی صاحب بھی بابا کے ایک کارندے تھے بابا نے بھی نا جانے کیسے کیسے نابغہ روزگار اکٹھے کر رکھے تھے۔ حاجی صاحب کے ذمہ مختلف پلاٹوں اور جائیداد کی وقتاً فوقتاً نگرانی تھی کہ کہیں کوئی قبضہ نہ کر لے۔

”او کے۔۔۔۔ آپ چند دنوں میں بندوبست کر لیں کہیں اور یہ جگہ فروخت کر دی گئی ہے دس پندرہ دن تک نئے مالک آ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے جی کوئی چائے پانی۔۔۔۔“

اور میں شکریہ ادا کر کے چلا آیا پھر اگلے چند دنوں میں بابا کے کاغذات سے میں نے وہ فائل ڈھونڈی جس پر زبردستی دستخط کروائے گئے تھے وہ گھر ابھی تک منظور کے نام ہی تھا۔ ہاں ایک اسٹام پر دستخط کروائے تھے جس پر لکھا ہوا تھا کہ یہ گھر میں نے اپنی مرضی سے تین لاکھ کے عوض حسین احمد کو فروخت کر دیا ہے۔ نیچے گھر کے اہلیان کے دستخط تھے ابھی تک گھر کی رجسٹری بابا کے نام نہیں ہوئی تھی۔ شاید نایاب کے اس طرح چلے جانے سے بابا ڈسٹرب ہو گئے تھے اور اس اسٹام کی بھلا کیا اہمیت تھی لیکن بابا جانتے ہوں گے کہ بے چاری عورتیں کیا کر سکتی ہیں میں نے جب ان کے مکان کے کاغذات ان کے حوالے کیے تو وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔

”بیٹا! یہ۔۔۔۔ کتنی قیمت دینی ہو گی سنبل کو، تم پہلے بتا دیتے میں بات کرتی

اس سے تو وہ رقم اکٹھی کرتی؟“

”کبھی بھی نہیں آنٹی! یہ آپ کا تھا اور میں نے آپ کا حق آپ کو واپس کیا ہے مجھے کچھ تاخیر ہو گئی اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔“

”ارے بیٹا! کیسی باتیں کرتے ہو؟ حق نایاب بیٹے نے تو۔۔۔۔“

”وہ اپنے بیٹے کی طرف سے گفٹ سمجھ لیں اور یہ آپ کا حق ہے۔“

میں انہیں حیران چھوڑ کر چلا آیا۔ کئی دنوں بعد آج دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تھا پتا نہیں کیوں رات کو بیڈ پر لیٹا تو اسید عبدالرحمٰن کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا اور میں نے سوچا کہ کبھی پھر میری اس سے ملاقات ہو جائے اور میں اس سے پوچھوں ذرا مجھے کسی روز اپنے دوست کے دادا سے تو ملاؤ میں اس شخص کو دیکھوں جو اپنے ارادوں میں اتنا محکم ہے اور میں نے تو یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ اسید عبدالرحمٰن خود کون ہے؟ کہاں پڑھتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کاش۔۔۔۔ کاش!!!!! میں اس سے کچھ پوچھ لیتا وہ متوسط طبقے کا لگتا تھا لیکن اس میں کچھ تھا، کچھ خاص۔

”میں نے آپ کو آسمان پر بٹھا لیا تھا اور آپ۔۔۔۔!“

اس کی ٹوٹتی بکھرتی آواز۔۔۔۔۔ میرے کانوں میں اکثر گونجتی تھی میرا تو کوئی رشتہ نہ تھا اس سے، پھر وہ اتنا دکھی کیوں ہو رہا تھا صرف ایک ملاقات اور اتنی جذباتیت؟

اس روز میں میاں صدیق کے پاس بیٹھا تھا انہیں اپنی کنسٹرکشن کمپنی میں ایک کمپیوٹر آپریٹر کی ضرورت تھی جس کے لیے انٹرویوز ہو رہے تھے اس کمپنی میں بابا کا شیئر بھی تھا بلکہ پیسہ سارا بابا نے ہی لگایا تھا۔ ابتدا میں میاں صدیق جو خود بھی انجینئر تھے اور ٹاؤن پلاننگ کی تعلیم باہر سے حاصل کر کے آئے تھے وہ ہی اس کمپنی کو چلا رہے تھے اب تو خیر کئی اور انجینئر ان کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ بہت محنتی اور ایماندار شخص تھے وہ۔ بابا کی دوسری ایکٹی ویٹیز سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ بس اپنے کام سے عشق تھا انہیں اور چند ہی سالوں میں اس کی ساکھ بن گئی تھی۔ ملک اور بیرون ملک دونوں جگہ انٹرویو صدیق صاحب خود لے رہے تھے میں تو یوں ہی چلا گیا تھا ان کی طرف جب اچانک میری نظر اس پر پڑی تھی۔ میاں صاحب اس کی فائل دیکھ رہے تھے اور وہ مجھے دیکھ رہا تھا کچھ حیران سا۔

"بھئی! ہم نے کمپیوٹر میں مہارت کے لیے اشتہار دیا تھا اور آپ جرنلزم میں ماسٹر کر کے یہاں چلے آئے آپ کو کسی اخبار کے دفتر میں جانا چاہیے تھا؟"

"سر!" اس نے مجھ سے نظریں ہٹالیں اس کی نظروں میں تاسف اور دکھ آج بھی جھلک رہا تھا۔

"میں نے کمپیوٹر کے بے شمار کورسز کر رکھے ہیں۔ میں نے مہارت حاصل کی ہے اور میں کسی بی سی ایس سے زیادہ بہتر کارکردگی دکھا سکتا ہوں۔ سر! آپ مجھے آزما سکتے ہیں۔" وہ بہت اعتماد سے بات کر رہا تھا میری طرف دیکھے بغیر۔

"ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں کہ ہم آزماتے رہیں ہمیں تو کام کا بندہ چاہیے۔" خیر انہوں نے ایک دو یونہی رسمی سے سوال کر کے اسے رخصت کر دیا۔

"میاں صاحب! اس بچے کو رکھ لیں۔"

"لیکن۔۔۔۔"

"پلیز میاں صاحب! پہلی بار آپ سے کوئی بات کہی ہے آزمالیں صحیح کام نہ کیا تو ٹھیک ہے۔"

اور دوسرے ہی دن شام کو وہ میرے دفتر میں موجود تھا۔

"آپ نے میری سفارش کی تھی؟" میں مسکرایا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو اور پھر مجھے بھلا کیا ضرورت تھی تمہاری سفارش کرنے کی؟"

"ہاں۔۔۔۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"آپ کو کیا ضرورت تھی لیکن سر! مجھے صاحب کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھے نہیں رکھیں گے جبکہ مجھ سے پہلے دو سوفٹ ویئر انجینئر اور ایم سی ایس کے ڈگری ہولڈر انٹرویو دے چکے تھے۔"

"ہو سکتا ہے مجھے تم میں کوئی ٹیلنٹ نظر آیا ہو؟" مجھے اس سے گفتگو کرنے میں مزا آ رہا تھا۔

"سوری سر! مجھے آپ کی سفارش پر جاب نہیں کرنا کسی کا حق مار کر۔۔۔۔ میں اس

پوسٹ کے لیے خود سلیکٹ ہوتا تو اور بات تھی۔"

اس کی اٹھی ہوئی ناک اسکی لمبی پلکوں والی آنکھیں، میں اسے دیکھتا چلا گیا۔

"تم یہاں میرے اخبار میں کیوں نہیں جاب کر لیتے؟"

"آپ کے اخبار میں؟" اس نے تنفر سے ہونٹ سکیڑے۔

"صبح نو۔۔۔۔ جیسے زرد صحافت کے علمبردار اخبار میں کام کرنے سے بہتر ہے کہ بھوکا مر جاؤں۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا؟"

"یہ بتانا ضروری تو نہیں؟"

وہ اٹھنے لگا تو میں نے اسے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

"جب تم پہلی بار آفس آئے تھے۔ اپنے دوست کے لیے فنڈ لینے تو تب تم نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"تب مجھے علم نہیں تھا۔ تب تک میں اس اخبار کو کچھ اور سمجھتا تھا عوام کا ہمدرد اور مددگار۔۔۔۔"

"اور پھر تمہارے دوست کے دادا نے تمہیں بتایا کہ۔۔۔۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"انہوں نے نہیں میں نے خود معلومات حاصل کیں اس لیے کہ آپ کا ایک بہت اچھا امیج بنا تھا میرے اندر، وہ امیج ٹوٹا تو میں ڈس ہارٹ ہوا، بہت دکھ ہوا مجھے، یقین نہیں آتا تھا کہ اتنا سخی اور مہربان شخص اس طرح کا ہو سکتا ہے۔"

اس کی آواز بھیگ رہی تھی اور میرا دل پگھل رہا تھا اس کے لہجے کے گداز پر۔

"اور جب میں نے کھوجا تو مجھے پتا چلتا گیا سب، حسین احمد صاحب کے متعلق اور آپ کے متعلق کہ آپ ان کے جانشین ہیں۔" اب پھر اس نے ہونٹوں کو تنفر سے سکیڑا تھا۔

"تم نے جرنلزم میں ماسٹر کیا تو یقیناً تمہیں اس شعبے میں دلچسپی ہوگی تو کسی اور اخبار میں کام کیوں نہیں کر لیتے جو تمہارے خیال میں زرد صحافت کا علمبردار نہ ہو۔"

وہ چند لمحے میرے چہرے پر نظریں جمائے رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"یہ جو صحافی ہیں نا۔۔۔۔ اور جو لکھنے والے، جن کا ادب وصحافت میں ایک نام بن چکا ہے ان کی اجارہ داری ہے ہر جگہ۔۔۔۔ یہ نئے مجھ جیسے نوآموز کو کہاں اپنے درمیان جگہ دیتے ہیں سر! اور آپ۔۔۔۔ حیرت ہے نہیں جانتے کہ جاب بھی کسی تگڑی سفارش سے ہی ملتی ہے آپ کی ذہانت ولیاقت دیکھ کر نہیں۔ خیر ہر جگہ ایک جیسا نہیں ہوتا کہیں خاص میرٹ پر بھی انتخاب ہوتا ہے کم ہوں گے ایسے لوگ مگر یہی ہوتا ہے۔"

"تو وہ تمہارے دوست کے دادا بھی تو ہیں نایاب لوگوں میں سے۔۔۔۔ ہاں تمہارے دوست کا کیا حال ہے؟"

"چلا گیا۔" اس کے تنے ہوئے چہرے پر نرمی اتر آئی تھی اور آنکھیں نم ہوگئیں۔

"وہ بہت ذہین بہت پیارا تھا لیکن موت اسے ہم سے چھین کر لے گئی۔"

"اور کیا تھا اگر اس کے دادا ابا میری مدد قبول کر لیتے میں تو اسے باہر تک بھیجنے کے لیے تیار تھا؟"

"اس نے تو چلے ہی جانا تھا سر! اتنی ہی زندگی تھی اس کی لیکن اگر انکل آپ کی مدد قبول کر لیتے تو ساری زندگی انہیں دکھ رہتا کہ انہوں نے آخری دنوں میں اس کے خون میں حرام کی۔۔۔۔" میرا رنگ شاید بدلا تھا۔

"سوری سر!" وہ کھڑا ہو گیا۔

"مجھے شاید اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا لیکن آپ نے خود۔۔۔۔"

"سنو! اگر تم چاہو تو میں تمہاری سفارش کر سکتا ہوں۔"

"پتا نہیں کیوں میں اسے زیر بار کرنا چاہتا تھا۔"

"تھینک یو سر! آپ نے خود ہی کہا ہے کہ کہیں میرٹ پر بھی انتخاب ہوتا ہے تو میں بھی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ چلا گیا تو میں نے اسی وقت کبیر کو فون کیا۔ کبیر جو میرے ساتھ والے آفس میں بیٹھتا تھا ہنی بابا کے زمانے سے ہی۔

"سنو کبیر! ابھی جو لڑکا میرے کمرے سے نکلا ہے اس کے متعلق مجھے پوری معلومات چاہئیں۔"

"او کے سر!"

کبیر تو یہی کام کرتا تھا بابا کے زمانے سے ہی میں نے بتایا تھا کہ یہ ایک ایسا نیٹ ورک تھا بابا کا تربیت دیا ہوا جس میں مجھے کبھی خود سے کچھ نہیں کرنا پڑا تھا سب کام ہوتے رہتے تھے مجھے صرف خبر ہوتی رہتی تھی اور میرے اکاؤنٹ میں اضافہ ہوتا رہتا تھا دوسرے ہی دن میرے سامنے ایک فائل پڑی تھی۔

"اسید عبدالرحمٰن والد عبدالرحمٰن محکمہ زراعت میں معمولی ملازم

رہائش: اندرون بھاٹی گیٹ

مکان کی حالت خستہ، فیملی میں ماں، باپ، دادا، دادی کے علاوہ تین چھوٹے بھائی جو زیر تعلیم ہیں خود اسید عبدالرحمٰن تین چار جگہ ٹیوشن پڑھاتا ہے اور کسی میگزین کے لیے انگریزی کہانیاں ترجمہ کرتا ہے جس کا معاوضہ اسے 25 روپے فی صفحہ ملتا ہے۔"

میں نے فائل بند کر دی وہ ضرورت مند تھا اسے جاب چاہیے تھی لیکن اس نے میری اخبار کی جاب ٹھکرا دی تھی حتیٰ کہ اس نے میاں صدیق کی کمپنی میں بھی جاب نہیں کی تھی کیونکہ میں نے اس کی سفارش کی تھی "کیا میں اتنا قابل نفرت تھا۔"

میں نے سوچا۔ "میرا ایک نام تھا، میں صوبائی اسمبلی کا رکن تھا، ایک بڑے اخبار کا مالک تھا، ایک بزنس مین تھا، ہر حلقے میں لوگ مجھے پہچانتے تھے، مجھے عورتوں سے دلچسپی نہیں تھی، میں لوگوں کی مدد کرتا تھا، کئی اداروں میں فنڈ دیتا تھا، جب زلزلہ آیا تو لاکھوں روپے میں نے زلزلہ زدگان کے لیے بھجوائے، میں نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا تھا، میں ہر سال ایدھی ہومز اور شوکت خانم میموریل رقم بھجواتا، پھر بھی میں قابل نفرت تھا اس اسید عبدالرحمٰن کے لیے جو دادی کی طرح سوکھی روٹی کھاتا تھا اور میں۔۔۔۔" میں نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچیں۔

"میں پوچھوں گا۔۔۔۔ پوچھوں گا۔۔۔۔ اس سے کہ کیوں آخر کیوں نفرت کرتا ہے وہ مجھ سے؟"

میں نے فائل سے اس کا ایڈریس دیکھا اور گاڑی کی جابی اٹھا کر باہر نکل گیا بہت دیر تک بے مقصد ادھر اُدھر چکرانے کے بعد میں بھاٹی گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اندر ایک تنگ گلی میں اس کا گھر تھا اور گلی کے شروع میں دودھ دہی والی دکان سے ایک بچہ میرے ساتھ اس کے گھر تک آیا تھا جسے دودھ والے نے بھیجا تھا کہ وہ مجھے عبدالرحمٰن بابو کا گھر دکھا دے۔

بچہ جا چکا تھا اور میں عبدالرحمٰن کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔

''آخر میں کیا کہوں گا؟''

لکڑی کے بوسیدہ دروازے کے سامنے کھڑے کھڑے میں نے سوچا اور مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں گا جب اس دروازے کے بالکل ساتھ والے دروازے سے پردہ اٹھا کر ایک شخص باہر نکلا۔

''اسلام علیکم جناب! کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''مجھے اسید سے اسید عبدالرحمٰن سے ملنا ہے۔'' میں گھبرا سا گیا تھا۔

اس شخص نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا شاید وہ میری حیثیت کا اندازہ لگا رہا تھا۔

''اسید تو گھر نہیں ہے ٹیوشن پڑھانے گیا ہے آپ آجائیں بیٹھیں ابھی آتا ہی ہو گا میں اس کا والد ہوں۔''

اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور میں اس کے پیچھے ہی چک اٹھا کر اسی کمرے میں داخل ہو گیا جس سے وہ نکلا تھا۔ غالباً یہ کمرہ اسی گھر کا تھا اور بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا، اندر چند کرسیاں اور ایک میز تھا، زمین دری بچھی ہوئی تھی، ایک طرف ایک چارپائی بچھی تھی۔ صاف ستھرا بستر اور چارپائی کے ساتھ بغیر طاق کی الماری میں کتابیں بچی تھیں۔ غالباً اسید یہاں ہی سوتا تھا۔

وہ معذرت کرتے ہوئے اندر کھلنے والے دروازے سے اندر چلے گئے اور پھر فوراً ہی واپس آگئے تھے۔

''جی جناب فرمایئے! کوئی کام تھا اسید سے؟'' وہ میرے سامنے بیٹھے سادگی

سے پوچھ رہے تھے۔

صاف ستھرا دھلا ہوا شلوار قمیض اگرچہ کافی پرانا تھا، سر پر جناح کیپ اور چہرے پر اطمینان و سکون۔

''دراصل میرے اخبار میں ایک اسامی خالی ہے اور آپ کا بیٹا ماشاء اللہ بہت ذہین ہے میں چاہ رہا تھا کہ وہ میرے اخبار میں کام کرے۔''

''آپ اخبار سے تعلق رکھتے ہیں؟'' عبدالرحمٰن نے اسے سادگی سے پوچھا۔

''کون سے اخبار میں؟''

''صبح نو سے۔۔۔۔۔''

میں نے نام بتا کر ان کا جائزہ لیا لیکن ان کے چہرے پر کوئی تاثرات نہ تھے۔

''سچی بات تو یہ ہے جناب! کہ میں اخبار کم کم ہی پڑھتا ہوں کبھی کبھار چھٹی والے دن سامنے دوائیوں کی دکان پر کچھ دیر بیٹھ جاؤں تو دیکھ لیتا ہوں البتہ اسید کو بہت چسکہ ہے پہلے تو کالج یونیورسٹی میں پڑھ لیتا تھا اب محلے میں ہی کسی نہ کسی دکان پر بیٹھ کر پڑھ لیتا ہے میں نے تو کہا ہے کہ جاب سے لگ جا تو اخبار لے لیا کرنا لیکن آج کل جاب بھی آسانی سے کہاں ملتی ہے؟''

''عبدالرحمٰن صاحب! آپ کا تنخواہ میں گزارا ہو جاتا ہے اچھی طرح سے؟''

''اللہ کا شکر ہے جناب! اسید بھی چھوٹی عمر سے ٹیوشن کر رہا ہے ماشاء اللہ بڑا ذہین اور لائق ہے اس کی ماں تو چاہتی تھی وہ ڈاکٹر یا انجینئر بنے لیکن اس کا رجحان ہی نہیں تھا میں نے کہا کہ جو مرضی کرلے۔''

وہ بے حد دھیمے لہجے میں اپنے اور اپنی فیملی کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور اسی دوران اندر سے چائے اور ایک پلیٹ میں بسکٹ آگئے اور جب میں چائے پی رہا تھا تب ہی اسید آگیا مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔

''آپ سر!''

''ہاں بیٹا! یہ کسی جاب کے سلسلے میں تم سے بات کرنے آئے ہیں تم بیٹھو ان سے بات کرو میں تو سبزی لینے جا رہا تھا کہ یہ مل گئے۔''

وہ اپنی پیالی رکھ کر کھڑے ہو گئے تھے اسید نے ان کے باہر نکلنے کا انتظار کیا تھا۔

''مجھے آپ کے یہاں آنے کا مقصد سمجھ نہیں آیا؟'' وہ مجھے گھور رہا تھا۔

''مقصد؟'' میں نے چائے کی چسکی لی۔

''میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ کو جاب کی ضرورت ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے اخبار میں جاب کریں۔''

''بہت خوب۔۔۔۔۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''تو آپ یہاں میری مجبوریوں کا سودا کرنے آئے ہیں لیکن سوری سر! میں۔۔۔''

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے میں تو سمپل تمہیں جاب کی آفر کر رہا ہوں۔''

''ابھی عارضی طور پر۔۔۔۔۔ پھر کیا کام لیں گے میرے قلم سے بلیک میلنگ کا۔۔۔۔لوگوں پر کیچڑ اچھالنے کا۔۔۔۔۔سوری، سر!

میں قلم سے کوئی غلط کام لینے کے بجائے توڑنا پسند کرتا ہوں۔ الحمدللہ گزارا ہو رہا ہے اور اگر کبھی نہ ہوا تو مجھے رزق حلال کے لیے مزدوری کرنے سے بھی گریز نہیں ہوگا۔''

اس کا گندمی رنگ سرخ ہو رہا تھا لیکن میں تو ایسا کچھ بھی کہنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا میں مسکرایا مجھے اس کی باتیں مزا دے رہی تھیں۔

'' تم اپنی مرضی سے جس شعبہ میں کام کرنا چاہو کر لو کالم نگاری، رپورٹنگ، کمپوزنگ، کرائم رپورٹنگ، میگزین سیکشن۔''

''لیکن کیوں؟ کیوں سر! مجھ سے آپ کی یہ مہربانی ہضم نہیں ہو رہی کیا لگتا ہوں میں آپ کا؟ کیا رشتہ ہے آپ کا مجھ سے؟ آپ کو کیوں مجھ سے ہمدردی کا بخار چڑھا ہے؟ کس لیے آپ مجھے اپنا احسان مند کرنا چاہتے ہیں؟''

''میں تمہیں احسان مند نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے پیالی ٹیبل پر رکھی۔

''اور یہ بھی سچ ہے کہ میری تم سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔''

پھر اس نے بھنویں اچکائیں۔ ''بتائیں منشیات کی سمگلنگ کروانی ہے، کہیں دھماکہ کروانا ہے کسی کا کاروبار تباہ کروانا ہے، کیا کام لینا چاہتے ہیں مجھ سے؟'' میں ہنس دیا

مجھے اس کی باتیں بری نہیں لگی تھیں وہ خاصا باخبر لگتا تھا۔

''تم ایک اچھے صحافی بن سکتے ہو۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''اور یہ یقین رکھو مجھے تم سے کوئی غلط کام نہیں لینا تم اگر ایسا محسوس کرو تو میری جاب چھوڑ دینا۔''

پتا نہیں کیوں میں چاہتا تھا وہ میرے پاس جاب کر لے میرے سامنے رہے شاید وہ نایاب جیسا تھا اس لیے۔

''میں سب سمجھتا ہوں سر! مجھے معاف کیجیے میں آپ کے مطلب کا بندہ نہیں ہوں۔''

میں جانتا تھا میں پہلی بار ہی جان گیا تھا کہ وہ کس طرح کا بندہ ہے جب اس نے چیک واپس میری ٹیبل پر رکھا تھا وہ چاہتا تو خود بھی استعمال کر سکتا تھا مجھے کس نے بتانا تھا کہ وہ رقم اس کے بیمار دوست کے علاج پر خرچ نہیں ہوئی یا اس نے خود رکھ لی ہے۔''

''او کے پھر سوچنا۔''

میں جانتا تھا اس نے حتمی بات کی ہے اسکے متعلق کبھی بھی نہیں سوچے گا پھر بھی میں نے ایسا کہا اور پھر بھی میں نے اس کا انتظار کیا حالانکہ میں جانتا تھا وہ کبھی نہیں آئے گا پھر بھی میں نے کبیر صاحب سے مرتضیٰ صاحب سے امداد علی سے سب سے کہہ دیا تھا اگر وہ آئے، اسید عبدالرحمٰن تو میں جہاں کہیں بھی ہوں مجھے فون کر کے بلا لیں لیکن وہ نہیں آیا شاید کبھی میں وہ آ جائے گا اس کے لیے میری اپنائیت خود مجھے حیران کرتی تھی میں تو ایک بڑا پریکٹیکل سا آدمی تھا میری زندگی خوابوں سے خالی تھی۔

بس وہ ایک خواب دیکھا تھا۔

''فاطمہ افتخار کی ہمراہی کا خواب''

اور اب خوابوں سے ڈر لگنے لگا تھا مجھے پھر یہ اسید عبدالرحمٰن۔۔۔۔ ایک دن ویگن اور ٹرک کے حادثے میں ہمارا کیمرہ مین زخمی ہو گیا تو میں اسے دیکھنے کے لیے ہاسپٹل گیا اور پورے دو ماہ بعد میں نے اسے وہاں دیکھا اس کے والد بھی اس حادثے کا شکار ہو جانے والی ویگن میں سوار تھے۔

"خیریت ۔۔۔۔تم یہاں کیسے؟" میں نے اس کی کندھے پر ہاتھ رکھا تو لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔

"میرے ابا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔" اس کا لہجہ نارمل تھا۔

"اور آپ؟"

"میرا کیمرہ مین زخمی ہے اسے دیکھنے کے لیے آیا ہوں۔" وہ سر ہلاتا ہوا اپنے باپ کے بیڈ کی طرف بڑھ گیا ہمارے کیمرہ مین یوسف کا بیڈ اس کے بیڈ کے ساتھ ہی تھا اس وارڈ میں حادثے کے زخمیوں کے علاوہ اور بھی مریض تھے میں جتنی دیر وہاں بیٹھا میری نظریں بار بار اس پر اٹھتی رہیں وہ بہت بے چین تھا کبھی جھک کر ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتا کبھی نبض ٹٹولتا وہ یقیناً ایک محبت کرنے والا بیٹا تھا اور اسے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

میں آج کیمرہ مین کی مزاج پرسی کے لیے آیا تھا یہ میرا فرض تھا کہ میں اپنے کارکنوں کے دکھ درد میں شریک ہوں بابا بھی ایسا ہی کرتے تھے لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ میں ہر روز ہاسپٹل کے چکر لگاؤں لیکن میں ہر روز ہاسپٹل جانے لگا۔ کبھی پھل لے کے جاتا، کبھی پھول، کبھی کچھ سنیکس وغیرہ۔ کیمرہ مین یوسف بہت ممنون ہوتا میرا جی تو چاہتا تھا کہ کبھی میں عبدالرحمٰن صاحب کے لیے بھی کچھ لے جاؤں لیکن مجھے ڈر لگتا تھا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ اسید عبدالرحمٰن انہیں اٹھا کر ہاسپٹل سے باہر پھینک دے گا۔ اس روز کے بعد میں نے اسے مخاطب نہیں کیا لیکن یوسف کے بیڈ کے پاس سٹول پر بیٹھے بیٹھے میں اسے دیکھتا ضرور تھا، کبھی کبھی مجھے اس کی آنکھوں میں اچنبھا سا نظر آجاتا۔ ملاقات کے وقت عبدالرحمٰن صاحب کے پاس بھی کوئی نہ کوئی آیا ہوا ہوتا تھا۔ ایک روز ایک بزرگ خاتون کو میں نے ان کے بیڈ کے پاس بیٹھے دیکھا وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں یوسف سے مجھے پتا چلا تھا کہ نہ صرف یہ کہ ان کے سٹچز میں انفیکشن ہوگئی ہے بلکہ بازو کا بھی دوبارہ آپریشن ہوگا اور پلیٹیں پڑیں گی۔ آپریشن ڈاکٹر علی حیدر کریں گے کیونکہ مسئلہ کچھ بگڑا ہوا تھا اور ڈاکٹر پروفیسر حیدر علی کی فیس ایک سوالیہ نشان میرے دل میں ابھرا اور میں نے یوسف سے پوچھا۔

"کیا علی حیدر میاں فری آپریشن کرتے ہیں؟"

"نہیں، میرا خیال آپریشن کی فیس تو ہوگی اور پلیٹوں کا خرچہ بھی، دوائیاں بھی، یہ لوگ کافی پریشان ہیں۔"

تب ہی مجھے اسید نظر آگیا اس کے ہاتھ میں دوائیوں کا پیکٹ تھا وہ دوائیاں ٹیبل پر رکھ کر جھک کر عبدالرحمٰن سے کچھ کہنے لگا تو میں نے اس کے قریب جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیسے ہیں تمہارے والد اور کب تک ڈسچارج ہو جائیں گے؟"

"کچھ پرابلم ہے اس لیے ابھی نہیں۔" اس نے تفصیل بتانے سے گریز کیا۔

"یہ میری دادی جان ہیں۔"

"اسلام علیکم!"

عبدالرحمٰن صاحب سے ہاتھ ملا کر ذرا جھک کر سلام کیا۔ سفید دوپٹے کو اچھی طرح لپیٹے ہوئے سفید بالوں والی وہ خاتون مجھے اپنی دادی کی طرح ہی لگی تھی۔

"اسید اگر تم اجازت دو تو میں کچھ دیر تمہاری دادی جان سے بات کرلوں انہیں دیکھ کر مجھے اپنی دادی یاد آگئی ہیں میں جب نو دس برس کا تھا تو وہ فوت ہوگئی تھیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن اس کے چہرے پر الجھن تھی پھر وہ غالباً ڈاکٹر کی طرف چلا گیا تھا کیونکہ دوائیوں کا وہ پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"بے چارہ ہر طرف بھاگتا پھر رہا ہے سمجھ میں نہیں آرہا کہ ڈاکٹروں نے پہلے کیسے پلاسٹر لگا دیا اب کہتے ہیں دوبارہ پلیٹیں پڑیں گی اور پتا نہیں کیا کیا۔۔۔۔؟"

دادی کہہ رہی تھیں وہ کتنی پریشان ہو رہی تھیں۔

"اور اگر میں کبھی بیمار ہوگیا تو میرا کون ہیں؟ جو پریشان ہوگا کون دعائیں کرے گا۔" میرا دل یکدم اداس ہوگیا تو میں نے ان سے کہا۔

"ماں جی! میرے لیے بھی دعا کیجیے گا۔"

"اللہ تمہیں زندگی اور خوشی دے، خدا ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ خیریت تو ہے نا یہاں کون ہے بیمار تمہارا؟"

"میرا اپنا تو کوئی نہیں ماں جی! بس ایک ملازم ہے اسی ویگن میں تھا جس میں

عبدالرحمٰن صاحب تھے آج ڈسچارج ہو جائے گا۔"

مجھے ان سے دعا لینا اچھا لگا تھا تب ہی اسید واپس آ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ انہوں نے درد کے انجکشن لگانے ہیں میں نیچے سے لے کر آتا ہوں۔"

اس نے عبدالرحمٰن صاحب کو بتایا تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"جیتے رہو بیٹا!"

دادی جان نے پھر دعا دی۔ یوسف کے بھائی اسے لینے آئے ہوئے تھے میں یوسف کو خدا حافظ کہہ کر جب ہاسپٹل سے نکل رہا تھا تو مجھے اسید نظر آ گیا وہ انجکشن لے کر اوپر وارڈ میں جا رہا تھا۔

"سنو اسید! اگر کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو۔۔۔؟"

"نہیں تھینک یو سر!" اس نے بے حد روکھے انداز میں کہا۔

"آپ کا مریض تو فارغ ہو گیا ہے ویسے کیا آپ اپنے ہر ملازم کا اس طرح خیال رکھتے ہیں اور ہر روز اس کی مزاج پرسی کے لیے چکر لگاتے ہیں؟"

"نہیں۔" میں اس کے انداز پر مسکرایا۔

"اتفاق سے یوسف سے پہلے کبھی کوئی ملازم اس طرح ہاسپٹل میں ایڈمٹ نہیں ہوا، اسید! تم مجھ سے اتنے نالاں کیوں رہتے ہو؟ میرے خیال میں تمہارے ساتھ میں نے کوئی زیادتی نہیں کی، تمہارا کوئی حق نہیں مارا۔" پھر میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"تمہاری دادی سے میں کسی مقصد کے تحت بات کرنے کے لیے نہیں رکا تھا بلکہ اسید عبدالرحمٰن! انہیں دیکھ کر واقعی مجھے اپنی دادی یاد آ گئی تھیں۔ میری دادی جنہوں نے عمر بھر رزق حلال کھایا اور جب انہیں شک ہوا کہ ان کے بیٹے کی کمائی میں حرام کی ملاوٹ ہو رہی ہے تو انہوں نے اپنا کھانا الگ کر لیا۔ گھر میں مرغ پکے یا بریانی وہ اپنی سادی روٹی پر اچار کی پھانک رکھ کر یا ابلا ہوا آلو رکھ کر نمک مرچ چھڑک کر کھا لیتی تھیں ایک اپنے اکیلے کے لیے سالن بنانے کا تردد کم ہی کرتی تھیں۔"

وہ چپ چاپ مجھے دیکھ رہا تھا ایک بار پہلے میں نے فاطمہ کو دادی کا بتا کر متاثر کیا

تھا اور آج میں اسید کو دادی کا بتا کر شاید غیر ارادی طور پر متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا نہیں لیکن اس کی خوبصورت آنکھوں میں تاسف کا تاثر بہت گہرا تھا۔

"حیرت ہے سر! ایسی دادی کی آغوش میں پرورش پانے کے باوجود آپ اس دلدل میں کیسے اتر گئے؟"

وہ صحیح ہی تو کہہ رہا تھا دلدل ہی تو تھی یہ، وہ اپنی بات کہہ کر رکا نہیں تھا۔ تیز تیز قدموں سے وارڈ کی طرف بڑھ گیا تھا اور میں نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے علی حیدر کو فون کیا تھا کہ وہ عبدالرحمٰن صاحب کا خاص خیال رکھے اور یہ کہ آپریشن فیس اور دوسرے اخراجات ان سے نہ لیے جائیں لیکن اس طرح کہ انہیں معلوم نہ ہو کہ کسی کے کہنے پر آپ یہ کر رہے ہیں بس یہ کہہ دیجئے کہ ہاسپٹل کی طرف سے ہے۔

"کون ہیں یہ صاحب؟"

"میرے عزیز ہیں لیکن بہت خوددار، میں نہیں چاہتا کہ ان کی عزت نفس مجروح ہو، بل مجھے بھجوا دیجیے گا۔"

ڈاکٹر علی حیدر سے پرانی جان پہچان تھی اور تقریباً پندرہ روز بعد وہ پھر میرے سامنے تھا۔

"سر! یہ۔۔۔" بغیر تمہید کے اس نے جیب سے کچھ رقم نکال کر ٹیبل پر رکھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ ابا کے آپریشن کی فیس ہے پندرہ ہزار روپے ہیں آپ بل مجھے دے دیں باقی رقم بھی میں ادا کر دوں گا۔"

"لیکن یہ تم مجھے کیوں دے رہے ہو؟"

"پلیز ایکٹنگ مت کریں ڈاکٹر نے ہم سے فیس نہیں لی اور میں جانتا ہوں کہ آپ نے۔۔۔"

"میں نے۔۔۔"

"پلیز کچھ مت کہیں میں نے خود دیکھا تھا ایک روز میو ہاسپٹل میں آپ کو ڈاکٹر علی حیدر کے ساتھ۔"

"اوہ" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"ٹھیک ہے میں نے ان سے صرف اتنا کہا تھا کہ ان صاحب کا خیال رکھنا اپنے آدمی ہیں تم جانتے ہو کہ جب تک ڈاکٹر سے تھوڑی بہت جان پہچان نہ ہو وہ مریض کا دھیان نہیں رکھتے اور اسی خیال سے کہہ دیا تھا بہر حال اگر انہوں نے میری وجہ سے فیس نہیں لی تو میں انہیں فون کرتا ہوں کہ وہ تم سے آپریشن فیس اور دوسرے اخراجات لے لیں۔"

اب وہ متذبذب سا مجھے دیکھ رہا تھا۔

"پلیز۔۔۔۔یہ رقم اٹھا لو اور ڈاکٹر صاحب کو خود دے دو اور یقین کرو میں نے انہیں ایسا کرنے کو نہیں کہا۔"

وہ کچھ دیر یونہی متذبذب سا مجھے دیکھتا رہا اور پھر رقم اٹھا لی اور اس کے باہر نکلتے ہی میں نے علی حیدر کو فون کیا۔

"یار! تمہارا مریض تو فارغ ہو گیا ہے اور بل میں تمہیں بھجوا رہا ہوں۔"

میرا فون اٹینڈ کرتے ہی اس نے کہا۔ وہ ہمیشہ بہت مصروف رہتا تھا اور اکثر تو فون آف ہی رکھتا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم ایسا کرو وہ لڑکا آئے گا اسید اس پیشنٹ کا بیٹا ہے اسے تم سولہ سترہ ہزار کا خرچ بتا دینا فی الحال اس کے پاس پندرہ ہزار ہیں وہ لے کر میرے بل سے نکال دو۔"

"اس کے پاس پندرہ ہزار ہیں تو پھر اسے پندرہ ہی بتا دوں ویسے بل تقریباً تیس ہزار ہے۔ نہیں یار! کچھ کم یا زیادہ کر کے بتانا ورنہ اسے شک پڑ جائے گا کہ میں نے تمہیں کہا تھا میں نہیں چاہتا کہ اس کی خودداری مجروح ہو۔"

"کم کیا، زیادہ ہی بتاؤں گا آخر ڈاکٹر ہوں اور مجھے خدمت خلق کا بھی دعویٰ نہیں۔" اس نے قہقہہ لگایا وہ ایسا ہی تھا۔

"اور مجھے ایسے احمق نوجوان کی اس خودداری پر ہنسی آتی ہے۔۔۔۔ بہرحال تمہارا عزیز ہے ورنہ میں اسے اس نام ونہاد خودداری پر لیکچر ضرور دیتا۔"

"کاش وہ میرا عزیز ہوتا میرا اپنا ہوتا۔۔۔۔"

پتا نہیں کیوں دل کی زمین پر اس خواہش کی کونپل پھوٹی اور۔۔۔۔اور میں حیران رہ گیا۔ کیا تھا اس جیسے نا جانے کتنے لڑکے ہوں گے اس میرے ملک پاکستان میں۔ جو خودداری سے سربلند کیے جی رہے ہوں گے۔۔۔۔ پھر میں اسلام آباد چلا گیا تین دنوں کے لیے واپس آیا تو صابر نے بتایا۔

"وہ لڑکا آیا تھا اسید عبدالرحمٰن، میں نے اسے آج آنے کے لیے کہا ہے۔"

اور وہ واقعی آ گیا۔ آج اس کے چہرے پر تناؤ نہیں تھا آنکھوں میں ایک نرم نرم سا تاثر تھا۔

"اب کیا غلطی سرزد ہو گئی مجھ سے؟" میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خوش دلی سے پوچھا۔

"سوری سر! میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں ڈاکٹر علی حیدر نے آپ کی وجہ سے ابا کا بہت خیال رکھا۔ خصوصاً انہوں نے آپ کی ہی وجہ سے فیس نہیں لی تھی بہر حال اٹھارہ ہزار کا بل بنا تھا پندرہ ہزار دے دیے ہیں دو تین دنوں تک باقی رقم دے دوں گا۔"

"وہ اچھے آدمی ہیں نہ بھی دو تو کوئی فرق نہیں پڑتا انہیں۔"

"خیر ایسی بات نہیں ہے۔" وہ مسکرایا۔

"میں ان کی شہرت جانتا ہوں وہ تو مردے سے بھی اپنی فیس وصول کر لیتے ہیں۔"

"اور اسی سے مجھے شک پڑا تھا کہ آپ نے کچھ کہا ہوگا جب انہوں نے کہا کہ انہوں نے فری آپریشن کیا ہے ان کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ قبر۔۔۔۔" وہ رکا۔

"ویسے وہ ڈاکٹر اچھے ہیں بہت۔۔۔۔" میں بھی مسکرایا۔

"چائے یا ٹھنڈا۔۔۔" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں سر! میں آفس جا رہا تھا سوچا آپ کا شکریہ ادا کر دوں۔"

"کیا جاب مل گئی؟ کہاں؟"

"فی الحال تو ابا ہی کے محکمے میں کمپوٹر آپریٹر کی۔"

"وش یو گڈ لک۔۔۔۔ کیسے ہیں تمہارے والد؟" وہ اٹھا تو میں نے پوچھا۔

"اچھے ہیں بہت بہتر ہیں پلاسٹر تو بیس دن بعد کھلے گا خدا کرے بازو صحیح ہو جائے۔"

"آمین!"

"اسید! کیا میں تمہارے گھر تمہارے والد کی مزاج پرسی اور دادی سے ملنے آسکتا ہوں؟" وہ ٹھٹکا اور پھر سر ہلا کر باہر چلا گیا۔

اور پھر میں ایک بار نہیں کئی بار ان کے گھر گیا۔

کبھی وہ گھر پر ہوتا کبھی نہیں دراصل اس نے پارٹ ٹائم جاب بھی کر لی تھی ملکی حالات پر اس کے آرٹیکلز نے مجھے متاثر کیا تھا اس روز میں آفس سے اٹھ کر اس کے گھر چلا گیا تھا وہ ابھی تک نہیں آیا تھا میں کچھ دیر اس کے والد کے پاس بیٹھ کر اٹھ آیا دو دن بعد اس کا پلاسٹر کھلنے والا تھا میں گاڑی ان کے گھر سے کافی دور ایک کھلی گلی میں پارک کرتا تھا میں گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ وہ مجھے سامنے سے آتا نظر آگیا میں رک گیا۔

"اسلام علیکم سر!" وہ میرے پاس آکر ٹھہر گیا۔

"وعلیکم السلام کیسے ہو؟"

"فائن سر!"

"آپ ہمارے گھر گئے تھے؟" وہ بے حد سنجیدہ سا تھا میں نے سر ہلا دیا۔

"لیکن کیوں سر! مجھے آپ کی یہ مہربانیاں سمجھ نہیں آرہی ہیں۔"

"لیکن میں نے تو کوئی مہربانی نہیں کی کبھی دس روپے کا جوس کا پیکٹ تک لے کر نہیں گیا کہ کہیں تم دھکا دے کا مجھے گھر سے باہر نہ نکال دو۔"

"لیکن سر! آپ کا اس طرح آنا"

وہ یکا یک بہت بے چین اور مضطرب نظر آنے لگا تھا میں گاڑی کے دروازے پر ہاتھ دھرے اسے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن سر! یہ مناسب نہیں ہے اس طرح میں زیر بار ہوتا جارہا ہوں۔"

"مگر کیسے۔۔۔۔ میں تو۔۔۔۔"

"پلیز سر!" اس نے مجھے ٹوک دیا۔

"زیر بار صرف روپے پیسے سے تو نہیں ہوا جاتا۔ آدمی اپنے اخلاق سے اپنی محبت و خلوص سے بھی زیر بار کر دیتا ہے دوسرے کو۔۔۔۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر نظریں جھکائے بول رہا تھا۔

"سر! میں نہیں جانتا آپ کا کیا مقصد ہے آپ مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں میں سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر آپ کا کوئی مقصد نہیں بھی تو پلیز میرے راستے میں نہ آئیں۔ میرے راستے کھوٹے نہ کریں مجھے مت بھٹکائیں۔ کہیں میں اتنا زیر بار نہ ہو جاؤں کہ آپ کے سامنے جھک جاؤں میں بہت کمزور انسان ہوں سر!"

"او کے۔"

میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے گاڑی کے دروازے سے ہاتھ ہٹایا۔

"آئندہ تم مجھے نہیں دیکھو گے اور تم کمزور انسان نہیں ہو۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے لگا تھا میں مسکرا نہیں سکوں گا۔

"اور شاید میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ کوئی مقصد نہیں ہے اور نہ ہی مجھے تم سے کوئی کام لینا ہے میں خود نہیں جانتا میں تمہاری طرف کیوں لپکتا ہوں شاید اس لیے کہ میرے اکلوتے بھائی سے بہت مشابہ ہو۔ وہ میڈیکل کے دوسرے سال میں تھا جب ہارٹ اٹیک نے اس کی جان لے لی، میں ہمیشہ ایسے ہی رہتا اور اپنے قلم کی حرمت بھی نہ بیچتا۔"

میں گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

"سر!" وہ بے اختیار ہی کھڑکی پر جھکا۔

"سوری سر! لیکن مجھے ڈر لگنے لگا تھا آپ سے۔۔۔ خود سے۔۔۔۔"

میں نے سر ہلایا۔

وہ ابھی تک جھکا مجھے دیکھ رہا تھا۔

"آپ اس دلدل سے نکل کیوں نہیں جاتے آپ کے اندر کہیں کوئی بہت اچھا انسان چھپا ہوا ہے لیکن انسان کوشش کرے۔ پلیز یہ سب چھوڑ دیں۔ نکل جائیں اس جال سے۔۔۔۔"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک دلگداز سی کیفیت تھی۔

''سر! چند دن قبل کسی نے تبصرہ کیا تھا کہ میری تحریروں میں آفتاب حسین جیسی تحریروں کی کاٹ ہے تو میں نے لائبریری سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر آپ کی تحریریں پڑھیں۔ آپ کے کالم آرٹیکل حتیٰ کہ آپ کی کہانیاں بھی جس شخص کے ہاتھ میں ایسا قلم ہو وہ مجھے یقین نہیں آتا۔۔۔ سر! آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔'' اب وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اس لیے کہ مجھے قلم کی بے حرمتی مقصود نہ تھی کیا ایسے ہاتھوں میں قلم ہونا چاہیے تھا؟''

اس کی آنکھوں کی حیرت بہت واضح تھی لیکن میں اس کی آنکھوں میں حیرت چھوڑ کر تیزی سے گاڑی نکال لے گیا۔

اور پھر اگلے کئی دن تک میں بہت مضطرب رہا۔ میرے کانوں میں اس کی آواز رہ رہ کر آتی۔

''سر! آپ اس دلدل سے نکل کیوں نہیں جاتے۔'' یوں لگتا تھا جیسے یہ ایک جملہ میری ساعتوں میں Save ہو گیا ہو اور بار بار ریوائز ہو رہا ہو۔

''کیسے؟۔۔۔ کیسے۔۔۔؟ اسید عبدالرحمٰن یہ بھی تو بتایا ہوتا۔۔۔'' میں ٹہلتے ٹہلتے سوچتے سوچتے تھک جاتا تو مٹھیوں میں بال جکڑ لیتا۔

اتنے سالوں سے میں ایک ہی ڈگر پر چل رہا تھا جیسے چابی والے کھلونے میں چابی بھر جائے تو وہ چلتا رہتا ہے یا پھر کوئی روبوٹ، میں نے کبھی اس دلدل سے باہر نکلنے کا نہیں سوچا تھا حالانکہ میں تو نفرت کرتا تھا جھوٹ سے فریب سے، بلیک میلنگ سے کرپشن سے اور فاطمہ کے ساتھ مل کر ان سب کے خلاف جہاد کرنا چاہتا تھا۔

میں جو کچھ کر رہا تھا بابا نے مجھے کبھی منع نہیں کیا اور نہ ہی کبھی اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا پھر کیوں؟ لوگ تو تجربے سے کندن بن جاتے ہیں۔

لیکن اب۔۔۔ اب کیسے۔۔۔؟ مجھے لگا جیسے میں گردن گردن تک اس دلدل میں دھنسا ہوا ہوں اور خود اس دلدل سے نہیں نکل سکتا۔ کاش وہ بہت دیر پہلے میری زندگی میں آجاتا۔

شکل و صورت میں نایاب حسین جیسا

سچا کھرا اور بے باک

میں بہت سارے دن دفتر نہیں گیا۔ میں نے سب فون آف کر دیئے تھے۔ مجھے اس دلدل سے نکلنا ہے لیکن کیسے؟ کس طرح میرا سارا کام لو اور دو کے اصولوں پر چل رہا تھا وہ جو مجھے دیتے تھے مجھ سے کام بھی تو لیتے تھے کتنے صوبائی وزیر، بیوروکریٹس، بزنس مین۔ ابھی اگر کسی وزیر کا فون آجائے تو مجھے اس کا کام کرنا ہی پڑے گا ہر صورت میں۔

اف۔۔۔ کیا کروں؟ اسید عبدالرحمٰن نے مجھے کس مشکل میں ڈال دیا ہے اور کیا ضروری ہے کہ میں اس کی بات مانوں، کون ہے وہ میرا؟ میں خود ہی سوال و جواب کرتا رہا اور اس کشمکش نے میرا نروس بریک ڈاؤن کر ڈالا۔

معمولی اٹیک تھا تاہم ڈاکٹر نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں ذہن پر زیادہ برڈن نہ ڈالوں۔ آئندہ اٹیک شدید بھی ہو سکتا ہے۔ چار دن ہاسپٹل میں رہ کر میں گھر آیا تو کبیر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کچھ دنوں کے لیے کسی دوسرے ملک گھوم پھر آؤں اس طرح ڈپریشن سے نکل آؤں گا جس کی وجہ سے بات نروس بریک ڈاؤن تک پہنچ گئی تھی۔ مجھے کبیر کی بات پسند آئی تھی اور یوں میں جب دو ماہ کی آوارہ گردی کے بعد واپس آیا تو پہلے سے بہت بہتر تھا تاہم میں مسلسل اس دلدل سے نکلنے کا سوچتا رہتا تھا۔

اس دوران اسید عبدالرحمٰن کی کئی تحریریں میری نظر سے گزری تھیں وہ بالکل میرے انداز میں معاشرے کے ناسوروں پر لکھ رہا تھا وہی موضوعات کا انتخاب۔

اغوا برائے تاوان

بم دھماکے

این جی اوز

لینڈ مافیا

بچوں کی اسمگلنگ

منشیات

وہ انہی موضوعات کا انتخاب کر رہا تھا جن سے ملتے جلتے موضوعات پر میں لکھ چکا

تھا۔

''یہ اسید عبدالرحمٰن بہت تیز جارہا ہے۔'' ان نو بڑے افراد کے ساتھ میٹنگ میں ایک بار جلیل نے کہا جو ان سب کو ہینڈل کرتا تھا۔

''اس کا بندوبست کریں بگ باس!''

''کیوں کیا یہ ہمارے متعلق لکھ رہا ہے کچھ؟''

''منشیات کی اسمگلنگ بھی اس کا موضوع ہوسکتی ہے لیکن ہم تو اس میں کبھی ملوث نہیں رہے۔'' جلیل نے سب کی طرف دیکھا اور کھنگارا۔

''سر! وہ دراصل تھوڑی بہت منشیات۔۔۔۔۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''دراصل اب ملک میں ہر چیز مل رہی ہے تو گھڑیاں، کپڑے اس طرح کی چیزیں کوئی فائدے نہیں دیتیں اس لیے۔۔۔۔۔''

''کب سے کر رہے ہو تم یہ سب۔۔۔۔۔؟''

میری آواز پست ہوگئی تھی میں بگ باس تھا لیکن یہ سب مل کر ایک تھے مجھ سے زیادہ پاورفل۔۔۔۔سارے فیصلے تو جلیل ہی کرتا تھا۔

''دو سال سے۔۔۔۔۔'' جلیل نے بتایا۔

''تو اب کیا اسید ہم تک پہنچ گیا ہے؟''

''نہیں سر! ہم پیسے سے اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنا کام ختم کردے ہم تک پہنچنے سے پہلے۔۔۔۔۔''

''لیکن ہر شخص خریدا نہیں جاسکتا۔۔۔۔''

''مگر ہر شخص کی ایک قیمت ہوتی ہے کہیں نا کہیں کسی نہ کسی مقام پر وہ کمزور ہوجاتا ہے۔''

''او کے۔۔۔۔''

شاید میں اس کو آزمانا چاہتا تھا اور مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی جلیل نے مجھے بتایا تھا کہ بڑی سے بڑی رقم کی آفر بھی اس نے ٹھکرادی۔

میرا دل چاہا تھا کہ میں خوشی سے ناچنے لگوں

''ہوتے ہیں کچھ ایسے ڈھیٹ بھی۔۔۔۔۔'' جلیل نے بات جاری رکھی تھی۔

''لیکن ایسے لوگوں کا علاج بھی ہے میں نے لڑکوں سے کہا تھا اس کی کسی بہن کو اغوا کرلو مگر پتا چلا کہ اس کی کوئی بہن نہیں ہے بہرحال۔۔۔۔''

''میں خود دیکھ لوں گا اسے، فی الحال اسے چھوڑ دو اپنے حال پر۔''

''لیکن سر! کل کے اخبار میں اس نے سیٹھ عثمان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بچوں کی اسمگلنگ میں ملوث ہے، وہ لڑکا ڈرتا نہیں ہے بالکل، جب اس نے منشیات پر لکھنا شروع کیا تو ہم تک پہنچے گا ضرور، اس لیے پہلے ہی اس کا خاتمہ ہوجانا چاہیے۔''

جلیل کھڑا ہوگیا تھا اور میرا دل بس میرے سینے میں لرز اٹھا تھا۔

''نہیں۔۔۔۔نہیں اسے تو زندہ رہنا چاہیے۔۔۔۔نایاب کی طرح نہیں۔''

''سر! آپ کے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ ہے میں جانتا ہوں آپ اس سے ملتے رہتے ہیں۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں مطمئن رہو میں دیکھ لوں گا خود۔۔۔۔۔''

''او۔کے، سر!''

جلیل مطمئن نظر آنے لگا لیکن میرا اطمینان تو رخصت ہوگیا تھا یہ لوگ خاصے باخبر تھے میں یہاں بگ باس تھا اس شہر میں، لیکن مجھ سے اوپر بھی کچھ لوگ تھے مجھ سے بڑے۔۔۔۔

''نہیں اسید عبدالرحمٰن کو زندہ رہنا چاہیے ایسے روشنی کے مینارے بجھ جائیں تو زندگی بھی مرجاتی ہے۔'' وہ پوری رات میں نے تقریباً جاگ کر گزاری تھی لیکن کوئی حل سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''کیا کروں اس کی منت کروں، ہاتھ جوڑوں اسکے آگے کہ وہ اپنے والدین کے لیے، اپنے بھائیوں کے لیے اور میرے لیے چھوڑ دے۔ یہ سب اس کا کام نہیں ہے حکومت جانے اور پولیس۔۔۔۔۔''

''اس کی زندگی بہت قیمتی ہے اسے زندہ رہنا چاہیے۔''

"لیکن پتا نہیں وہ مانے گا بھی یا نہیں۔"

میں بے حد تھکا ہوا تھا لیکن کبیر نے کہا میں تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی دفتر آؤں اور ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ فون کی بیل ہوئی۔

"سر! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میرے راستے کھوٹے نہ کریں۔" دوسری طرف اسید تھا۔

"لیکن میں تو تمہارے راستے سے ہٹ آیا ہوں۔"

"لیکن میرے راستے تو کھوٹے کر دیئے نا آپ نے؟" وہ بے بسی سے بولا تھا۔

"میں نے کیسے۔۔۔؟"

"کیا کروں میں؟ کتنا زیر بار کر دیا تھا آپ نے مجھے؟"

"میرے خیال میں تو میں نے تمہیں زیر بار نہیں کیا اسید! تم جو چاہو کرلو جو تمہارا ضمیر کہتا ہے وہ کرو۔"

"میں کیا کروں آفتاب صاحب! میری تحقیقات کے سرے آپ سے مل رہے ہیں اور میں بے بس ہوا جاتا ہوں۔"

"دیکھو مائی سن! تم بھول جاؤ کہ میں تم سے کبھی ملا تھا۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا نا آپ اس دلدل سے نکل جائیں آپ اس قبیل کے آدمی نہیں ہیں اور میں تو سمجھتا تھا صرف۔۔۔۔" وہ قدرے توقف سے بات ادھوری چھوڑ کر بولا۔

"لیکن یہ اسمگلنگ، یہ بگ باس؟" وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

"دل چاہتا ہے اپنا قلم توڑ دوں۔"

"نہیں قلم مت توڑنا تم جیسے بے باک لوگوں کی ضرورت ہے اس ملک کو، اس قوم کو، یہاں زیادہ ہاتھ جو قلم تھامے ہوئے ہیں بکنے والے ہیں یا حالات کا رنگ دیکھ کر وفاداریاں بدل دیتے ہیں۔ تم ایسے مت کرنا، ایک سچا لکھنے والا صحافی وہ ہوتا ہے جس کا قلم سچ لکھنے سے ڈرتا نہیں چاہے اس سچ کی زد اس کے اپنے ہی کیوں نہ آ رہے ہوں اور میں تو تمہارا اپنا ہوں بھی نہیں۔"

"سر! آپ نے ہمیشہ مجھے حیران کیا تھا مجھے دکھ ہوگا بہت لیکن میں وہی کروں گا جو میرا ضمیر کہتا ہے تھینک یو سر!" اس نے فون بند کر دیا۔

میں جانتا تھا کہ وہ وہی کرے گا۔ میرے پاس اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا شاید اس دلدل سے نکلنے کا۔ میں آفس سے اٹھا تھا مجھے کچھ ضروری کام کرنے تھے، میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں سب کچھ رفاعی اداروں کو ڈونیٹ کر دوں گا۔ پراپرٹی، بینک میں موجود رقم اور خود سزا کے لیے تیار رہوں گا۔

لیکن آفس سے نکلتے ہی ایک تیز رفتار ٹرک نے میری گاڑی کو اس طرح ٹکر ماری کہ گاڑی مکمل طور پر تباہ ہو گئی لیکن میں زیادہ زخمی نہ ہوا تھا۔ بازو کا معمولی سا آپریشن کر کے انہوں نے اندر گھسے شیشے کے ٹکڑے نکالے تھے۔ خون بھی زیادہ بہہ گیا تھا خون بھی لگایا گیا تھا اور گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ مجھے اب تک ڈسچارج ہو جانا چاہیے تھا لیکن مسلسل ٹیسٹ ہو رہے تھے، پتا نہیں کیوں مجھے لگا تھا جیسے کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ جلیل بھی دوبار ہاسپٹل آ چکا تھا بلکہ اس نے میری رائے بھی لی تھی کہ میری عدم موجودگی میں وہ تنظیم کی سربراہی صفدر علوی کو منتقل کر دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ تھا میں تو خود بھی جان چھڑانا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے عارضی طور پر نہیں بلکہ مستقل طور پر سپرد ہی کر دو۔"

میں نے کہا تھا تو جلیل نے کچھ نہیں کہا حالانکہ ایک بار پہلے اس طرح کہنے پر اس نے احتجاج کیا تھا۔

"یہ ناممکن ہے سر! ہم نے زندگی سے لے کر موت تک ساتھ دینے کا حلف اٹھایا ہے اور آپ کو ہمارے ساتھ رہنا ہے۔"

تو اب کیا تھا ایسا میں سوچ رہا تھا اور قطرہ قطرہ گلوکوز میری رگوں میں اتر رہا تھا تنگ آ کر میں نے خود ہی سوئی نکال دی اور سسٹر کا انتظار کرنے لگا۔

"یہ کیا کیا سر! آپ نے؟" سسٹر آئی تو اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں میں گھر جانا چاہتا ہوں میرے خیال میں اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن سر! وہ آج ڈاکٹر کا بورڈ بیٹھنا ہے ایک بار پھر آپ کی رپورٹ کا جائزہ لے

کر دوائیاں تجویز کی جائیں گی۔"

"لیکن کیوں کیا ہے میں اچھا بھلا ہوں۔"

تب سسٹر نے مجھے بتایا ہے" کہ جب میرا خون ٹیسٹ کیا گیا تو پتا چلا کہ مجھے ہیپاٹائٹس سی ہے اور میرے جگر میں اچھا خاصا بڑا داغ بن چکا ہے۔"

"جگر کا کینسر؟" میں نے سوالیہ نظروں سے نرس کو دیکھا۔

"سر! وہ جلیل صاحب نے بورڈ بلایا ہے آپ کے عزیز ہیں شاید۔۔۔۔" سسٹر نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے کہا تو میں نے سر ہلا دیا اور اس کے جانے کے بعد جلیل کو فون کیا۔

"جلیل! ڈاکٹر کیا کہتے ہیں میرے پاس کتنا وقت ہے۔"

"چھ ماہ سے ایک سال تک۔"

"حیرت ہے مجھے کبھی کوئی ایسی تکلیف نہیں ہوئی۔"

"ہاں ہوتا ہے کبھی ایسا، اچانک پتا چلتا ہے۔ جگر میں چھوٹا سا سوراخ ہے اور ڈاکٹرز کا خیال ہے کہ بعض اوقات یہ بڑی جلدی سے پھیلتا ہے بہرحال ڈاکٹرز ڈسکس کر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس کے علاج کے لیے آپ کو باہر بھیجنا پڑے۔"

"جلیل! ایسا نہیں ہوسکتا کہ مجھے تمام ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا جائے میں یہ باقی ماندہ دن اپنی مرضی سے گزارنا چاہتا ہوں۔"

"او کے سر! میں آج میٹنگ بلا رہا ہوں۔"

اور پھر وہ سب لوگ میرے پاس آئے تھے وہ نو آدمی اور چند اور۔۔۔۔ وہ سب اداس تھے۔ میری درخواست قبول کر لی گئی تھی۔ انہوں نے عثمان علوی کو اپنا بگ باس چن لیا تھا۔ وہ بضد تھے کہ میں علاج کے لیے باہر چلا جاؤں لیکن میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں ہاسپٹل سے گھر آ گیا تھا اور میری خوشی دیدنی تھی میں نے اس دلدل سے باہر قدم رکھ دیا تھا بھلے موت کی دہلیز پر ہی کھڑے ہو کر ہی سہی۔ اب میں سکون سے مر سکتا تھا۔ اگلے دو ہفتے میں بے حد مصروف رہا تھا۔ کبیر اور حاجی صاحب میرے ساتھ تھے۔ تمام اثاثوں اور بینک بیلنسز کا حساب کتاب ہو رہا تھا میں نے سب کچھ رفاعی اداروں اور ہاسپٹلوں کو دے دیا تھا

سوائے اس ایک مکان کے جس میں میں رہ رہا تھا یہ گھر میری موت کے بعد دیا جانا تھا میں نے کبیر اور حاجی صاحب کو سب سمجھا دیا تھا۔ اخبار کے تمام ملازمین کو فارغ کر دیا گیا اور اخبار بند کر دیا گیا تھا۔ صبح نو جیسے اخبار کے بند ہو جانے پر سب ہی اخباروں نے کچھ نہ کچھ لکھا تھا کہ اچانک کیوں ایسے اخبار کو بند کر دیا گیا ہے۔ وجہ کسی کو معلوم نہ تھی تب ہی کام سے فارغ ہو کر میں نے اسید کو فون کیا۔

"تم نے میرے ایکسیڈنٹ کی خبر تو پڑھی ہو گی میں منتظر ہی رہا کہ شاید تم۔۔۔"

"میں نے پڑھا تھا لیکن میں آپ کے سامنے آ کر کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا میں نے آپ کے اخبار کے متعلق بھی پڑھا تھا۔"

"اور اگر میں درخواست کروں کہ تم کچھ دیر کے لیے مجھے ملنے آؤ تو۔۔۔۔" تو وہ خاموش ہی رہا۔

"تم نے کہا تھا نا۔۔۔ میں اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کروں تو میں نے۔۔۔"

"کیا آپ نے اخبار اس لیے بند کر دیا ہے؟" اس کے لہجے میں خوشی کا احساس سا محسوس ہوا مجھے۔

"ہاں۔۔۔ اور عمر کی نقدی بھی ختم ہوئی جاتی ہے۔ شاید چند ماہ۔۔۔۔"

وہ میری آدھی ادھوری بات سے پورا مطلب اخذ کر کے شام کو میرے سامنے بیٹھا تھا۔

"سر! آپ بہت عجیب ہیں کوئی تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی ایک رشتہ ایک تعلق بن گیا ہے آپ سے۔"

"اسید عبدالرحمٰن میں چاہتا ہوں میری آخری خواہش ہے کہ تم ایک اخبار نکالو، سب اخباروں سے منفرد، سچا کھرا اور بے باک۔"

"اخبار۔"

"سر! اس کے لیے سرمایہ چاہیے اور میرے پاس سرمایہ نہیں ہے آپ جانتے ہیں۔"

"ہاں اسید! میرے دادا کا ایک گھر ہے اسلامیہ پارک میں اچھا خاصا کشادہ

ہے، حلال کی کمائی سے ہے اس میں رزق حرام کی رتی تک نہیں ہے میں چاہتا ہوں اس گھر کو فروخت کر کے تم اپنا اخبار نکالو۔''

''لیکن سر۔۔۔۔!''

''پلیز اسید! یہ ایک مرتے ہوئے شخص کی آخری خواہش ہے۔ مجھے مایوس مت کرو۔ میرے پاس بے حد وحساب روپیہ تھا، پلاٹ تھے، کروڑ کا یہ گھر ہے لیکن میں نے ان میں سے ایک روپیہ تک تمہیں دینے کی کوشش نہیں کی سب ڈونیٹ کر دیا ہے لیکن وہ گھر میرے دادا کا گھر تھا ان کی رزق حلال کی کمائی سے خریدا گیا تھا۔

''پلیز اسید! میں چاہتا ہوں تم اپنی روشنی پھیلاتے رہو۔'' اور اسید مجبور ہو گیا۔

اور ہاں میں نے ایسا اس لیے نہیں کیا تم اپنے آرٹیکل میں میرا نام نہ لکھو، تم لکھو ضرور لکھو وہ آرٹیکل۔۔۔۔ چند دن زندگی کے میرے جیل میں کٹ گئے تو کیا؟''

اس نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن میں جانتا تھا اس نے وہ کاغذ یقیناً پھاڑ کر پھینک دیئے ہوں گے۔

کیونکہ میں باقاعدگی سے اخبار پڑھتا تھا جس میں اس کا مضمون چھپتا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ یہ مضمون لکھے گا ضرور لیکن میری موت کے بعد ان دنوں وہ اکثر میری مزاج پرسی کے لیے آجاتا تا کئی بار میری طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو مجھے ہاسپٹل ایڈمٹ ہونا پڑا۔ وہ میرے پاس آتا تھا گھنٹوں اداس بیٹھا رہتا۔۔۔۔ ایک بار طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو ڈاکٹروں کے کہنے پر مجھے کراچی آغا خان میں جانا پڑا اور وہاں میں نے فاطمہ کو دیکھا۔ اتنے طویل عرصہ بعد مجھے اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی تھی اس کے ساتھ سترہ اٹھارہ سال کی ایک بچی بھی تھی اس کی نوجوانی کی تصویر، وہ کسی عزیز کی مزاج پرسی کے لیے آئی تھی۔

''فاطمہ!'' بے اختیار میرے لبوں سے نکلا تھا۔ اسے مجھے پہچاننے میں کچھ دیر لگی تھی۔

''میں آفتاب ہوں آفتاب حسین۔۔۔۔'' اس کی آنکھوں میں یک دم چمک پیدا ہو گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں بجھ سی گئی تھیں۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے آفتاب! تمہاری رنگت کیسی ہو گئی ہے اور کتنے کمزور ہو گئے

ہو؟''

''مجھے جگر کا کینسر ہے۔'' میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا تھا لیکن اس کا رنگ یکدم زرد ہو گیا تھا اور آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی تھی۔

''کتنے بچے ہیں تمہارے؟ میاں کیسے ہیں؟ خوش ہو؟''

''دو بیٹیاں ایک بیٹا اور سب ٹھیک ہیں یہ میری بیٹی ہے آمنہ۔۔۔۔'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی وہ اپنی بیٹی کو میرے متعلق بتانے لگی۔

''یہ بہت بڑے رائٹر تھے، بہت خوبصورت کہانیاں لکھتے تھے، بہت زبردست کالم نگار تھے، پھر انہوں نے چھوڑ دیا لکھنا۔۔۔۔''

''آفتاب! تم نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا تھا'' اب وہ مجھ سے مخاطب تھی بہت عرصہ تک میں تمہاری تحریریں ڈھونڈتی رہی بک اسٹال پر جاتی تو وہاں موجود ہر میگزین ہر اخبار دیکھ ڈالتی تھی۔

''تم نے جو کہا تھا کہ اگر آدمی قلم کی حرمت برقرار نہ رکھ سکے تو بہتر ہے کہ قلم توڑ دے سو میں نے بھی۔۔۔۔'' وہ تاسف سے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں کچھ اور بھی تھا لیکن میں اسے کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔

''لیکن اب میں لکھنا چاہتا ہوں ایک کہانی۔۔۔۔ اسید عبدالرحمٰن کی کہانی۔۔۔۔ لیکن پتا نہیں وقت اتنی مہلت دے یا نہیں۔''

''اسید عبدالرحمٰن کون ہے؟''

''وہ روشنی کا مینارہ ہے۔'' میں مسکرایا۔

''میں نے جب اس کی کہانی لکھ لی، تو پڑھ لینا، اب تو تمہیں جانا ہوگا۔''

''تم کب تک ادھر ہو؟''

''شاید ایک یا دو دن۔۔۔۔''

اور پھر وہ چلی گئی میں نے دور تک جاتے ہوئے اسے دیکھا وہ تو آج بھی میرے دل میں براجمان تھی ایسے ہی روز اول کی طرح اور میں سمجھتا تھا میں اسے بھولنے میں کامیاب ہو گیا ہوں اگلے روز وہ پھر آ گئی۔ اکیلی اور بہت دیر تک بیٹھی رہی پرانی باتیں کرتی

رہی اور میں سنتا رہا اس کی آنکھیں بار بار نم ہو جاتی تھیں۔

"سنبل نے بتایا تھا ایک بار کہ تم نے وہ گھر بھی اسے گفٹ کر دیا، تم کتنے مختلف ہو آفتاب اپنے بابا سے؟" اور میں صرف مسکرا دیا۔

"تم نے شادی کیوں نہیں کی، کر لیتے تو اتنے اکیلے نہ ہوتے آج؟" میں پھر خاموش رہا۔

"آفتاب! مجھے معاف کر دو میں نے تمہارا دل دکھایا لیکن میرا اپنا دل بھی تو۔۔۔۔"

"آدھی ادھوری بات۔۔۔۔" میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"میں تم سے کبھی خفا نہیں رہا، محبت اور رفاقت تو زبردستی کا سودا نہیں ہوتا۔"

"میں۔۔۔۔" وہ لب کچل رہی تھی ضبط کر رہی تھی۔

"میں نے بھی تو آفتاب تم سے۔۔۔۔" پھر وہی ادھورا جملہ۔

"لیکن مجھے خود کو جھٹلانا تھا، میری مجبوری تھی، میرے والدین کی کمٹمنٹ تھی۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔

اور اتنے سالوں بعد میرے دل کا خالی آنگن جیسے لمحوں میں بھر گیا تھا، عمر بھر کی تشنگی ختم ہو گئی تھی، میں تو یکا یک سیراب ہو گیا تھا، لبالب بھر گیا تھا اور اگلے روز میں واپس چلا آیا۔

جگر کا سوراخ تیزی سے بڑھ رہا تھا اور تکلیف و اذیت دوچند ہو گئی تھی لیکن دل مطمئن تھا میں کہتا تھا کہ میری زندگی میں کچھ بھی افسانوی نہیں ہوا۔۔۔اب میرے ساتھ بھی کہانیوں اور افسانوں والی بات ہو گئی تھی اور میں تو تھا ہی بنیادی طور پر کہانی نگار۔

اور مجھے کہانی لکھنی تھی اسید عبدالرحمٰن کی۔۔۔۔جس کی لمبی انگلیاں اور گھنی پلکیں نایاب جیسی تھیں۔ جس میں مجھے آفتاب حسین نظر آتا تھا اور جو بہادر تھا، بے خوف تھا، نڈر تھا، Honest تھا اور جو آفتاب حسین کی طرح معاشرے سے برائیاں ختم کرنا چاہتا تھا اور میں نے قلم اٹھا لیا ہے۔

موت تیزی سے میری طرف بڑھ رہی ہے اور میں نے کہانی لکھنی شروع کر دی

ہے میری زندگی کی آخری کہانی۔

اسید عبدالرحمٰن کی کہانی

روشنی کی امید کی سچائی کی کہانی

اس امید کے ساتھ کہ اسید عبدالرحمٰن ہمیشہ ایسا ہی رہے، انمول، سچا، کھرا، انسانیت کا علم بردار اور میرے ملک کا ہر شہری اسید عبدالرحمٰن ہو، آفتاب حسین اور حسین احمد نہ ہو۔

تو یہ کہانی جو میں لکھنے جا رہا ہوں یہ اسید عبدالرحمٰن کی کہانی ہے گو یہ کہانی ادھوری ہے پھر بھی میں یہ کہانی لکھنا چاہتا ہوں کہ بعض ادھوری کہانیاں بھی اپنے اندر بہت معنی رکھتی ہیں جیسے یہ میری ادھوری کہانی۔

☆ ☆ ☆

حصہ دوئم

استقامت

اور یہ میں ہوں اسید عبدالرحمٰن ۔۔۔۔۔ میں اپنی کہانی کہاں سے شروع کروں مجھے سمجھ نہیں آرہی، وہاں سے جب میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی، یا وہاں سے جب میرا دل پہلی بار آمنہ کے نام پر دھڑکا تھا، یا وہاں سے جب وہ میری زندگی میں داخل ہوئے تھے، وہ جو میرے کوئی نہیں تھے لیکن جو میری زندگی کا اہم سنگ میل تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کاش وہ مجھے نہ ملے ہوتے تو میری زندگی بہت آسان ہوتی میں ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزار کر چلا جاتا، یوں ہر لحظہ پل صراط سے نہ گزرنا پڑتا۔

سوچتا ہوں میرے ساتھ انہوں نے اچھا نہیں کیا یا پھر شاید اچھا کیا، لیکن جس راستے پر وہ مجھے ڈال کر گئے ہیں وہ بڑا مشکل راستہ ہے، پل صراط کی طرح کا ہے، بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز اور اس پل کو عبور کر کے ہی جنت میں جایا جا سکے گا۔

دادی کہتی تھیں اس کے نیچے دہکتی ہوئی جہنم کی آگ ہوگی اور گناہگار اس پل صراط

کو پار نہ کر سکیں گے اور آگ میں گر جائیں گے اور میرا چھوٹا بھائی کہتا تھا کہ:

"دادی! جو لوگ قربانی دیتے ہیں وہ تو اپنی اپنی قربانی کے جانور پر بیٹھ کر پل صراط پار کر لیں گے نا؟"

"بھلا نہ ہو تو ۔۔۔۔" دادی ہنس پڑتی تھیں۔

"پلے کوئی عمل نہ ہو تو خالی خولی قربانی کے جانور کس کام کے؟"

"مگر دادی! میرا دوست کہتا ہے کہ میرا ابا تو پلے ہوئے موٹے موٹے بکرے خریدتا ہے کہ وہ ہمارا بوجھ اٹھا کر پل صراط سے آسانی سے گزر سکیں۔"

تب دادی اور زور سے ہنس پڑیں لیکن یہ پل صراط جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اگر دنیا میں اس سے واسطہ پڑ جائے تو آدمی کیا کرے اور نیک آدمی کے لیے اور بھی مشکل ہے۔ ہر لحظہ لگے جیسے آدمی تنے ہوئے رسے پر چل رہا ہو کہ ابھی گرا اور میں بھی مسلسل کئی سالوں سے اس پل صراط سے گزر رہا ہوں مسلسل چھ سال اور ہر لحظہ یہ خوف کہ ذرا سی بے احتیاطی، ذرا سی لغزش مجھے آگ کے دہکتے گڑھے میں گرا دے گی اور اس خوف کی کیفیت میں زندگی گزارنا کیسا ہے؟

کوئی مجھ سے پوچھے اور میں چھ سالوں سے اس تنے ہوئے رسے پر چل رہا ہوں چلتا جا رہا ہوں کہ میرے کندھوں پر دو وعدوں کا بوجھ ہے پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب ان کی وجہ سے ہے۔ آفتاب حسین کی وجہ سے، جب تک وہ میری زندگی میں نہیں آئے تھے میری زندگی بہت سکون اور آرام سے گزر رہی تھی اور آئندہ بھی گزرتی رہتی ایسے ہی جیسی میرے جیسے متوسط گھرانے کے لڑکے کی گزرتی ہے میں ۔۔۔۔ اسید عبدالرحمٰن نے ایک متوسط گھرانے میں جنم لیا میرے والد محکمہ زراعت میں کلرک تھے۔

میرے دادا پرائمری سکول ٹیچر تھے اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ ریٹائر ہو چکے تھے شاید اس لیے میرا بچپن اور لڑکپن، ابا کی بجائے دادا کی نگرانی میں زیادہ گزرا۔ میری والدہ بھی جب میرا چھوٹا بھائی چھ برس کا تھا وفات پا گئی تھیں۔ یوں والدہ کی جگہ دادی نے ہماری پرورش کی تھی اور ہم چاروں بھائی ہی دادا کے زیادہ قریب تھے لیکن میں چونکہ بڑا تھا اس لیے دادا کی مجھ پر خصوصی توجہ تھی اور میں خود بھی دادا کی ذہانت سے متاثر

تھا۔ دادا نا صرف یہ کہ حساب کے سوال منٹوں میں کر لیتے تھے بلکہ ان کے پاس بے تحاشا نالج تھا۔ وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے تھے۔ بڑے کمرے میں تین الماریاں ان کی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس لیے جب میں چھوٹا تھا تو سوچتا تھا کہ میں دادا کی طرح استاد بنوں گا۔ دادا کے پرانے شاگرد جہاں کہیں بھی دادا سے ملتے ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ محفل میں ہوتے تو دادا کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ آدمی کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ میں بھی جب ذرا بڑا ہوا تو مجھے کتابوں کا چسکہ پڑ گیا۔ شروع میں دادا نے مجھے چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کے لیے دیں تاکہ میری اردو اچھی ہو جائے لیکن جب میں ہائی کلاس میں پہنچا تو دادا نے مجھے اجازت دے دی کہ میں ان کی کتابوں میں سے جو کتاب بھی چاہوں لے کر پڑھ لوں۔ یوں کتابیں میرے لہو میں داخل ہو گئیں۔ دادا کے پاس بے شمار اچھی اعلیٰ پائے کی اردو کتابیں تھیں جب دادا نے وہ کتابیں خریدی تھیں تو ان کی قیمت دیکھ کر مجھے ہنسی آتی تھی۔ چار آنے، دو آنے، چھ آنے "غبار خاطر" ابوالکلام آزاد کی یہ کتاب غالباً میں نے چھٹی جماعت میں پڑھی تھی اور مجھے یاد ہے اس کی قیمت چھ سات آنے ہی تھی میں ہنستا تو دادا سمجھاتے۔

"یار! اس وقت روپے کی قیمت تھی۔ جانتے ہو میری تنخواہ چالیس روپے ماہوار تھی۔ میں ہر ماہ دس روپے گاؤں اپنی ماں کو خرچ بھیجتا تھا اور تیس روپے میں تمہاری دادی، ابا، میں اور پھوپھی اچھا خاصا گزارا کر لیتے تھے۔ بلکہ ہر ماہ دو تین روپے کی کتابیں خریدنے کی عیاشی بھی کر لیتا تھا۔ دادا کی الماری میں اس زمانے کے مشہور رسالے بھی جلد کیے ہوئے پڑے تھے۔ مثلاً "ہمایوں" "نیرنگ خیال" "ساقی" "قوس وقزاح" اور رسالے ہی نہیں اپنے زمانے میں نکلنے والے ہفتہ وار اخبار مثلاً "اودھ پنچ" وغیرہ کی فائلیں بھی موجود تھیں۔ تو یوں یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے جب میں نے میٹرک پاس کیا تو میں استاد بننے کا ارادہ موقوف کر چکا تھا اور میں نے سوچا تھا میں یا تو ادیب بنوں گا یا صحافی۔۔۔

"ادیب پیدائشی ہوتا ہے۔ میری جان!" دادا نے میری بات سن کر کہا تھا۔
"یہاں کسی کالج یا یونیورسٹی میں ادیب بننے کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ ہاں تم ادب

پڑھ سکتے ہو انگریزی ادب، اردو ادب، فارسی ادب، یہ تعلیم تمہاری صلاحیتوں کو پالش ضرور کردے گی لیکن تمہیں ادیب نہیں بنا سکے گی اگر تمہارے اندر پہلے سے ہی ٹیلنٹ موجود نہیں ہے۔"

"تم صحافت پڑھ لو۔" انہوں نے مشورہ دیا۔

"تو ٹھیک ہے میں جرنلزم لوں گا۔" میں نے سوچ لیا تھا حالانکہ ابا چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر یا انجینئر بنوں اور انہوں نے اس سلسلے میں تھوڑی سی جذباتی بلیک میلنگ سے بھی کام لیا یعنی یہ کہ یہ تمہاری مرحومہ ماں کی خواہش تھی۔"

اور ممکن تھا کہ میں اس جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہو جاتا کہ دادا نے ابا سے کہا:

"اس کا راستہ نہ روکو اور اس پر زبردستی نہ کرو اس کا مزاج نہیں ہے سائنس پڑھنے کا، تمہارے کہنے پر لے تو لے گا لیکن چل نہ سکے گا۔"

اور ابا نے کبھی دادا کی بات نہیں ٹالی تھی اور یوں میں نے جرنلزم میں داخلہ لے لیا زندگی یوں ہی گزر رہی تھی بڑے سکون سے کہ احمد کو بلڈ کینسر ہو گیا احمد ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا سب سے ذہین لڑکا تھا اور میرا گہرا دوست۔

احمد میری ہی طرح کا ایک متوسط گھرانے کا لڑکا تھا۔

لیکن اس کے آدرش بہت بلند تھے۔

وہ اونچے اونچے خواب دیکھتا تھا۔

اس ملک کو بدل دینے کی باتیں کرتا تھا۔

کبھی کبھی میں اس کی باتیں سن کر حیران رہ جاتا پتا نہیں وہ کون سی دنیاؤں کی بات کرتا تھا اس نے اپنی ایک یوٹوپیا تخلیق کر رکھی تھی۔

ایک ایسا پاکستان۔۔۔ جس کا ہر فرد ریاست سے مخلص تھا۔

جہاں کرپشن نہیں تھی۔

جہاں ہر فرد خوش تھا۔

میں ساکت سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا تھا لیکن پھر وہ اپنی تمام خوبصورت سوچوں تلے سو گیا۔

تو یہ احمد نوید جب بیمار ہوا اور ہمیں پتا چلا کہ اسے بلڈ کینسر ہے تو ہم دوستوں
اس کے لیے روپے اکٹھے کرنے کا پروگرام بنایا۔ وہ ذہین اور خوبصورت لڑکا ہماری آنکھ
کے سامنے تیزی کے ساتھ موت کے منہ میں جا رہا تھا اور ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے
موت کے منہ میں نہ جانے سے روک نہیں سکتے تھے لیکن اس کی اذیت کم کر سکتے تھے۔ علا
اور دواؤں سے اسے ریلیکس دے سکتے تھے، کئی لوگوں نے مدد کی، کئی لوگوں نے ٹرخا
بہت سے ایسے لوگ بھی ملے جن کے پاس پیسوں کی فراوانی تھی لیکن جن کے دل اتنے تنگ
تھے کہ ان کی جیبوں سے ایک روپیہ بھی نہیں نکلا تھا۔

اس روز ”صبح نو“ کے دفتر کے پاس سے گزرتے ہوئے میں بلاارادہ
اندر چلا گیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس اخبار کا مالک جرم اور ناانصافی کے خلاف
جنگ کر رہا تھا اور ایک مخبر شخص تھا اور پھر جیسا میں نے سنا تھا ویسا ہی پایا۔ میں نہ صرف
آفتاب حسین کی شخصیت سے متاثر ہوا بلکہ میں نے اپنے دل میں انکے لیے بڑی اپنائیت
بھی محسوس کی۔ گو میں نے پہلی بار سوچا کہ آفتاب حسین جیسے چند لوگ بھی ہوں تو یہ دنیا رہنے
کے قابل جگہ ہے اور میں نے آفتاب حسین کے آفس سے اٹھ آنے کے بعد بھی آفتاب
حسین کو بے حد سوچا۔ صرف چند گھنٹوں میں وہ میرا آئیڈیل بن گئے تھے۔ میں نے سب
ہی دوستوں سے ان کا ذکر کیا۔ حتیٰ کہ احمد کے پاس بیٹھ کر میں نے کتنی ہی بار آفتاب حسین کو
سراہا۔ یہ دو تین دن بعد کی بات تھی جب میں نے احمد کے دادا ابو کو بتایا کہ آفتاب حسین نے
کہا ہے کہ اگر احمد کو باہر بھجوانا پڑا تو وہ پوری مدد کریں گے۔

”یہ آفتاب حسین کون ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

اور جب میں نے بتایا ”صبح نو کا مالک ہے۔“ تو وہ چونک پڑے۔

”حسین احمد کا بیٹا؟“

”ہاں شاید یہی نام ہے ان کے والد کا۔۔۔“

مجھے یاد آیا تھا کہ صبح نو کے پہلے صفحہ پر مالک کا نام ہی لکھا ہوتا ہے۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے مضطرب سے پہلو بدلتے ہوئے پھر بے چینی سے
پوچھا۔

”کیا اس نے تمہاری مدد کی ہے؟“

”جی ایک لاکھ کا چیک دیا ہے ابھی ہمارے پاس ہی ہے کل احمد کو ہاسپٹل میں
لے جائیں گے تھراپی کے لیے تو۔۔۔۔۔“

وہ یکدم کھڑے ہو گئے تھے۔ ”یہ رقم اسے واپس کر دو بیٹا۔۔۔۔!“

”لیکن کیوں دادا جان؟“

احمد کی طرح ہم سب دوست بھی انہیں دادا جان کہنے لگے تھے میں حیرت سے
انہیں دیکھ رہا تھا۔

”آپ جانتے ہیں۔ علاج کس قدر مہنگا ہے ایک ایک انجکشن بہت قیمتی ہے۔“

”جانتا ہوں پھر بھی آفتاب حسین کی رقم تم واپس کر دو۔“

”میں نے نوید کی وفات کے بعد بہت محنت کی ہے سب کو رزق حلال کھلایا ہے
اب اس کے آخری لمحوں میں اس کے خون میں رزق حرام شامل کروں نہیں۔“ ان کا انداز
حتمی تھا۔

”لیکن دادا جان! اور جن جن لوگوں نے مدد کی ہے ان کے متعلق بھی تو ہم یقین
سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ رقم جائز ذریعے سے کمائی گئی ہے یا ناجائز۔۔۔“ میرے ایک
دوست نے کہا تھا۔

”آپ صحیح کہتے ہو بیٹا! لیکن میں ان کے متعلق بے خبر ہوں۔ جانتے بوجھتے میں
حرام کی آمیزش نہیں کر سکتا۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”حسین احمد میرا ہم جماعت تھا اور ہم ایک ہی کلاس اور ایک ہی محلے میں رہتے
تھے۔ جو شخص اب دنیا میں نہیں رہا میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں کروں گا سوائے اس کے
کہ اس نے یہ سب ناجائز طریقوں سے کمایا ہے اور اس کا یہ بیٹا اس کے نقش قدم پر چل رہا
ہے۔ میں حسین احمد کو اتنا جانتا ہوں جتنا شاید آفتاب حسین بھی نہ جانتا ہو۔“

انہوں نے مزید بات نہیں کی تھی اور اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔

”اس وقت اس طرح کی غیرت دکھانا بیوقوفی ہے۔“ ایک دوست نے تبصرہ
کیا تھا۔

تب احمد نے اپنی بند آنکھیں کھولی تھیں۔ "مجھے اپنے دادا پر فخر ہے اسید! پلیز جو دادا نے کہا ہے وہی کرو۔ دوسروں کی نظر میں وہ بے وقوف ہی سہی لیکن میری نظروں میں ان کا قد بڑھ گیا ہے۔" یہ بڑے حوصلے کی بات تھی۔

اور ایسا ہر کوئی نہیں کرسکتا یہ احمد ہی کرسکتا تھا یا اس کے دادا جان۔۔۔آفتاب حسین کا بت میرے اندر ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوگیا۔ یہ بت اگرچہ دو دن پہلے ہی تو میرے اندر بنا تھا لیکن اس کی کرچیوں نے مجھے زخم زخم کردیا تھا۔ پتا نہیں کیوں دو تین دن تک میں عجب حزن کی سی کیفیت میں گھرا رہا پھر احمد کا علاج شروع ہوگیا اور مصروفیت بڑھ گئی۔

انجکشن تھراپی

ایک تکلیف دہ عمل

اور زندگی کی امید صفر

پھر بھی آدمی آخری سانس تک کوشش تو کرتا ہے۔ سو ہم بھی کر رہے تھے۔ طلبہ دل کھول کر ڈونیشن دے رہے تھے اور امید تھی کہ ہم احمد کو باہر بجھوا سکیں گے۔

میں ذرا سنبھلا تو آفتاب حسین کو چیک واپس دینے چلا گیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا جیسے آفتاب حسین کا چہرہ جگہ جگہ سے چیخ رہا ہو اور وہ کسی اذیت سے گزر رہے ہوں۔ مجھے خیال گزرا تھا کہ کہیں دادا جان کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔ یہ شخص ایسے لگتا تو نہیں۔ میں نے ان کے چہرے سے نظریں ہٹالیں تھیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر بکھرا سوز و گداز مجھے پگھلا رہا تھا۔ میں یکدم ان کے کمرے سے نکل آیا تھا۔ میں آ تو گیا تھا لیکن مجھے لگا جیسے میں نے ان کے ساتھ زیادتی کردی ہے۔ میں نے سوچا ضروری تو نہیں بیٹا باپ جیسا ہو اور پھر اس طرح کے لوگ تو پیسے کی ہوس میں مبتلا رہتے ہیں یہ لوگ تو ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کرتے۔ پھر میں نے آفتاب حسین کے متعلق جاننے کی کوشش شروع کردی۔

آفتاب حسین ایک بڑا ادیب

ایک سچا کالم نگار، کھرا صحافی

آفتاب حسین ایم پی اے

ایک بلیک میلر۔۔۔دوغلا

کسی انڈر گراؤنڈ تنظیم کا بگ باس

ان انکشافات نے مجھے گہری اذیت سے دوچار کردیا۔ بہت دن لگے مجھے خود کو یقین دلانے میں کہ وہ ایسا ہی ہے۔

یہ دنیا ہے یہاں لوگوں نے ایک چہرے پر کئی چہرے اوڑھ رکھے ہیں اور میں نے آفتاب حسین کا خیال ذہن سے جھٹک دیا، ہوتے ہیں ایسے لوگ دنیا میں اور مجھے کیا پڑی ہے کہ میں ایک اجنبی شخص کے متعلق سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہوں۔ یوں بھی احمد کی طبیعت کافی خراب تھی۔ پہلی تھراپی کے بعد وہ بے حد ویک ہوگیا تھا اور میں یونیورسٹی کے بعد روز ہی اس کی طرف چلا جاتا تھا۔

"تمہارا فائنل قریب ہے میرے پاس آکر وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی تیاری کرو۔" وہ اکثر کہتا تھا۔

سب دوست ہی باقاعدگی سے جا رہے تھے۔

"کاش میں کچھ دن اور جی سکتا۔"

مرنے سے چند دن پہلے اس نے کہا تھا میں تب اس کے پاس اکیلا بیٹھا تھا۔

"مجھے لگتا ہے میں زیادہ دن جی نہ سکوں گا۔ زندگی کی حسرت اس کی آنکھوں میں ٹھہری سی گئی تھی۔ میرے بعد میرے بابا جان اکیلے ہوجائیں گے اسید! تم کبھی کبھار ان کے پاس آتے رہنا اور کبھی کبھی اماں سے بھی مل لیا کرنا۔"

میں نے بنا کچھ کہے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا مجھے لگا تھا میں اگر بولا تو حلق میں جمع ہونے والے آنسو بہہ نکلیں گے۔

"میں نے سوچا تھا میں۔۔۔۔" پھر ایک گہری سانس لے کر وہ خاموش ہوگیا میرا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ پر تھا۔

"اسید!" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

"میرا جی چاہتا ہے میں اپنے سارے خواب تمہیں منتقل کردوں تم جانتے تو ہو نا میرے خواب۔۔۔۔" میں نے بنا بولے اب بھی اثبات میں سر ہلایا۔

"وعدہ کرو اسید عبدالرحمٰن! ہمیشہ جھوٹ کے، ظلم کے، ناانصافی کے خلاف جنگ

جاری رکھو گے، جب قلم اٹھاؤ گے تو اس کی حرمت کبھی نہیں بیچو گے، ہمیشہ سچ لکھنا میرے دوست۔۔۔۔۔!''

اس کے سفید ہو جانے والے ہونٹوں پر ایک مسرت بھری مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ:

''میں صحافت کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کروں گا میں اپنے قلم کی طاقت سے اس ملک کی تاریخ بدل دوں گا تھا ناں دیوانے کا خواب؟'' وہ ہولے سے ہنسا تھا۔ ایسی ہنسی جس میں ہزاروں حسرتوں کی کرچیاں تھیں۔

''پتا ہے اسید! بابا جان اکثر کہتے ہیں کہ

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا''

اسے اقبال سے عشق تھا اور اسے اقبال کے سینکڑوں اردو اور فارسی کے شعر یاد تھے اور اکثر وہ ہمیں یہ اشعار سناتا رہتا تھا صرف اقبال کے نہیں بلکہ اور بھی شعرا کے شعر۔

آج بڑے دنوں بعد اس نے کوئی شعر سنایا تھا۔

''سنو! یہ واقعی مشکل راہ ہے لیکن راہ حق کے دیوانے راہ کی صعوبتوں سے ڈرتے نہیں ہیں۔'' میں سوچتا تھا۔

میرا ملک۔۔۔

میرا پاکستان

اقبال کا خواب

جناح کی کوششوں کا حاصل

میں اس کے لیے تن من دھن وار دوں گا

سر کچل ڈالوں گا میں ان سانپوں، بچھوؤں کا جو اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں، میں ان سب ملک دشمن لوگوں کے خلاف اپنی آخری سانس تک قلم سے جہاد جاری رکھوں گا، لیکن آہ میں اپنا مشن شروع کرنے سے پہلے ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''

پھر وہ کتنی ہی دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔ خاموشی سے، چپ چاپ، اس کے لب ایک

دوسرے سے جڑے ہوئے تھے لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

''سنو اسید عبدالرحمٰن! عہد کرتے ہو کہ میرا مشن جاری رکھو گے۔'' اور میں نے اس کی آنکھوں کی گفتگو سے گھبرا کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔

''ہاں، میں اسید عبدالرحمٰن وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہارا۔۔۔۔احمد نوید کا خواب پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں اس مشن کو شروع کروں گا جسے تم پورا نہیں کر سکے، میں ان سب زہریلے کیڑے، مکوڑوں، سانپوں، بچھوؤں کے خلاف اپنے قلم سے جہاد کروں گا جو میرے ملک کو کھائے جا رہے ہیں۔''

میں نے اپنے آپ کو حیرت سے کہتے سنا تھا لیکن احمد کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی اور اپنی آنکھوں کا نم چھپانے کے لیے اس نے فوراً ہی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''مجھے لگتا ہے میں اس بار تھراپی کی اذیت برداشت نہ کر پاؤں گا۔'' اس نے آنکھیں بند کیے ہوئے کہا تھا۔

''لیکن مجھے یقین ہے تم یہ تکلیف برداشت کر لو گے اور مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ ایک روز ہم دونوں قدم سے قدم ملائے اور کندھوں سے کندھے جوڑے اس مشن کو شروع کریں گے اور ایک دن ان سارے سانپوں اور بچھوؤں سے اپنے ملک کو صاف کر دیں گے۔''

وہ بولا نہیں تھا لیکن لگا تھا جیسے وہ میری خوش فہمی پر دل ہی دل میں ہنسا ہو۔

''ہاں تم یہ مشن ضرور جاری رکھنا۔۔۔ ہاں تم یہ مشن ضرور جاری رکھنا۔۔۔ اور سنو۔۔۔!'' اس کی آنکھوں میں یکدم جیسے روشنیاں سی تھیں اور زرد چہرے پر رنگ سے بکھر گئے تھے۔

''وہ ہے ناصدف، میری کزن۔۔۔۔''

''کیا صرف کسی کا نام لینے سے ہی چہرے پر یوں رنگ اتر آتے ہیں۔'' میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا اور وہ پہلی بار اپنا راز مجھے شیئر کر رہا تھا۔

''وہ بھی کہتی تھی کہ وہ میرا ساتھ دے گی، وہ بھی ظلم اور ناانصافی کے خلاف جنگ

کرنا چاہتی ہے۔"

"اسید! وہ۔۔۔۔۔" اس کی آنکھوں کی روشنیاں ماند پڑ گئیں اور چہرے کے رنگ مدھم ہو گئے۔

"اگر تمہیں اپنے مشن کے لیے کبھی کسی مخلص شخص کی ضرورت پڑے اسے اپنے ساتھ شامل کر لینا میں نے ایسی بہادر اور سچی لڑکیاں کم ہی دیکھی ہیں۔"

"واہ۔۔۔۔ کیا تم اور وہ۔۔۔۔۔" میں کچھ پوچھتے پوچھتے جھجک گیا۔

"ہاں، لیکن اب کیا فائدہ، پتا نہیں کیسے برداشت کر پائے گی وہ میری موت کو، بچپن میں ہی خالہ اور امی کے درمیان یہ طے ہو گیا تھا۔"

"فارگاڈ سیک احمد! تمہیں کچھ نہیں ہوگا، تم ٹھیک ہو جاؤ گے انشاء اللہ اور پھر دیکھنا ہم سب نے تم سے ٹریٹ لینی ہے زبردست سی۔ چھپے رستم ہو بتایا تک نہیں۔ خیر اب ساری کسر نکال لیں گے۔"

لیکن میرا یقین مجھ پر ہنستا ہی رہ گیا اور وہ چلا گیا بہت سارے دن میں اپ سیٹ رہا بہت سارے دن میں سوچتا رہا۔

"ایسے سچے کھرے محب وطن لوگ دنیا سے چلے جاتے ہیں اور آفتاب حسین جیسے بلیک میلر زندہ رہتے ہیں، ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے اس زمین پر دندناتے رہتے ہیں اور ملک کی تعمیر و ترقی کے خواب دیکھنے والے اپنے خواب آنکھوں میں چھپائے چلے جاتے ہیں احمد نوید کی طرح، کیا تھا اگر احمد نوید کے بجائے آفتاب حسین مر جاتے، میں نے کئی بار سوچا تھا۔ تب میں نہیں جانتا تھا کہ میں نے آفتاب حسین کی ہی خواہش کیوں کی جبکہ میرے اس ملک میں تو آفتاب حسین سے بھی بڑے بڑے بلیک میلر، کرپٹ اور غدار لوگ موجود تھے۔

شاید اس لیے کہ میں نے آفتاب حسین کو ایک ہی ملاقات کے بعد اپنے دل کے آسمان پر بہت بلندی پر بٹھا لیا تھا اور میں یوں ان کے آسمان سے زمین پر آ جانے سے بہت ٹوٹ چکا تھا۔ بہت غصہ تھا مجھے ان پر اور میں انہیں بھلا نہیں سکا تھا حالانکہ میں نے انہیں بھولنے کی کوشش کی تھی لیکن شاید قدرت کو یہی منظور تھا کیونکہ آگے چل کر وہ میری زندگی میں

ایک اہم کردار ادا کرنے والے تھے۔

احمد نوید اور آفتاب حسین۔

احمد نوید جو بالکل رزق حلال پر پلنے والا اور دوسرا وہ جس کی رگوں میں دوڑتے لہو میں حرام شامل تھا لیکن دونوں نے ہی جاتے جاتے مجھے عہد میں باندھا تھا وہ ایک جیسا عہد تھا۔ قلم کی حرمت برقرار رکھنے کا عہد، سچ کے پرچار کا عہد اور میں ان دو بندوں کے عہد سے بندھا چھ سال سے "پل صراط" پر چل رہا ہوں۔ اس روز جب میں چیک واپس کر کے ان کے دفتر سے نکل رہا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں کبھی پھر اس شخص سے ملوں گا بلکہ میں زندگی میں پھر کبھی انہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن ہوا یوں کہ وہ بار بار مجھ سے ٹکرانے لگے۔

حتیٰ کہ وہ میرے گھر تک پہنچ گئے۔ کبھی دادی سے ملنے کا بہانہ، کبھی ابا اور دادی کی خیریت معلوم کرنے کا جواز اور مجھے لگتا جیسے میں زیر بار ہو رہا ہوں۔ بغیر کچھ لیے میرے کندھوں پر ان کے نامعلوم احسانات کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ کیوں آخر کیوں؟ وہ یہاں آتے ہیں۔ میں الجھ رہا تھا اور میرے خاندان کے لوگ ان کے اخلاق کے اسیر ہو رہے تھے۔ دادی نے تو جھٹ سے انہیں بیٹا بنا لیا تھا۔ میرے گھر کے چھ کے چھ فرد ان کے اخلاص و محبت کے گن گاتے تھے۔

"دادا! کیا آپ کو بھی لگتا ہے کہ آفتاب حسین اچھے آدمی ہیں کیا ان کا باطن بھی ان کے ظاہر جیسا ہے؟"

"کسی کے باطن کے متعلق ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ بیٹا! کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ آفتاب حسین اچھے آدمی ہیں۔"

"پتا نہیں دادا!"

میں انہیں بتا نہیں سکا کہ وہ کس طرح کا آدمی ہے اور دادا جیسے ہمیشہ کی طرح میرے دل میں اتر کر دیکھ رہے تھے۔

"وہ جیسے بھی آدمی ہیں لیکن تنہا ہیں۔ گھر کے ماحول اور اپنوں کی محبتوں کو ترستے ہوئے۔ وہ ہم سے کچھ طلب نہیں کرتے پھر تم کیوں چاہتے ہو کہ وہ یہاں نہ آیا کریں

اگر ہماری ذات سے انہیں چند لمحوں کی خوشی مل جاتی ہے تو ہمارا کیا جاتا ہے؟"

"بیٹا! وہ بھی تمہاری طرح بچپن میں ماں کی محبت سے محروم ہو گئے تھے۔"

دادا مجھے وہ سب بتا رہے تھے جو آفتاب حسین نے انہیں اپنے متعلق بتایا تھا میں دادا سے کچھ نہیں کہہ سکتا میں انہیں تو روک سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا مجھے لگا جیسے وہ کسی اذیت سے دوچار ہو گئے ہیں ان کا چہرہ ان کی آنکھیں سب ظاہر کر رہی تھیں کہ کوئی گہرا درد ان کے دل کو چھیل رہا ہو میں نے نظریں چرالیں میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا حالانکہ میں اندر سے کمزور ہو رہا تھا اندر کہیں شاید دل کے کسی کونے میں آفتاب حسین اپنی جگہ بنا چکے تھے لیکن میں بے خبر تھا میں ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا لیکن وہ مجھے بتا رہے تھے کہ:

"میں ان کے بھائی نایاب سے مشابہ ہوں اور یہ مشابہت انہیں میری طرف کھینچتی ہے۔"

اور تب میں بے اختیار اس خواہش کا اظہار کر بیٹھا جو کبھی کبھی میرے دل کے کسی کونے میں جہاں آفتاب حسین قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔

"آپ اس دلدل سے نکل کیوں نہیں آتے سر!"

انہوں نے مجھے ایک نظر اٹھا کر دیکھا تھا کیسی بے بسی اور حسرت سی تھی اس نظر میں کہ مجھے لگا تھا جیسے وہ گہرا درد جو ابھی ان کے دل کو چھیل رہا تھا میرے دل میں اتر آیا ہو۔ ان کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا درد اور حسرت مجھے لگا جیسے میرا دل پگھل کر پانی ہونے لگا ہو۔ اس رات میں نے نہ صرف خود ان کے لیے دعا کی بلکہ دادا اور دادی سے بھی دعا کے لیے کہا اور اب پتا نہیں یہ ہماری دعائیں تھیں یا ان کی تقدیر میں پہلے دن سے ہی رقم تھا کہ اپنے آخری دنوں میں وہ اس دلدل سے نکل آئیں گے اور جب رخصت ہوں گے تو کندھوں کا سارا بوجھ جھاڑ جائیں گے جب انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں تو میں نے حیرت اور خوشی سے ان کی بات سنی تھی۔

حالانکہ صرف چند دن پہلے کی بات تھی جب میں ان سے کہہ رہا تھا وہ میرے راستے کھوٹے نہ کریں بار بار میرے گھر نہ آئیں۔ ان دنوں میں فری لانسر کی حیثیت سے مختلف اخباروں میں لکھ رہا تھا میرے کالم اور میرے آرٹیکل دونوں ہی پسند کیے جا رہے تھے

اور ایک اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں معاشرتی مسائل پر یہ آرٹیکل چھپ رہے تھے جب مختلف معاشرتی مسائل پر لکھتے لکھتے میں نے منشیات پر لکھنا شروع کر دیا تو میں نے گلیوں، قبرستانوں، پارکوں اور ویران زیر تعمیر عمارتوں میں گرے نشے سے دھت سترہ اٹھارہ سال کے بچوں کے متعلق لکھنا شروع کر دیا تھا۔

"وہ منشیات کہاں سے حاصل کرتے ہیں؟"

"ننھے معصوم بچے کیسے نشے کی عادت میں مبتلا ہوتے ہیں؟"

میں ایک ایک ٹاپک پر لکھ رہا تھا اور ہر ٹاپک پر لکھنے سے پہلے اس کی اچھی طرح سے تحقیق کرتا تھا اور پھر ایک روز مجھ پر انکشاف ہوا جس نے مجھے اندر تک ہلا کر رکھ دیا مجھے یقین نہیں آیا تھا۔

میں نے آفتاب حسین کی کہانیاں پڑھی تھیں میں نے ان کے کالم اور آرٹیکل لائبریریوں سے ڈھونڈ کر پڑھے تھے کہ لوگ کہتے تھے کہ میری تحریر میں آفتاب حسین کی تحریر کی کاٹ ہے میری لفظوں سے آفتاب حسین جھلکتا ہے۔

لوگوں کی کمزوریوں کو کھوج کر انہیں بلیک میل کرنے والے شخص کو تو میں نے اپنی طرف سے بشری کمزوری کا مارجن دے کر معاف کر دیا تھا لیکن ایک ایسی تنظیم کے باس کو میں کیسے معاف کر سکتا تھا جو میرے ملک میں زہر پھیلا کر میری نسل کو تباہ کر رہے تھے۔ نہیں میں ان سب چہروں کو بے نقاب کروں گا، میں نے خود سے عہد کیا تھا لیکن اس رات پتا نہیں کیوں ڈھیروں آنسو بلاوجہ ہی میری آنکھوں میں چلے آئے تھے۔

انہوں نے کہا تھا: "تم میرا لحاظ نہ کرو اور بھول جاؤ کہ کبھی تم مجھ سے ملے تھے تم وہی کرو جو تمہارا ضمیر کہتا ہے ایک صحافی کبھی اپنا قلم نہیں بیچتا۔"

تو میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"تو۔۔۔۔" وہ مسکرائے تھے۔

"تمہاری تحقیق کے سرے جہاں تک ہیں وہاں تک ضرور جاؤ ینگ مین!" میری ساری بات سن کر انہوں نے کہا تھا۔

اور اس رات میں نے جب اپنا آرٹیکل مکمل کیا تو میری آنکھوں کے گوشے گیلے

ہو رہے تھے لیکن صبح میں اپنے آفس جاتے ہوئے وہ مضمون اخبار کے دفتر میں دینے کے لیے رکا تو ایڈیٹر نے معذرت کرلی۔

"سوری مسٹر اسید! ہم مضامین کا یہ سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتے آپ پلیز معاشرتی مسئلے پر لکھیں۔"

"لیکن سر! کیا یہ معاشرتی مسئلہ نہیں ہے؟"

"تم اس موضوع پر بہت لکھ چکے ہو لوگ بور ہو گئے ہیں پڑھ پڑھ کر، وہ اب کچھ نیا چاہتے ہیں۔"

"لیکن سر! اس قسط میں تو بڑے بڑے انکشافات کیے ہوئے ہیں میں نے، آپ حیران ہوں گے کتنے بڑے بڑے لوگ ملوث ہیں اس کاروبار میں۔۔۔۔"

"ایسے کاموں میں بڑے لوگ ہی ملوث ہوتے ہیں میری جان۔۔۔!" وہ مدبرانہ انداز میں مسکرائے تھے۔

"بہر حال مجھے آپ کے نئے آرٹیکل کا انتظار رہے گا کل تک لکھ لیں گے نا آپ؟"

"او کے سر۔۔۔!" میں سمجھ گیا تھا جو لوگ مجھ پر دباؤ ڈال رہے تھے ان کی رسائی یہاں تک بھی ہو چکی ہے۔ میں آفس سے باہر آ گیا اور سوچا کوئی تو ہوگا ایسا جی دار جو یہ مضمون چھاپ دے۔ بہر حال آفس سے واپس آ کر دوسرے اخبارات سے بات کروں گا یا پھر کسی میگزین سے۔ مگر پھر ان کا فون آ گیا وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے میں نے ان کے حادثے کی خبر پڑھی تو تھی لیکن مجھے علم نہ تھا کہ وہ ساری کشتیاں جلا کر لمبے سفر پر جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ میرا دل جیسے ڈوب سا گیا اور کچھ دیر کے بعد میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ مجھے زیر بار نہ کریں میں ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا تھا اور میری آواز میں نا جانے کہاں سے آ کر بہت سارا غم شامل ہو گیا تھا۔"

"لیکن یار! میں نے کہاں زیر بار کیا ہے تمہیں؟"

"اب میں ان سے کیا کہتا کہ کیسے زیر بار کرتے ہیں۔ اسیر تو کر لیا آپ نے

مجھے۔"

"تم اپنے قلم کا کبھی سودا نہ کرنا اسید!" س

وہ مجھ سے عہد لے رہے تھے۔ میں اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ ایک عہد میں نے احمد سے کیا تھا اور اب دوسرا عہد آفتاب حسین سے کر رہا تھا یہ جانے بغیر کہ اسے نبھانا کتنا مشکل ہوگا کہ میں ہانپ ہانپ جاؤں گا میں نے جو انہیں پہلی نظر میں پسند کیا تھا اور میں نے شاید ان سے نفرت بھی کی تھی لیکن میں جو ان کا کوئی بھی نہیں تھا جب انہوں نے آخری سانس لی تھی تو ان کا سر میری گود میں تھا اور سامنے بیٹھے دادا مسلسل یا سلام کا ورد کر رہے تھے اور نہ جانے کیا کیا پڑھ کر ان پر پھونک رہے تھے۔ آخری لمحے انہوں نے آنکھیں کھول کر پہلے مجھے اور پھر دادا کی طرف دیکھا تھا ان کے لبوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی تھی اور پھر انہوں نے آنکھیں بند کرلیں دادی کہتی تھیں:

"بیماریاں انسان کے گناہوں کو جھاڑ دیتی ہیں اور پھر توبہ کرنے والے کی توبہ قبول ہو جاتی ہے جب وہ سچے دل سے توبہ کر لے۔"

میرا دل چاہ رہا تھا میں دھاڑیں مار مار کر روؤں لیکن مجھے ابھی خود کو سنبھالنا تھا میں نے آہستگی سے ان کا سر تکیہ پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دادا ان کی نبض دیکھ رہے تھے جب میں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کمرے سے باہر نکلا لیکن جانے والا جا چکا تھا۔ اپنے آخری چار دنوں میں جب میں ان کے پاس رہا انہوں نے مجھ سے اپنے متعلق بہت سی باتیں کیں تھیں۔ انہوں نے مجھے فاطمہ کا بتایا تھا اور کہانی بند لفافے میں مجھے دی تھی کہ یہ میں فاطمہ کو دے دوں۔ انہوں نے فاطمہ کا نمبر لکھواتے ہوئے تاکید کی تھی کہ میں ان کی موت کی اطلاع فاطمہ کو ضرور دوں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی کہا تھا کہ تم بس کبیر کو فون کر دینا وہ سب سنبھال لے گا۔ میں نے کبیر کو بتا دیا تھا کہ میں انہیں گھر لا رہا ہوں۔ ایمبولینس میں میں ان کے پاس بیٹھا تھا ایک بار انہوں نے کہا تھا:

"میرا جی چاہتا ہے تمہیں کسی روز اپنے گھر لے جاؤں تمہیں ہنی بابا کا، نایاب کا کمرہ اور ان کی تصاویر دکھاؤں، تم دیکھنا اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی سب کچھ ویسا ہی ہے تمہیں لگے گا کہ جیسے نایاب ابھی ابھی کمرے سے باہر نکلا ہو، میں نے اس کے تکیے کے

پاس اوندی پڑی کتاب کو بھی کبھی سیدھا نہیں کرنے دیا تا کہ جب میں اس کے کمرے میں
جاؤں تو لگے جیسے ابھی پڑھتے پڑھتے وہ اٹھ کر باہر گیا ہو۔"

اور اب میں ان کے گھر جا رہا تھا لیکن اس طرح کہ میں انہیں ان کے گھر لے
جا رہا تھا۔ ان کے گھر کے باہر بہت سارے لوگ جمع تھے ان کے اخبار کے ورکرز صحافی اور نہ
جانے کون کون، کبیر نے لان میں ٹینٹ لگوا دیئے تھے اندر لاؤنج میں بھی سب تیار تھا ہم
انہیں لاؤنج میں لے گئے وہاں دادی اور پھوپھی کے علاوہ اس وقت صرف پاس پڑوس کی
چند خواتین تھیں۔ غالباً دادا پھوپھی کو بھی ساتھ لائے تھے۔ باہر تینوں بھائیوں کے ساتھ وہ
خود موجود تھے ہم انہیں اندر چھوڑ کر باہر آئے تو میں نے دیکھا۔

صرف دادی تھیں جو رو رہی تھیں لوگ آہستہ آہستہ اکٹھے ہونے لگے تھے۔ خود
بخود ہی لوگ دادا ابا اور میرے پاس آنے لگے تھے۔ جو بھی آتا وہ دادا اور ابا کو پرسہ دیتا
میرے ساتھ افسوس کرتا لوگوں نے خود ہی تصور کر لیا تھا کہ ہم ان کے اپنے ہیں ان کے
جنازے کو کندھا دینے والے بھی ہم چاروں بھائی تھے وہاں آنے والے کئی صحافیوں نے
مجھے پہچان لیا۔

"ارے اسید! آپ؟"

"اچھا تو آفتاب حسین آپ کے کوئی عزیز تھے کوئی قریبی عزیز، تب ہی آپ کی
تحریروں میں ان کی تحریر کا رنگ جھلکتا تھا۔"

"سچ بتایئے! کہیں آپ کے پردے میں وہ خود تو نہ تھے اور ہاں یہ یکا یک
انہوں نے اخبار کیوں بند کر دیا؟"

مجھے ایسی باتوں سے کوفت ہو رہی تھی اندر ایک شخص کی میت پڑی ہے اور یہ لوگ
پتا نہیں کیسی غیر متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ان کا حلقہ احباب وسیع تھا آنے والوں میں ہر
طرح کے لوگ تھے۔ جھنڈے والے گاڑی میں بیٹھ کر آنے والے بھی تھے، سیاست دان
بھی تھے اور بیوروکریٹ بھی، بزنس مین بھی تھے اور صحافی بھی۔

لیکن سب کے سب مصنوعی لوگ تھے، میں خاموشی سے ایک طرف بیٹھا اپنے
دل میں اس دکھ کو پھیلتے محسوس کرتا رہا جو کسی اپنے کے بچھڑنے کے بعد ہوتا ہے۔

اندر لاؤنج میں بھی عورتیں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ ماڈرن اور قیمتی ملبوسات میں لپٹی
میک اپ کے ساتھ اور ہلکی پھلکی جیولری پہنے وہ یہاں پرسہ دینے آئی تھیں۔ یہ سب آفتاب
حسین کی ملنے والیاں تھیں اندر بھی سب خواتین دادی کو ہی افسوس کر رہی تھیں۔

تیسرے دن لوگوں کی آمد کا سلسلہ موقوف ہوا تو میں نے کبیر سے کہا۔

"اب کل سے ہم نہیں آئیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" کبیر چونکا۔

"اب کس نے آنا ہے اور یہ مکان تم جانتے ہو نا کہ۔۔۔۔۔"

"جی۔"

میں کھڑا ہو گیا اس وقت وہاں صرف ابا، میں اور کبیر تھے۔ اندر لاؤنج میں دادی
تھیں اور شاید کوئی آس پاس کے گھروں سے آئی ہوئی خواتین ہوں۔

"ابا! آپ ٹیکسی دیکھیے میں دادی کو لاتا ہوں۔"

کبیر نے میری طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ہلکی سرخی تھی وہ نہ جانے کب
سے شاید حسین احمد کے زمانے سے ہی ان کے ساتھ تھا اسے آفتاب حسین کے یوں اس
طرح چلے جانے کا دکھ تھا میں نے کئی بار ان تین دنوں میں اسے آنسو پونچھتے دیکھا تھا۔

"انہیں میرا ڈرائیور چھوڑ آتا ہے اسید! آپ کچھ دیر رک جائیں آفتاب حسین کی
خواہش تھی کہ ان کی ذاتی چیزیں آپ دیکھ لیں دو تین روز تک سب نیلام ہو جائیں گی اور پھر
کل تک میں سب ملازمین کو فارغ کر دوں گا۔"

"یہ لوگ کہاں جائیں گے شاید برسوں سے ان ہی سرونٹ کوارٹرز میں رہ رہے
ہیں؟" ابا نے بے ساختہ کہا۔

"ایک غریب دوسرے غریب کی مجبوریوں کو سمجھ سکتا ہے۔" کبیر کے لبوں پر
افسردہ سی مسکراہٹ ابھری۔

"عبدالرحمٰن صاحب! آفتاب حسین نے سب کے لیے بندوبست کر دیا تھا
بڑے دل والے اور بڑے آدمی تھے انہیں سب کا احساس تھا۔"

کبیر انہیں تفصیل بتا رہا تھا میں ہولے ہولے قدم اٹھاتا ڈرائنگ روم سے باہر

نکلا اور ٹی وی لاؤنج میں چلا گیا۔ نیچے کارپٹ پر دادی کے پاس ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے
ہوئے خاتون بیٹھی تھی اور خاتون کے برابر ایک کم عمر سی لڑکی ادھر ادھر لاؤنج میں نظریں دوڑا
رہی تھی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے انہیں پکارا تو دادی اور وہ خاتون دونوں ہی مجھے
دیکھنے لگیں خاتون کے آنکھوں کے گوشے نم تھے اور ان کی آنکھوں کی سرخی شدت گریہ کا پتہ
دے رہی تھی۔

''آجاؤ بیٹا!'' دادی نے دوپٹے کے پلو سے شاید اپنی نم آنکھوں کو پونچھا تھا۔

''دادی! میں آپ کو لینے آیا ہوں۔''

''اچھا۔'' وہ کھڑی ہوگئیں اور پھر قریب بیٹھی خاتون کی طرف دیکھا۔

''بیٹا! یہ فاطمہ ہے۔ بتا رہی تھیں کہ تم نے فون کر کے اطلاع دی تھی۔ تابی بیٹے
کی؟'' میں چونکا۔

ان تین دنوں میں ایک بار بھی فاطمہ کا خیال میرے ذہن میں نہیں آیا تھا مجھے تو یہ
بھی نہیں پتا تھا کہ وہ آج آئی تھیں یا اسی روز آگئی تھیں اور پھر ان کی طرف دیکھتے دیکھتے مجھے
ایک اور بات بھی یاد آگئی کہ ان کی ایک امانت بھی تھی میرے پاس۔

میں یکدم دو قدم آگے بڑھا۔

''آپ کی ایک امانت ہے میرے پاس۔'' انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان
کی آنکھیں نم تھیں اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

''آپ کہاں ٹھہری ہوئی ہیں مجھے ایڈریس دیجئے گا میں وہاں پہنچا دوں گا۔''

انہوں نے پھر سر ہلا دیا تھا۔

''آپ ابھی یہاں ٹھہریں گی؟''

''دو تین روز اور۔۔۔'' ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی اور وہ پہلی بار بولی
تھیں۔

''تم۔۔۔! آپ۔۔۔! اسید عبدالرحمٰن ہو؟''

''جی۔۔۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نیچے کارپٹ پر بیٹھی لڑکی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی

تھی۔ یہ فاطمہ ہیں ان کے چہرے کے جمال پر آج بھی نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی اور آفتاب حسین
نے اس چہرے کے بعد کسی دوسرے چہرے کو دیکھنے کی خواہش نہیں کی تو بجا تھا اور اس کی
رفاقت کی خواہش کے بعد کسی اور کی رفاقت کو ان کا جی نہ چاہا تھا تو کچھ غلط تو نہیں تھا۔

''اسید۔۔۔!'' ابا نے مجھے آواز دی تو میں نے ان کی طرف دیکھا۔

''تم جا رہے ہو اسید۔۔۔!'' بے اختیار انہوں نے پوچھا۔

''میں ابھی آتا ہوں۔ ذرا دادی جان کو چھوڑ آؤں۔''

دادی جان فاطمہ سے ملیں اور لڑکی کی پیشانی چوم کر دعا دی۔

''میں جانے سے پہلے آپ سے ملنے آؤں گی۔'' لڑکی ان کا ہاتھ تھام کر کہہ رہی
تھی میں دادی کو پیچھے آنے کا کہہ کر مڑ گیا اور جب میں واپس آیا تو فاطمہ لاؤنج میں لگی اس
بڑی سی تصویر کے پاس کھڑی تھی جو غالباً نایاب کی تھی میں بھی ہولے ہولے چلتا ہوا اس
تصویر کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''یہ نایاب کی تصویر ہے نا۔'' فاطمہ نے مجھے مڑ کر دیکھا۔

میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے اسے پہچاننے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔

''اور تم۔۔۔'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر مجھے دیکھا۔

''آفتاب نے بتایا تھا جب چند ماہ پہلے وہ آغا خان میں مجھے ملے تھے کہ تم نایاب
سے بہت مشابہ ہو۔''

''ہاں وہ ہی کہتے تھے۔'' میں نے افسردگی سے کہا اور نایاب کی تصویر کو غور سے
دیکھنے لگا، واقعی کہیں کہیں مشابہت تو تھی۔

''آفتاب صحیح کہتے تھے بہت مشابہت ہے۔'' ان کے لبوں پر ایک افسردہ سی
مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کب پہنچی؟''

''میں جنازے سے پہلے پہنچ گئی تھی۔''

ان کے لبوں کے گوشے کپکپانے لگے تھے تب ہی کبیر ہولے سے کھنکارتا ہوا اندر
آ گیا وہ مجھے اندر جانے کا کہہ کر خود پورچ میں ہی رک کر مالی یا چوکیدار سے بات کرنے

لگا تھا۔

"یہ فاطمہ ہیں۔" میں نے تعارف کروایا تو کبیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے فاطمہ کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا شاید وہ جانتا تھا یا شاید اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ فاطمہ مڑ کر پھر تصویر کو دیکھنے لگی تھی اور کارپٹ پر بیٹھی لڑکی بھی اٹھ کر اس کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔

"اسید۔۔۔۔!" کبیر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"آفتاب صاحب کی خواہش تھی کہ تم ان کی ذاتی اشیاء میں سے کچھ لینا چاہو تو لے لو۔"

"میں۔۔۔ مجھے بھلا کیا لینا ہے۔۔۔۔" میرے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

"ان کی مراد اپنے کاغذات یا کتابوں وغیرہ سے تھی تم ان کا کمرہ دیکھ لو انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کے بعد میں تمہیں نایاب اور ہنی بابا کا کمرہ دکھاؤں۔"

اور مجھے یاد آیا انہوں نے مجھ سے ایک بار خواہش کی تھی کہ میں ان کے ساتھ چلوں وہ مجھے نایاب اور ہنی بابا کا کمرہ دکھائیں گے۔

فاطمہ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگی تھی۔ "کیا میں بھی اسید کے ساتھ چل سکتی ہوں۔"

"یقیناً۔۔۔۔"

"یہ نایاب کا کمرہ ہے۔" کبیر نے کمرہ کھولا مجھے لگا جیسے میں بہت بار اس کمرے میں آیا ہوں کتنی جزئیات کے ساتھ انہوں نے سب کچھ بتایا تھا تکیے کے پاس اوندھی پڑی کتاب۔۔۔۔

"میں نے یہ کتاب کبھی سیدھی نہیں کی اتنے سالوں میں پتا ہے کیوں اس لیے کہ میں جب اس کے کمرے میں آؤں تو مجھے لگے جیسے ابھی ابھی وہ اس کمرے سے گیا ہے اور بس ابھی آجائے گا۔" ایک بار انہوں نے بتایا تھا۔

آدمی بھی خود کو کیسے کیسے دھوکا دیتا ہے؟ جھوٹی تسلیوں سے خود کو سنبھالے رکھتا ہے حالانکہ آخری سفر پر جانے والے بھلا کب لوٹ کر آتے ہیں۔ کمپیوٹر ٹیبل، شیلف میں لگی ہوئی میڈیکل کی کتابیں، دیوار پر نایاب حسین اور آفتاب حسین کی تصاویر، ایک گروپ فوٹو

تھا میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ حسین احمد ہی ہوں گے۔ باوقار سے، لبوں پر شفیق سی مسکراہٹ لیے وہ کچھ آفتاب حسین سے مشابہ تھے۔ شاید اتنی عمر میں وہ بھی ایسے ہی لگتے اور اب پتا نہیں ان کی کیا عمر ہوگی؟" میں نے سوچا۔

"دیکھنے میں تو وہ چالیس پینتالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے لیکن پچاس سال سے زیادہ کے نہیں ہوں گے وہ۔۔۔۔"

میں کبیر کے ساتھ ان کے کمرے میں آیا ویسا ہی سادا سا بیڈ روم جیسا نایاب کا تھا دیوار کے ساتھ بنی شیلف میں کتابیں، دائیں طرف دیوار پر وہی گروپ فوٹو اور اسکے آس پاس نایاب حسین کی ایک فل سائز تصویر، ٹیبل پر کچھ فائلیں جن میں غالباً ان کی تحریریں تھیں۔ شنیل کے تکیے پر گڑھا سا پڑا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی سو کر اٹھا ہو۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر ایک دو ڈائریاں۔۔۔۔

بالکل غیر ارادی طور پر میں نے ایک ڈائری اٹھا کر اسے کھولا اس میں کارڈ سائز کچھ تصاویر نیچے گر گئیں۔ یہ یونیورسٹی کے کسی فنکشن کے گروپ فوٹو تھے میں نے تصاویر فاطمہ کی طرف بڑھا دیں جو بھری بھری آنکھوں کے ساتھ ساکت کھڑی تھی۔

"یہ یونیورسٹی کی تصاویر ہیں یہ آفتاب حسین یہ ہیں، یہ صدف یہ۔۔۔۔"

وہ بتا رہی تھی کہ کبیر کے فون کی بیل ہوئی وہ معذرت کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

فاطمہ تصاویر دیکھ رہی تھی جب میں نے دوسرے ڈائری کھولی جو صفحہ میرے سامنے تھا اس پر پہلا جملہ تھا۔

"اور پتا نہیں کہ میں فاطمہ کے بغیر زندگی کیسے گزاروں گا؟"

میں نے یکدم ڈائری فاطمہ کی طرف بڑھا دی۔

"سوری۔۔۔۔ میں چند لفظ پڑھنے کا مجرم ٹھہرا، یہ آپ کی امانت ہے چاہے تو ضائع کر دیں چاہے تو رکھ لیں۔"

فاطمہ نے بنا کچھ کہے ڈائری لے لی اور پرس میں رکھ لی اور تصویریں میری طرف بڑھا دیں۔

"آپ رکھنا چاہیں تو رکھ لیں۔"

"نہیں میرے پاس ہیں۔"

"وہ جیسے تھک کر بیڈ کے کنارے پر ٹک گئیں۔

"آفتاب کی بڑی خواہش تھی کہ کبھی میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلوں لیکن میں سوچتی تھی کہ مجھے نہیں جانا چاہیے میں نہیں چاہتی تھی کہ اس گھر کا خواب میری آنکھوں میں اتر جائے جہاں میں نے نہیں آنا۔"

وہ ہولے ہولے بول رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ:

"کتنا بڑا المیہ ہے کہ کبھی کبھی جسے جہاں ہونا ہوتا ہے وہ وہاں نہیں ہوتا اور شاید قدرت اس طرح اپنے بندوں کو آزماتی ہے۔" تب ہی کبیر اندر آ گیا۔

"آپ کیا لینا چاہیں گے اسید!"

یہ تصاویر آفتاب اور ان کے بھائی اور بابا کی اور ان کا غیر مطبوعہ مواد۔۔۔۔میں کوشش کروں گا کہ کبھی ان کی کہانیوں کا مجموعہ چھپوا دوں۔"

کبیر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"یہ کتنی عجیب بات ہے اسید عبدالرحمٰن! آفتاب حسین صاحب تمہیں تم سے زیادہ جانتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اسید تصویریں ہی لے گا اور میرا تو کوئی وارث نہیں ہے جس کے لیے یہ تصاویر ایسے ہی قیمتی ہوں جیسی میرے لئے ہیں اگر اس نے تصاویر نہ لیں تو پھر انہیں جلا دینا۔"

میں عجیب سی کیفیت میں گھرا کبیر کی بات سن رہا تھا۔ جب ذرا سے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"اور آفتاب حسین نے کہا تھا کہ ان کی کتابیں آپ کے دادا جان کو گفٹ کر دی جائیں۔ وہ بہت باذوق اور قدردان شخص ہیں اور اگر وہ لینے سے انکار کریں تو کسی لائبریری کو ڈونیٹ کر دینا۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ فاطمہ نے ملتجی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"پلیز مرے ہوئے شخص کی خواہش کو ٹھکراتے نہیں۔"

اور میں بنا کچھ کہے کمرے سے باہر نکل آیا۔ فاطمہ وہاں ہی کھڑی رہی میں لاؤنج میں آ کر کچھ دیر ٹھہر گیا۔ وہ لڑکی ایک پینٹنگ کے پاس کھڑی تھی اسے بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھی مجھے دیکھ کر میرے قریب آ گئی۔

"آپ وہی اسید عبدالرحمٰن ہیں نا جن کے آرٹیکل "طلوع" میں چھپتے ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا میں اب جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتا تھا مجھ پر یکدم گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔

"کل تک یہ گھر آباد تھا یہاں لوگ چلتے پھرتے تھے اور اب۔۔۔۔"

"یہاں اس ٹیبل پر بیٹھ کر نایاب، آفتاب حسین، ہنی بابا نے کھانا کھایا ہوگا پھر پہلے نایاب پھر نینا ماما اور پھر ہنی بابا ایک ایک کر کے چلے گئے۔ آفتاب حسین اکیلے رہ گئے اس گھر میں یہاں اس صوفے پر کبھی وہ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہوں گے، کبھی یہاں کھڑے ہو کر انہوں نے نایاب کی تصویر کو گھنٹوں دیکھا ہوگا اور اب یہاں کل کوئی اور چلتا پھرتا ہوگا کسی اور کی ہنسی یہاں گونجے گی اور بس یہ ہے زندگی کا مال۔۔۔۔"

میں نے دیگر فرنیچر، فل سائز ٹی وی اور دوسری اشیاء کو دیکھا۔

"اس سب کے لیے جو یہاں ہی رہ جاتا ہے انسان کتنی بد دیانتی کرتا ہے اپنے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ۔"

یکایک مجھے لگا لڑکی کی نظریں مسلسل مجھ پر ہیں میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

"آپ بہت اچھا لکھتے ہیں، بہت بے باکی سے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں، ماما کو بھی آپ کی تحریریں پسند ہے، مجھے بہت شوق تھا جرنلسٹ بننے کا لیکن ماما نہیں چاہتی تھیں کہ میں جرنلسٹ بنوں حالانکہ وہ خود۔۔۔۔ آپ کو تو پتا ہوگا۔ انہوں نے جرنلسٹ میں ماسٹر کیا تھا لیکن پاپا نے نہ تو کبھی انہیں لکھنے کی اجازت دی اور نہ کبھی کسی اخبار کو جوائن کرنے کی حالانکہ ماما میں لکھنے کی صلاحیت تھی بلکہ کالج یونیورسٹی میں وہ شاعری بھی کرتی تھیں۔"

وہ بہت باتونی سی تھی گندمی رنگ، بڑی بڑی خوبصورت بے تحاشہ چمکتی آنکھیں، متناسب قد۔۔۔

میری نظر غیر ارادی طور پر پھر اس کی طرف اٹھی۔ بلا کی معصومیت اور کشش تھی
اس میں۔

"میں آمنہ ہوں مما نے بتایا ہوگا آپ کو ان کی بیٹی۔۔۔۔"

مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور تعارف کروایا
میں نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

'اور پتا ہے مجھے بھی بہت شوق ہے لکھنے کا اور میری کہانیاں خواتین کے ڈائجسٹ
میں چھپتی ہیں آمنہ شاہ کے نام سے آپ نے کبھی پڑھیں؟"

"نہیں، میں خواتین کے ڈائجسٹ نہیں پڑھتا۔"

"پڑھنی چاہییں۔" اس نے دانشمندی سے سر ہلایا۔

"جو پڑھتے ہیں وہ فائدے میں رہتے ہیں خواتین کے ڈائجسٹوں میں جو کہانیاں
چھپتی ہیں وہاں سے آئیڈیے لے کر بلکہ چرا کر ٹی وی کے لیے لکھنے میں سہولت ہو جاتی
ہے۔"

"بدقسمتی سے میں ٹی وی نہیں دیکھتا۔" میں نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو
چھپایا۔

"ویری سیڈ، خیر کبھی آپ کراچی آئے نا تو میں آپ کو اپنی کہانیاں پڑھاؤں گی۔"

"آپ کے پاپا نے آپ کو منع نہیں کیا لکھنے سے؟" میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

فاطمہ ابھی تک آفتاب حسین کے بیڈروم میں تھیں جبکہ کبیر لاؤنج سے باہر چلا گیا
تھا شاید اس کا ڈرائیور ابا اور دادی کو چھوڑ کر واپس آگیا تھا۔

"نہیں بلکہ پاپا تو بہت خوش ہوتے ہیں میرا افسانہ دیکھ کر اور پھر اس کی تعریف
پڑھ کر۔"

"اور آپ نے پوچھا نہیں کہ کیا تضاد ہے مما کو اجازت نہیں بیٹی کو ہے؟"

"نہیں۔۔۔۔"

"لیکن وقت وقت کی بات ہوتی ہے، وقت کے ساتھ آدمی کی سوچ بدل جاتی
ہے جیسا کہ میں بالکل انگلش لٹریچر میں ماسٹر کرنا نہیں چاہتی تھی اور جب میں پڑھنے لگی تو

مجھے لگا کہ مجھے اسی میں ماسٹر کرنا چاہیے تھا۔"

"آپ ماسٹر کر رہی ہیں؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ
فرسٹ ایئر یا سیکنڈ ائیر کی طالبہ ہوگی۔

"ہاں میرا فائنل ائیر ہے۔"

تب ہی فاطمہ آگئیں میں نے دیکھا ان کی پلکیں پھر بھیگی سی تھیں شاید وہاں
اکیلے کمرے میں وہ پھر روئی تھیں۔

میں نے ان کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اور دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"آپ یہاں کچھ دیر اور ٹھہرنا چاہیں گی؟"

"نہیں چلتی ہوں اب، ٹھہر کر کیا کرنا ہے یہ گھر کون خرید رہا ہے۔"

"معلوم نہیں، لیکن میرا خیال ہے انہوں نے کسی ادارے کو ڈونیٹ کر دیا تھا کبیر
صاحب کو سب تفصیل معلوم ہے آپ پتا کرنا چاہیں تو۔۔۔۔"

"نہیں میں نے تو یوں ہی پوچھا تھا۔"

پورچ میں کبیر صاحب سے ملاقات ہوئی وہ اپنے ڈرائیور اور چوکیدار سے کچھ
بات کر رہے تھے۔

"او کے۔۔۔۔ شاید ایک دو ملاقاتیں اور ہوں آپ سے۔"

کبیر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔

فاطمہ گیٹ کے ساتھ کھڑی سفید کرولا کی طرف بڑھیں پھر گاڑی کے دروازے
پر ہاتھ رکھے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"آیئے۔۔۔ اسید! ہم آپ کو ڈراپ کر دیتے ہیں۔"

"تھینک یو میم! میں چلا جاؤں گا۔"

"تکلف مت کریں آیئے! پھر مجھے آپ سے وہ امانت بھی تو لینی ہے آپ کہاں
تکلیف کرتے پھریں گے۔"

"وہ کیا ہے۔ آفتاب انکل نے کیا دیا مام کو؟" آمنہ نے پوچھا۔

میں ڈرائیور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور اسے پتہ سمجھا رہا تھا میں نے مڑ

کر پیچھے دیکھا۔

''کوئی کہانی ہے شاید انہوں نے کسی کی فرمائش پر لکھی ہے ان کی آخری کہانی ایک طویل گیپ کے بعد انہوں نے لکھی ہے۔''

''اچھا ماما! کیا میں وہ کہانی پڑھ سکتی ہوں؟'' پتا نہیں فاطمہ نے جواب کیا دیا تھا۔ میں نے سنا نہیں تھا میں ایک بار پھر آفتاب حسین کے متعلق سوچنے لگا تھا۔

''میں نے ان سے نفرت کی، ان سے دور رہنے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن نہ تو میں ان سے نفرت کر سکا اور نہ ہی ان سے دور رہ سکا۔''

آج اور کل کے ہر اخبار میں ان کی موت کے متعلق خبر چھپی تھی اکثر کالم نگاروں نے اپنے اپنے کالموں میں ان کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا تھا۔

ہر ایک کی اپنی رائے، اپنا خیال تھا۔

اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں ان کے متعلق کیا رائے رکھتا ہوں تو شاید میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں۔

''یہاں سے کدھر جانا ہے؟''

''بس یہاں ہی ایک سائیڈ پر روک کر پارک کر لیں اندر گلی میں گھر ہے اور وہاں گاڑی کا جانا مشکل ہے۔''

ڈرائیور نے گاڑی روڈ سے ہٹا کر ایک سائیڈ پر کھڑی کر دی۔

''تھینک یو میڈم!'' میں نے فاطمہ کا شکریہ ادا کیا۔

''آپ پلیز پانچ منٹ ویٹ کریں میں آپ کی امانت لاتا ہوں۔''

''کیوں کیا آپ ہمیں اپنے گھر تک نہیں لے جانا چاہتے؟'' آمنہ شوخ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی میں یکدم شرمندہ ہو گیا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ میرے غریب خانے پر آنا پسند نہ کریں۔''

''یہ آپ کی سوچ ہے ویسے آپ کو مان لینا چاہیے کہ آپ کو ہمیں گھر چلنے کو کہنا چاہیے تھا۔''

''سوری مس! اب چلیں آپ، گو غریب خانہ اس قابل نہیں کہ۔۔۔۔''

''ہم بھی کوئی جدی پشتی دولت مند لوگ نہیں ہیں، ہمارا تعلق بھی متوسط گھرانے سے ہی ہے اور اب بھی ہم رئیس نہیں ہیں۔ یہ گاڑی میرے بھائی کی ہے جو دیارِ غیر میں نہ جانے کتنی محنت کر کے اپنی فیملی کو سہولتیں فراہم کر رہا ہے۔''

فاطمہ گاڑی سے باہر آ گئی۔ میں مزید شرمندہ ہو گیا اور ان کے ساتھ چلنے لگا۔ دادی انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

''ارے یہ اچھا کیا بیٹا! کہ تم اسید کے ساتھ آ گئیں وہاں تو تم سے ڈھنگ سے بات بھی نہ ہو پائی تھی، اللہ آفتاب بیٹے کو جنت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین''

''اور یہ بزرگ بھی خوب ہوتے ہیں لمحوں میں اجنبیوں سے بے تکلف ہو کر رشتے جوڑ لیتے ہیں۔''

دادی بھی ایسی ہی تھیں اور ایک میں تھا مجھے تو کسی سے بے تکلف ہونے میں بہت وقت لگتا تھا انہیں دادی کے پاس چھوڑ کر میں بیٹھک میں آیا اور اپنی الماری سے پیکٹ نکالا۔ جو آفتاب حسین نے مجھے دیا تھا۔

معید فوراً ہی پیپسی کولا گلاسوں میں ڈال کر لے گیا۔ معید اور سعید دونوں ہی کچن اور گھر کے کاموں میں دادی کا ہاتھ بٹاتے تھے جبکہ مجھے ذرا بھی ان کاموں سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ دادا بھی اکثر کچن میں دادی کے پاس بیٹھے کبھی انہیں پیاز کاٹ کر دے رہے ہوتے، کبھی آلو اور سبزی کاٹی جا رہی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دادی پر اس عمر میں بہت ذمہ داریاں پڑ گئی تھیں۔ پھوپھی کا گھر نزدیک تھا وہ بھی کبھی کبھی آ کر ہاتھ بٹا جاتیں خاص طور پر جب دادی بیمار ہوتیں، ان کے تین بچے تھے دو بیٹیاں ایک بیٹا، بڑی بیٹی تو آمنہ کی عمر کی ہی ہو گی یا کچھ کم۔ بی اے کی طالبہ تھی اس کی وجہ سے بھی دادی کو آسانی ہو گئی تھی وہ جب بھی فارغ ہوتی دادی کے پاس آ جاتی۔

''سعید بیٹا! ذرا عاشی کو بلا لو کہنا مہمان آئے ہیں۔'' میں نے صحن میں دادی کی آواز سنی اور ساتھ ہی فاطمہ کی آواز آئی۔

''پلیز دادی جان! کوئی تکلف وغیرہ مت کریں۔''

پتا نہیں دادی نے کیا کہا تھا میں نے سنا نہیں اور واپس بیٹھک میں آ گیا۔ سعید
عاشی کو بلا لایا تھا اور جب کچھ دیر بعد فاطمہ اور آمنہ جا رہی تھیں تو میں نے دیکھا عاشی اور
آمنہ میں اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی بلکہ ایک دوسرے سے ایڈریس اور فون نمبر کا تبادلہ بھی
ہو رہا تھا۔

”یہ لڑکیاں بھی بس۔۔۔۔اب بھلا ایک کراچی میں رہنے والی لڑکی اور ایک
لاہور کی لڑکی ایک دوسرے سے دوستی کر کے کیا کریں گی۔“

میں انہیں گاڑی تک چھوڑنے آیا عاشی بھی نئی نئی دوستی نبھانے کو ساتھ تھی وہ
دونوں آگے آگے جا رہی تھیں جبکہ فاطمہ اور میں کچھ پیچھے تھے۔

”آفتاب نے کبھی آخری دنوں میں میرے متعلق کوئی بات کی؟“ انہوں نے کس
قدر جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ آپ کی بہت تعریف کرتے تھے۔“ میں نے ایک نظر انہیں دیکھا۔

”آپ کی ذہانت کی، آپ کی سوچ کی، آپ کے خیالات کی، مرنے سے چند
منٹ قبل انہوں نے نایاب اور ہنی بابا کو یاد کیا تھا مجھے کہا تھا کہ میں ان کے ہنی بابا کے لیے
ضرور دعا کیا کروں اور مجھے کہا تھا اگر کبھی آپ سے ملاقات ہو جائے تو آپ سے بھی
درخواست کروں کہ ان کی اور ہنی بابا کی مغفرت کی دعا کریں کہ ان کے لیے تو دعا کرنے والا
بھی کوئی نہیں ہے۔“

اور پھر گاڑی تک خاموشی رہی واپس آتے ہوئے عاشی مسلسل بول رہی تھی۔

”آمنہ بہت اچھی ہے آپ کو نہیں پتا اسید بھائی! کہ مجھے آمنہ سے مل کر کتنی خوشی
ہوئی ہے، پتا ہے وہ بہت اچھے افسانے لکھتی ہے میں نے کئی افسانے پڑھے ہیں ان کے
سچی۔۔۔۔اور فاطمہ آنٹی بھی بہت اچھی ہیں انہوں نے میری بنائی ہوئی چائے کی بہت
تعریف کی لیکن وہ جل ککڑ معید فوراً بول اٹھا کہ دم تو میں نے کی تھی اس نے تو صرف دودھ
گرم کیا تھا میری تعریف سے ہمیشہ جل جاتا ہے۔“

سعید، عاشی اور معید یوں ہی ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور
تینوں میں دوستی بھی بہت تھی اور پھر کئی دن گزر گئے میں نے دفتر جانا شروع کر دیا تھا مجھے کچھ

نہیں آتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ کیا میں وہ سب کچھ کر سکوں گا جس کی خواہش آفتاب حسین
نے کی تھی۔ نہیں یہ میرے بس کی بات نہیں اخبار نکالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں اور میرے جیسا
بندہ جس کا کوئی مددگار نہ ہو وہ بھلا کیا کر سکتا ہے۔ میں کبیر سے کہوں گا کہ میں یہ ذمہ داری
نہیں اٹھا سکتا تم مہربانی کرو اور یہ مکان بھی کسی اور ادارے کو ڈونیٹ کر دو اور مجھے معاف
کرو۔ میں فیصلہ کر کے کئی دنوں کے بعد ریلیکس ہوا تو مجھے اس آرٹیکل کا خیال آیا جسے میرے
ایڈیٹر نے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا میرا خیال ہے مجھے دوسرے اخبارات سے بھی رابطہ کرنا
چاہیے اس روز اور اس سے اگلے روز تک میں نے کئی اخبارات سے بات کی لیکن سب نے
اسے چھاپنے سے انکار کر دیا۔

”آپ کیا چاہتے ہیں کہ ہمارے اخبار کے دفتر کو آگ لگا دی جائے اور یہاں
توڑ پھوڑ کی جائے۔“ ایک صاحب نے کہا۔

ایک اور ایڈیٹر نے جواب دیا۔ ”صاحب! ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں
ہمیں ان کا مستقبل عزیز ہے۔“

میں بے حد مایوس سا گھر آیا تھا اور صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر بازو کا تکیہ بنائے
لیٹ گیا۔

”اور یہ کس قدر مشکل ہے ہر آدمی کی اپنی ترجیحات ہیں اور اپنے مفادات
ہیں۔ میں نے یوں ہی یہ خواہ مخواہ اتنی بڑی تحقیق کی، ہاں اگر میرا اپنا اخبار ہوتا تو میں اپنی
مرضی سے جو چاہے چھاپ لیتا۔“

ایک لحہ کے لیے میرے دل میں خیال آیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے یہ
خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ نہیں یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔

”اسید۔۔۔۔!“ دادا بے حد چپکے سے آ کر میرے پاس بیٹھے تھے میں ایک دم
اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”دادا جان آپ۔۔۔۔!“

”تم کچھ پریشان ہو بیٹا۔۔۔۔!“

”ہاں۔۔۔۔نہیں تو۔۔۔۔“ وہ ذرا سا مسکرائے۔

"مجھے بتاؤ! شاید مجھ بڈھے کی عقل میں کوئی بات سما جائے۔"

میں چند لمحے دادا کے شفیق چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر میں نے وہ سب جو سوچ رہا تھا دادا کو بتا دیا۔

"دادا جان! ہم اتنے بزدل کیوں ہیں ہم حقائق سے کیوں منہ پھیر لیتے ہیں۔"

"مجبوریاں ہوتی ہیں بیٹا۔۔۔۔!"

"کیسی مجبوریاں۔۔۔۔؟" میں نے ایک شکوہ بھری نظر ان پر ڈالی۔

"کئی قسم کی بیٹا! ہر شخص اپنی مجبوریوں کے حصار میں قید ہوتا ہے، ہو سکتا ہے جن لوگوں کو تم بے نقاب کرنا چاہتے ہو وہ اتنے پاورفل ہوں کہ لوگ انکی طاقت سے ڈرتے ہوں کہ وہ انہیں نقصان نہ پہنچائیں۔"

"پھر یہ مجبوری تو نہ ہوئی نا، بزدلی ہوئی۔۔۔۔"

"اپنے اپنے انداز فکر کی بات ہے بیٹا! ہو سکتا ہے ان کے نزدیک یہ بزدلی نہ ہو مصلحت اور عقلمندی ہو۔"

"تو پھر بابا! یہ کالی بھیڑیں۔۔۔۔ کیسے انکی شناخت ہوگی، کیسے ملک کو ان سے بچایا جا سکے گا۔"

"ہاں، یہ بات تو سوچنے کی ہے کہ کیسے ان بھیڑیوں کے ہاتھوں سے اس ملک کو بچایا جائے جو اسے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں؟" انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

"خیر۔۔۔۔" انہوں نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے تھپکایا۔

"تم اپنی سی کوشش کرتے رہو، ضروری تو نہیں تم انہیں بے نقاب کرو کسی اور طرح ان برائیوں کے خلاف لکھ کر جو معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں اپنا فرض ادا کر سکتے ہو۔"

"پتا نہیں دادا جان! مجھے کیا کرنا ہے مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا اور وہ آفتاب حسین کہتے تھے قلم کی حرمت کو کبھی نہ بیچنا۔ کبھی سچ لکھتے ہوئے ڈرنا مت روشنی پھیلاتے رہنا۔"

"اچھے آدمی تھے آفتاب حسین، بہت محبت کرنے والے، ان کے درجات اللہ بلند کرے، بہت کم ملاقاتیں ہوئیں لیکن بہت اپنے اپنے سے لگتے تھے۔ گئے تو یوں لگا جیسے

اپنا بچہ رخصت ہوتا ہے تو دل درد سے بھر جاتا ہے۔" وہ افسردہ سے ہو گئے۔

"دادا جان! آپ کو کیا پتا کہ وہ اچھے آدمی تھے یا برے؟" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"کیوں۔۔۔۔؟ کیا وہ تمہیں برے لگے تھے؟ تمہارے ساتھ کیا برائی کی تھی انہوں نے؟ پھر وہ اگر برے تھے تو تم اتنا روئے کیوں تھے؟ اتنے افسردہ کیوں تھے؟"

"میرے ساتھ تو کوئی برائی نہیں کی انہوں نے۔" میں ٹپٹا گیا۔

"لیکن دادا جان! وہ۔۔۔۔ وہ نہیں تھے جو نظر آتے تھے۔" دادا جان نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کیا تھے وہ۔۔۔۔؟"

"دادا جان۔۔۔۔!" مجھے لگا جیسے میرے دل پر بہت بھاری بوجھ دھرا ہو اور میں بولتا چلا گیا۔ پہلی ملاقات سے آخری لمحے تک دادا خاموشی سے سنتے رہے۔

"میں انہیں پسند نہیں کرتا تھا شاید میں ان سے نفرت کرتا تھا لیکن جب وہ بیمار ہوئے اور جب میں ان کے آخری دنوں میں ان کے پاس رہا تو مجھے لگا جیسے میں ان سے نفرت کر ہی نہیں سکتا۔ ایسا کیوں تھا دادا جان! وہ جھوٹ سے، ریا سے، دھوکے سے، نفرت کرتے تھے۔ پھر بھی وہ یہ سب کچھ کرتے رہے کیوں۔۔۔۔؟"

"کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بنے بنائے راستے پر چلتا ہی چلا جاتا ہے وہ اپنے لیے کوئی الگ راستہ تلاش نہیں کرتا۔ بس جو اس کے بزرگ اس کے لیے راستہ بنا دیتے ہیں وہ اسی پر چل پڑتا ہے۔"

"لیکن اس کا اپنا دماغ اپنی سوچ بھی تو ہوتی ہے دادا جان! وہ خود بھی تو فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ غلط ہے یا صحیح ہے۔"

"ہاں ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کوئی نصب العین ہوتا ہے، زندہ رہنے کا کوئی جواز ہوتا ہے، آفتاب حسین کے پاس نہ زندہ رہنے کا کوئی جواز تھا، نہ زندگی کا کوئی نصب العین تھا۔۔۔۔ نایاب نہیں رہا تھا۔۔۔۔ فاطمہ بھی نہیں تھی تو۔۔۔۔"

دادا جان ان کی وکالت کر رہے تھے۔ یہ آفتاب حسین بھی جادوگر تھے

پورے، کیسے دادا جان اور سب گھر والوں کو اسیر کر گئے تھے۔ یہ وہ محبت تھی جو دادا جان کے لہجے سے جھلک رہی تھی، آفتاب حسین کی محبت، لیکن غلط وہ بھی نہیں کہہ رہے تھے اگر ہنی بابا ان کے لیے کوئی روشن راستہ بناتے تو پھر وہ اس ڈگر پر چل پڑتے لیکن وہ خود اندھیرے رستوں کے مسافر تھے پھر آفتاب حسین کے لیے کوئی روشن راستہ کیسے چھوڑتے۔ وہ اندھیروں کے ہی مسافر بن گئے تھے۔ کبھی کبھی آدمی کو اپنے بڑوں کی غلطیوں کی سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے۔ کاش سب والدین اپنے بچوں کے لیے صراط مستقیم کا ورثہ چھوڑیں اور اگر ایسا ہو جائے تو سب سنور جائیں پھر بھی اگر کوئی بھٹک جائے تو یہ اس کی تقدیر۔۔۔۔ لیکن ہوتا یوں ہے کہ والدین نہ حرام وحلال کا فرق بتاتے ہیں، نہ غلط صحیح کا ادراک دیتے ہیں، نہ جھوٹ سچ کی تمیز سکھاتے ہیں۔

''اور تمہیں چاہیے اسید! کہ وہ عہد جس کا وارث تمہیں آفتاب حسین نے بنایا ہے وہ ضرور پورا کرو۔'' انہوں نے میری سوچوں کا سلسلہ توڑ دیا۔

''لیکن دادا جان یہ ناممکن ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں کچھ بھی ناممکن نہیں میری جان!'' انہوں نے میری بات کاٹی۔

''تم کوشش تو کرو اگر ناکام بھی ہو گئے تو کم از کم روز محشر ان کے سامنے شرمندہ تو نہیں ہو گے کہ تم نے عہد پورا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔'' وہ مسکرا رہے تھے مجھے ان کی باتوں سے بڑا حوصلہ ہوا اور میں نے سوچا کہ کوشش کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر یہ میرا خواب بھی تو تھا بڑا رائیٹر اور بڑا صحافی بننا۔۔۔۔ پتا نہیں تقدیر نے اس لیے آفتاب حسین سے ملایا تھا۔

اور پھر جدوجہد کی ایک لمبی طویل داستان۔ ایک نیا اخبار نکالنا اور اخبارات کے ہجوم میں اس کی پہچان اور شناخت بنانا کوئی آسان کام نہ تھا کئی دفعہ میں بددل ہوا کئی بار ہمت ہاری دی لیکن حوصلہ بڑھانے والے بہت تھے۔ دادا جان میرے سب سے بڑے سپوٹر تھے اور پھر ہولے ہولے اس قافلے میں دوسرے بھی شامل ہوتے گئے۔

صدف۔۔۔۔ احمد کی کزن اور منگیتر۔

اس روز میں احمد کے دادا اور والدہ سے ملنے گیا تھا میری عادت تھی کہ میں مہینے میں

ایک دو چکر ضرور لگاتا تھا اس کے دادا جان اور والدہ خوش ہو جاتے احمد ان کا واحد اثاثہ تھا اور اسے کھو کر وہ کتنے تہی داماں ہو گئے تھے ان کے چھوٹے سے گھر میں بیٹھے ان سے باتیں کرتے ہوئے مجھے احمد بے تحاشہ یاد آتا میری آنکھیں جلنے لگتیں۔

احمد نوید۔

اس کے خواب۔

اس کے آدرش۔

اس روز میں پورے دو ماہ بعد ان کی طرف گیا تھا انہوں نے گلہ نہیں کیا تھا لیکن میں شرمندہ تھا کہ اپنی مصروفیات میں انہیں بھلا بیٹھا تھا۔

''بہت مصروف تھا بابا جان! اخبار نکالنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔''

''آپ اخبار نکال رہے ہیں؟''

یہ صدف تھی جو ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی احمد کی وفات کے بعد تین چار بار اسکے گھر میری ملاقات اس سے ہو چکی تھی۔

''ہاں کوشش کر رہا ہوں۔''

''میری مدد کی ضرورت ہو تو۔۔۔۔''

اور مجھے یاد آیا احمد نے کہا تھا وہ بہت مخلص کارکن ثابت ہو گی۔

''مثلاً آپ کیا مدد کر سکتی ہیں۔''

میں نے یوں ہی پوچھا۔ ''میں لکھ سکتی ہوں، طنز و مزاح سنجیدہ ہر طرح کا۔''

''احمد اور میں اکثر خواب دیکھتے تھے کہ ہم اپنا ایک میگزین نکالیں گے اور اس میگزین میں ہم کیا کیا شامل کریں گے وہ ایک پیور تفریحی میگزین نہیں ہو گا اس میں۔۔۔۔''

وہ بول رہی تھی اور میں خاموشی سے سن رہا تھا وہی سوچ وہی خیالات جو احمد کے تھے برائیوں کے خلاف قلم سے جہاد۔۔۔۔

اتحاد کی کوشش۔

محبتوں کا پرچار۔

وہ یہ سارے کام اپنے قلم سے لینا چاہتی تھی بالکل احمد کی طرح۔

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں نمی پھیل گئی میں نے دیکھا کہ بابا جان اور ماں جی کی آنکھیں بھی نم ہو رہی تھیں ہم سب احمد کی یادوں میں گھر گئے تھے۔

"اوکے۔۔۔۔" میں نے سب کو احمد کی یادوں سے باہر لانے کی کوشش کی۔

"میرے اخبار میں آپ کی نوکری پکی۔ دو چار روز میں ڈیکلریشن مل جائے گا تو میں آپ کو انفارم کردوں گا۔"

اس نے سر ہلا دیا میں نے دیکھا باوجود ضبط کے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"کیا خیال ہے Pay وغیرہ بھی طے کرلیں ابھی ویسے آپ کی ڈیمانڈ کیا ہوگی۔"

میں اسے اس پریشانی سے نکالنا چاہتا تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا اور وہ ٹرے اٹھا کر باہر چلی گئی۔

آمنہ شاہ۔

فاطمہ کی بیٹی۔

عروج اس کی دوست۔

آمنہ اور عاشی کی دوستی ہو چکی تھی اور عاشی اسے سب خبریں دیتی رہتی تھی۔

"اسید بھائی! آمنہ کہہ رہی تھی کہ آپ اپنے اخبار میں اس کی کہانیاں بھی شائع کرلیں نا۔"

"پاگل۔۔۔۔ اخبار میں کہانیاں نہیں چھپتیں۔" سعید نے اسے ٹوکا تھا۔

"سنڈے میگزین کے لیے بھیج دیا کرے گی۔"

"لیکن وہ جو ستر ستر صفحے کی کہانیاں لکھتی ہے وہ سنڈے میگزین میں نہیں چھپ سکتی۔"

"تو وہ مختصر لکھ لے گی۔"

دونوں بحث کرنے لگے تھے لیکن پھر یوں ہوا کہ آمنہ کے پپا کراچی کے حالات سے گھبرا کر لاہور شفٹ ہوگئے جب میرے اخبار کی پہلی کاپی آئی تھی تو وہ لاہور آچکی تھی

اور جگمگاتی آنکھوں والی وہ لڑکی بہت ایکسائیٹڈ تھی اور میرے اخبار کے آفس میں بیٹھ کر صدف اور عروج کے ساتھ اس نے مستقبل کے لیے نہ جانے کتنے پلان بنا ڈالے تھے۔

عروج اس کی کزن بھی تھی اور دوست بھی۔

حامد بے حد ذہین اور جینیس تھا۔ خود بخود ہی ایک ٹیم بن گئی تھی ہم سب ایک جیسی سوچ رکھنے والے تھے۔

"نوید سحر"

اخبار کا یہ نام آمنہ نے تجویز کیا تھا اور پتا نہیں کیا بات تھی کہ عاشی نے کہا۔

"آمنہ کہہ رہی ہے کہ اخبار کا نام "نوید سحر" رکھ لیں۔" تو میں نے اسے اوکے کردیا۔

حالانکہ سعید اور صدف نے کئی اور نام بھی تجویز کیے تھے۔ جلد ہی ہمارے اخبار کا ایک نام بن گیا تھا۔ ہم سب بہت محنت کرتے تھے۔ آمنہ نے خواتین کا صفحہ سنبھال لیا تھا صدف حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتی تھی اس کا مشاہدہ گہرا تھا اور حامد کرائم رپورٹر تھا۔

اس کے علاوہ بھی اور بہت سے لوگ تھے جو کسی بھی اخبار کو چلانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں یہ سب خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے گو ابھی سرکولیشن زیادہ نہ تھی پھر بھی مختلف حلقوں میں "نوید سحر" کا ذکر ہونے لگا تھا۔ خصوصاً صدف کا کالم اور حامد کے فیچر کے علاوہ میرا کالم بھی پسند کیا جا رہا تھا اور اخبار کی سرکولیشن چند ماہ کے بعد اتنی ہوگئی تھی کہ نہ صرف اخبار کا خرچ نکل رہا تھا بلکہ سب کی تنخواہیں بھی کچھ نہ کچھ نکل رہی تھیں۔ سب بے حد پرامید اور پرجوش تھے۔ ہفتہ وار میگزین ہم سنڈے کے بجائے فرائیڈے کو شائع کرتے تھے حامد کا خیال تھا کہ سنڈے کو سب ہی اخباروں کے سنڈے میگزین چھپتے ہیں ہمیں فرائیڈے کو میگزین نکالنا چاہیے۔ اس سے سرکولیشن پر اثر پڑے گا سو میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ اخبار نکالتے سال سے زیادہ ہوگیا تھا اور ہم نے اس سال بھر میں کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا میں نے ایک روز آفس میں بیٹھے بیٹھے سوچا۔

"کیا میں نے یہ اخبار اسی لیے نکالا تھا کہ چند خبریں، چند رپورٹیں، چند کالم لکھ دیں۔ بس اس طرح کے تو اور ابھی کئی اخبار تھے اور وہ آفتاب حسین اور احمد نوید سے کیا گیا

وعدہ کیا ہوا۔وہ برائیوں کے خلاف قلم سے جہاد۔۔۔۔اور اپنے ملک کو دنیا کا ایک بہترین ملک بنانے کی کوشش؟

غداروں اور ملک دشمنوں کے خلاف قلمی جہاد۔۔۔۔واہ اسید عبدالرحمٰن! تمہارے سارے دعوے بھی بس دعوے ہی رہے۔"

میں نے خود کو برا بھلا کہا۔تب ہی آمنہ کلپ بورڈ اٹھائے آفس میں داخل ہوئی میں نے بے دیہانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر جیسے لمحے بھر کے لیے میری نظریں اس کے چہرے پر ٹھہر سی گئیں۔بلا کی ملاحت اور معصومیت تھی اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھیں اتنی جگمگاتیں تھی کہ میں نے کسی اور کی آنکھوں میں اتنی چمک نہیں دیکھی تھی۔میں نے نظریں جھکا لیں لیکن دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہو گئیں تھیں۔پتا نہیں ایسا کیا تھا کہ جب کبھی میں اکیلا خالی الذہن سا لیٹا ہوتا تو آمنہ میرے تصور میں چلی آتی۔کبھی ہنستی کھلکھلاتی،صدف،عاشی اور عروج سے ہنسی مذاق کرتی۔کبھی حامد،فیصل،منیب اور مجھ سے سنجیدہ گفتگو کرتی۔میں کئی بار جھنجلا جاتا۔آخر کیوں؟ کیا ہے اس لڑکی میں کہ میں اسے سوچتا رہتا ہوں لیکن کچھ تو تھا کہ میں اس سے متاثر ہو رہا تھا۔

"یہ دیکھو اسید! یہ میں نے مختلف چینلز پر ہونے والے ان پروگراموں کے متعلق لکھا ہے جنہیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم بھارتی ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔"

"موضوع اچھا ہے لیکن حسب معمول تم نے تفصیل سے لکھا ہے۔" میں نے کاغذات کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ بس لکھتے ہوئے پتا نہیں چلتا، لاؤ مجھے دو میں اسے مختصر کرتی ہوں۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"میں دیکھ لیتا ہوں پہلے۔۔۔۔۔"

ہم ایک سال سے اکٹھے کام کر رہے تھے اس لیے ہمارے درمیان اب "آپ" والا تکلف نہیں رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔

"آج عاشی نہیں آئی ابھی تک۔۔۔۔" "وہ سعید کے ساتھ گئی ہے اس کے کالج

کوئی فنکشن تھا۔

"دونوں وہاں بھی لڑتے ہی رہیں گے۔" وہ ہولے سے ہنسی اور میں اس کی ہنسی میں کھو گیا اس کی ہنسی اس کے صبیح چہرے پر کتنی سج رہی تھی۔

"یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟" میں نے خود کو ڈپٹا۔تب ہی صدف بھی اندر آ گئی اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔

"ہم آخر کر کیا رہے ہیں اسید!" "جھک مار رہے ہیں۔" بے اختیار ہی میرے لبوں سے نکلا تھا۔

"تو جھک مارنے سے بہتر نہیں ہے کہ اپنے گھروں میں بیٹھ کر جھک ماریں۔تم جانتے ہو اسید! کہ میں نے تمہارے ساتھ کام کرنے کی خواہش کیوں کی تھی اس لیے کہ مجھے تمہارے قلم کی بے باکی اور سچ پسند تھا لیکن تم نے تو جیسے قلم کو بند کر کے رکھ دیا ہے یہ جو تو لکھ رہے ہو ایسا لکھنے کی تم سے امید تو نہیں تھی مجھے۔وہی گھسے پٹے مردہ لفظ۔۔۔۔

کمزور سا احتجاج۔۔۔۔۔

تم نے کل کے اخبار میں جو اداریہ لکھا وہ کیا تھا ایک کمزور بچے کا بیکار احتجاج جس سے تمہارے نقطہ نظر کی بھی وضاحت نہیں ہو رہی تھی۔"

میں نادم سا ہو گیا وہ صحیح ہی تو کہہ رہی تھی کل کے اخبار کے اداریے میں میں نے لاپتہ افراد کے متعلق لکھا تھا کہ حکومت کو چاہیے کہ انہیں تلاش کرے اور بس واقعی یہ مردہ سے الفاظ تھے جو کسی دل میں حرارت پیدا نہیں کر سکتے تھے جو کسی زنجیر کو پگھلا نہیں سکتے تھے۔

ان لفظوں سے زیادہ اثر تھا اس معصوم بچی کے الفاظ میں جو اپنی ماں کے ساتھ ہمارے اخبار کے آفس میں آئی تھی ان بے جان لفظوں سے زیادہ طاقتور تو وہ آنسو تھے جو اس بچی کی آنکھوں میں تھے۔

"انکل! مجھے اپنے ابو بہت یاد آتے ہیں وہ تو بہت اچھے تھے وہ بھلا دہشت گردوں کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟"

اس معصوم بچی کے باپ کو القاعدہ کی مالی مدد کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا یہاں اخبار کے دفتر میں موجود ہر شخص نے اسے تسلی دی تھی اس کے آنسو پونچھے تھے۔

وہ پوچھ رہی تھی۔ ''انکل! آپ اپنے اخبار میں لکھیں گے تو کیا میرے ابو واپس آجائیں گے؟''

اور میرے پاس اس کی بات کا جواب نہ تھا میں نے یوں ہی اسے تسلی دیتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

اور اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر رونق سی آگئی تھی اور میں نے یونہی چند بے جان اور مردہ لفظوں سے سجا ایک اداریہ لکھ دیا تھا اور بس۔۔۔۔۔گویا ایک فرض ادا ہو گیا تھا۔ ہم زیادہ تر صحافی یہی تو کر رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم نے بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ اس روز جیسے میرا ضمیر مجھے بار بار سرزنش کر رہا تھا۔ تب میں نے دراز سے سال بھر پہلے لکھا جانے والا آرٹیکل نکالا جسے کوئی بھی اخبار چھاپنے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ اس میں چند ایسے نام بھی تھے جو اعلیٰ عہدے دار تھے۔ بڑے بزنس مین تھے اور میں نے آرٹیکل پر ایک نظر ڈالی۔

آفتاب حسین ایک بڑے اخبار کا مالک بھی ان بڑوں میں شامل ہے میں نے اپنے ہی لکھے ہوئے الفاظ کو پڑھا اور پھر اس جملے پر لائن ماردی۔ جو چلے گئے ان کا کیا ذکر اور پھر اسی دراز سے وہ فائل نکالی جس پر میں نے وہ ٹاپک لکھ رکھے تھے جن پر مجھے لکھنا اور کام کرنا تھا۔ سال بھر میں کچھ فرق نہیں پڑا تھا وہی مسائل تھے اور وہی پریشانیاں۔۔۔ وطن عزیز میں وہی سب کچھ ہو رہا تھا جو سال بھر پہلے تھا اس کا استحصال۔۔۔اسے توڑنے کی کوششیں۔۔۔اپنے ہی بندوں کا قتل عام۔۔۔وہی مسائل وہی عذاب اور میں نے یہ کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''دادا کہتے تھے انسان کو اپنے ہاتھ سے کام کر لینا چاہیے یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ دوسرا نہیں کر رہا تو میں کیوں کروں؟''

میرے ساتھ مخلص ساتھی تھے۔ محبّ وطن اور دلوں میں کچھ کرنے کا جذبہ رکھنے والے۔ سو میں نے اس راستے پر قدم رکھ دیا تھا جہاں قدم قدم پر رکاوٹیں تھیں، مشکلات تھیں، آبلہ پائی تھی لیکن مجھے اسی راستے پر چلنا تھا یہ طے ہو چکا تھا اور اس کانٹوں بھرے راستے پر چلتے چلتے مجھے لگا کہ میرے اندر کہیں ایک تارا سا ٹمٹماتا ہے۔

ایک روشنی سی جگمگ کرتی ہے اور یہ آمنہ کی محبت کی روشنی تھی جو کسی ٹھنڈے میٹھے احساس کی طرح تھکی ماندی زندگی کو حرارت بخشتی تھی۔

آمنہ شاہ۔

جو بہت پیاری اور کومل تھی۔

جس کے دل کا حسن اس کے حسین چہرے پر جھلملاتا تھا اور خوبصورت اور ملیح چہرے پر کسی جھیل کے پانیوں کا عکس سوچوں کی روشن کرنوں سے چکا چوند کرتا کہ میں آمنہ شاہ سے محبت کرنے لگا ہوں اور یہ محبت ہے۔ میں نے بے حد حیران ہو کر سوچا تھا اور اس انکشاف نے مجھے ششدر کر دیا۔

نہیں۔۔۔بھلا یہ کیسے ممکن ہے اور میں۔۔۔۔میری زندگی تو ہر لحہ داؤ پر لگی ہے صبح وشام دھمکیاں۔۔۔۔مار دینے کی، ختم کر دینے کی اور نہیں بھلا مجھے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اپنے ساتھ اس کومل اور نازک سی لڑکی کو بھی کانٹوں پر گھسیٹوں، وہ جو دلوں پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے، جو اتنی نایاب اور انمول ہے کہ کسی بھی دل کی Entire Desire ہو سکتی ہے اور مجھے تو ابھی بہت جنگ کرنی ہے اور اس جنگ میں کتنے زخم لگیں گے، کتنے کانٹے چبھیں گے، میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔تو نارسائی مقدر ٹھہری۔

مجھے لگا جیسے محبت کا پودا میرے دل میں اگا ہی تھا کہ اس پر نارسائی کی پت جھڑ اتر آئی تھی۔

ملن کے پھول نہ تھے کیونکہ میرا سفر طویل بھی تھا اور خاردار بھی۔

اور وہ نازک۔۔۔اور کومل۔

تو میں اس محبت کی آگ کو پانی کے چھینٹے مار مار کر بجھانے لگا جو خود بخود ہی میرے اندر بھڑک اٹھی تھی اور میں نے قلم اٹھا لیا تھا ان کے خلاف جو انسانوں کا خون چوسنے والے اور گوشت کھانے والے چگادڑ تھے۔

جن کی سوچ اور خوشی ان کے بطن اور معدے میں سے ہو کر گزرتی تھی اور پھر ان کی آنکھوں میں لالچ اور حسد بن کر پھیل جاتی تھی، جو چند ٹکوں کے عوض اپنے ایمان، ضمیر اور ملک کا سودا کر رہے تھے۔ جن کے اندر دھڑکتے دلوں میں سیاہیاں پیدا ہو گئی تھیں اور ان

سیاہیوں نے ان کے چہرے مسخ کر دیئے تھے۔ میں لکھنے میں مگن تھا اور میں نے محبت کی
طرف سے پیٹھ موڑ لی تھی۔ زندگی کے عجائب خانہ میں اترنا کوئی معمولی بات نہیں کسی انجمن
کی ہم رکابی کوئی معمولی کام نہیں لیکن میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور سوچا تھا محبت میرے
دل سے رخصت ہوگئی ہے لیکن وہ تو ایسے ہی میرے دل میں موجود تھی اور آمنہ شاہ میرے
سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''سنو اسید عبدالرحمٰن! تم محبت سے کتنا بھی نظر چراؤ تم اس سے بچ نہیں سکتے۔

بولو کیا مجھے بھول سکو گے؟

کیا میرے بغیر زندگی گزار پاؤ گے؟''

میرے پاس اس کے خاموش سوالوں کا جواب نہیں ہے لیکن میں اپنے سفر پر چلتے
ہوئے اس کی محبت کو دل سے نکالنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں کہ یہ وہ پل
صراط ہے جس پر مجھے اکیلے چلنا ہے لیکن محبت بضد کہ وہ بھی میرے ہمراہ ہی رہے گی۔ س

☆ ☆ ☆

تیسرا حصہ

پل صراط

اور میں عروج مصطفےٰ ہوں آمنہ کی دوست اور ماموں زاد بہن، مجھے آمنہ سے
ہمیشہ ہی محبت رہی اور میں نے ہمیشہ اسے آئیڈ لائیز کیا۔ شاید اس کی وجہ اس کی بے پناہ
ذہانت ہے اور اس کا رائٹر ہونا ہے، بہت کم عمری میں ہی اس نے خواتین کے پرچوں میں اپنا
ایک مقام بنا لیا تھا۔ مجھے اس کی تحریر اس کی کہانیاں بہت پسند ہیں۔ میں سوچتی تھی کاش میں
بھی اس کی طرح لکھ سکوں، میری کہانیاں بھی خواتین کے پرچوں میں چھپیں اور لڑکیاں اس
کے لیے تعریفی خط لکھیں لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ شاید میں کبھی آمنہ جیسا نہ لکھ سکوں یا شاید
کبھی لکھ ہی نہ سکوں جبکہ پھپھو کہتی تھیں تم لکھ سکتی ہو تمہارے اندر یہ صلاحیت ہے لیکن تم
کوشش نہیں کرتی ہو۔

جب آمنہ لاہور آئی اور اس نے ''نوید سحر'' کو جوائن کیا تو میں بھی اس کے ساتھ

جانے لگی۔ اسید نے میرے ذمے خواتین کے صفحے کی ترتیب کا کام لگا دیا تھا۔ میں بس
خواتین کے صفحے کے لیے آنے والے اقتباسات، شعر اور اقوال زریں ترتیب دیتی تھی۔ گو
میرا اپنا تو لکھنے کا کوئی کام نہ تھا پھر بھی میں خوش تھی کہ میں ان لوگوں سے وابستہ ہوں۔

جو ملک و قوم کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں-----

یہ مخلص اور محب وطن لوگ تھے-----

ان کے ہاتھ میں قلم تھا اور قلم جب ہاتھ میں ہو تو بولنے لگتا ہے----

کبھی زخموں پر مرہم رکھتا ہے------

کبھی زخموں کو کریدتا ہے اور گہرا کرتا ہے------

کبھی گیت گاتا اور لوریاں سناتا ہے----

کبھی سوئے ہوئے کو جگاتا ہے-----

کبھی یوں گرجتا ہے کہ آدمی سہم کر رہ جائے-----

کبھی اتنا نرم و حساس کہ کسی بچے کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر رو پڑے------

کبھی اتنا سخت اور بے رحم کہ لاشوں کے انبار پر ہنسے----

نیرو کی طرح بانسری بجائے اور اس ساری فسوں سازی کا محرک وہ ہاتھ جس میں
قلم ہے وہ ہاتھ اگر معتبر ہے تو وہ قلم بھی معتبر ہے محترم ہے----

اصل میں قلم-----قلم رکھنے والے کے ظرف کو آزماتا ہے-----

اسے پرکھتا ہے جانچتا ہے پھر اس کی مرضی پر چلنے لگتا ہے----

ہنستا ہے تو اس کی مرضی پر، روتا ہے تو اس کی رضا دیکھ کر----

بات کرتا ہے تو اس کا چہرہ دیکھ کر----

چلتا ہے تو اس کا رخ دیکھ کر----

گویا وہ آئینہ ہے۔ ایسا آئینہ جس میں ایک عکس چھلکتا ہے----

ایک ہی شبیہ اترتی ہے----

قلم عکس ہے قلم رکھنے والے کا----

کم ظرف بے وقت ہو جاتا ہے اور باظرف ہاتھ معتبر و محترم----

سو آدمی کو پہنچاننا ہو تو اس کے قلم کو دیکھو----

اس ہاتھ کو نہ دیکھو جس میں قلم ہے----

سو قلم کی آبرو ہاتھ کی آبرو اور ہاتھ والے کا وقار قلم کی آبرو----

قلم تو بہت سے رکھتے ہیں پر قلم کی آبرو کا پاس کسی کسی کو ہے----

قلم کا حق کوئی کوئی ادا کرتا ہے----

ان بہت سارے ہاتھوں میں میرے ان سب دوستوں کے ہاتھ بھی شامل ہیں
جو قلم تھامے ہوئے ہیں اور تھامے رکھنا چاہتے ہیں----

جیسے بہت سارے چراغ----اندھیری رات میں روشن ہوں اور تاریکی سے
نبرد آزما ہوں شاید----ان میں سے کچھ چراغ بجھ جائیں اور کچھ تندی باد حوادث میں بھی
جلتے رہیں----

چراغ کی لو تو گھٹتی بڑھتی رہتی ہے بات تو ان ہاتھوں کی ہے جو----

قلم تھامے ہوئے ہیں کم ظرف ----باظرف ----معتبر نا
معتبر----معقول، نامعقول----

چھچھورے و مہذب ہاتھ----

بہت سارے جانے پہچانے اور انجانے ہاتھ----

خدا معلوم ان سارے ہاتھوں میں سے کون کون سے ہاتھ قلم کی حرمت کو برقرار
رکھیں گے اور محترم کہلائیں گے----

قلم میرے ہاتھ میں بھی ہے قلم آپ کے ہاتھ میں بھی ہے لیکن قلم کی آبرو کون
برقرار رکھتا ہے اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔ فی الحال تو آپ اس کہانی کو پڑھیے یہ
میری پہلی کہانی ہے۔

آمنہ شاہ کی کہانیاں پڑھ کر مجھے لکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا اور آج آمنہ شاہ اور اسید
عبدالرحمٰن کی کہانی لکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ میں بھی لکھ سکتی ہوں آپ کا کیا خیال ہے؟
کہانی پڑھ کر مجھے ضرور بتائیے گا میری کہانی کا نام ہے ''پل صراط''

☆ ☆ ☆

میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا؟

تیرے باپ کا وہ کیا کرتی تھی؟

وہ تو کھیت میں چارہ چرتی تھی

ہاں جی کھیت میں چارہ چرتی تھی

سنو کھیت میں چارہ چرتی تھی

سعید ٹیبل پر پاؤں لٹکائے بیٹھا لہک لہک کر گا رہا تھا۔

''تم ڈاکٹر بننے کی بجائے سنگر کیوں نہیں بن جاتے؟ خدا قسم بہت کامیاب رہو گے۔''

فیصل نے جو اسید کے ایک آرٹیکل کی پروف ریڈنگ چیک کر رہا تھا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تمہارے مشورے پر غور کروں گا دراصل اسے خوف ہے کہ باقی سنگر اس کی سریلی آواز سن کر بھاگ ہی نہ جائیں۔'' حامد نے جو کچھ فاصلے پر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا نہ جانے کیا سرچ کر رہا تھا مڑ کر سعید کی طرف دیکھا۔

''ویسے اس کا ٹیسٹ بھی بہت اعلیٰ ہے نا عاشی؟'' آمنہ نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبائے عاشی کو دیکھ رہی تھی۔

''اس میں کیا شک ہے ڈیئر سسٹر؟'' سعید ٹیبل سے نیچے اتر آیا۔

''ہائے داوے تمہیں کیا آج کالج نہیں جانا تھا؟'' حامد نے پھر پوچھا۔

''جانا تو تھا بلکہ جا رہا ہوں اس وقت تو عاشی کو چھوڑنے آیا تھا۔''

''اچھا ۔۔۔۔'' آمنہ نے اچھا کو لمبا کیا اور معنی خیز نظروں سے عاشی کو دیکھا اور عاشی اس طرح اس کے دیکھنے سے یکدم سرخ پڑ گئی۔ یہ عاشی کو ڈراپ کرنے اور پک کرنے کی ذمہ داری تم نے کیوں اٹھا رکھی ہے یہ اسید کے ساتھ بھی تو آ سکتی ہے۔

''دراصل ۔۔۔۔'' وہ دائیں کان کی لو مروڑنے لگا۔

''اسید ہے سحر خیز اور یہ محترمہ اٹھتی ہیں دو پہر کو اور اسید اس کے اٹھنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔''

''جھوٹ مت بولو میں ساڑھے آٹھ بجے تک اٹھ جاتی ہوں اور ناشتہ کرتے اور تیار ہوتے نو بج جاتے ہیں۔''

سعید نے اس کی بات کاٹی۔ ''جبکہ اسید ساڑھے سات بجے گھر سے نکل آتا ہے تو ان محترمہ نے دست بستہ عرض کی تھی۔

''پلیز سعید! تم تو نو بجے جاتے ہو نا مجھے بھی ڈراپ کر جایا کرو۔'' اس نے باریک آواز میں عاشی کی نقل اتاری۔

''کوئی بھی نہیں۔'' عاشی جھینپ گئی۔

''ویسے یہ سب لوگ تو کوئی نا کوئی کام کرنے آتے ہیں تم کس لیے آتی ہو؟ کیا دل بہلانے۔'' وہ شرارت سے عاشی کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں کیا؟'' عاشی چڑ گئی۔

''تم بہلاؤ اپنی فل فلوٹی کا دل ۔۔۔۔''

''میری فل فلوٹی؟'' اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔

''ہائے سویٹ! فل فلوٹی کہاں تھی وہ ۔۔۔''

''قریب جا کر جو دیکھا تو کھل کھا رہی تھی۔'' فیصل بے اختیار ہنسا۔

''تم بھینسوں سے بہت دلچسپی رکھتے ہو سعید! تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ڈاکٹری چھوڑ کر گوالے بن جاؤ۔ ایمان سے دودھ تو خالص ملے گا ورنہ دودھ کے نام پر جو ملغوبہ آج کل مل رہا ہے نا وہ ضرور کسی موذی مرض میں مبتلا کر دے گا۔''

آمنہ نے قلم ٹیبل پر رکھ کر بظاہر سنجیدگی سے کہا لیکن اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''ہائے کیا بتاؤں کتنی حسین لگتی ہیں یہ مجھے، سیاہ آبنوسی رنگت یہ مڑے ہوئے سینگ ۔۔۔ اس کے حسن کا کیا کہنا اور پھر چال کا بانکپن ۔۔۔ آپ کو کیا پتا، بالے گجر کی کتنی ہی بھینسوں میں دل اٹکا ہوا ہے میرا ۔۔۔''

''پچھلے جنم میں ضرور بھینسوں کی رکھوالی کرتے ہو گے۔'' عاشی نے آہستہ آواز میں کہا تھا لیکن اس نے سن لیا اور مسکرایا۔

"ارے تو تمہیں بھی یاد ہیں سب، پچھلے جنم کی باتیں۔۔۔۔ہے نا؟"

دوپہرے چھپڑ کے کنڈے ہم عشق لڑایا کرتے تھے
تم کپڑے دھویا کرتی تھی اور ہم مجھ نوایا کرتے تھے

(دوپہر کے وقت پانی کے چھپڑ کے کنارے ہم عشق لڑایا کرتے تھے
تم کپڑے دھوتی تھی اور ہم بھینس نہلاتے تھے۔)

"اومائی گاڈ! تم تو بھینسوں سے متعلق اشعار بھی جانتے ہو۔" حامد کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

سب ہی ہنس رہے تھے اور عاشی سرخ چہرے کے ساتھ اسے گھور رہی تھی۔

"تمہیں تو بھینسوں کی سوسائٹی کی طرف سے ایوارڈ ملنا چاہیے۔"

تب ہی دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا تھا۔ پیشانی پر لکیریں ڈالے ایک شخص اندر داخل ہوا۔ سب خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"فرمایئے!" سب سے پہلے حامد کو ہی خیال آیا تھا۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"وہ کہاں ہے تمہارا بڑا اسید عبدالرحمٰن؟" اس نے کھوجتی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اس کمرے کے دائیں طرف والے کمرے پر چیف ایڈیٹر کی تختی دیکھ کر اس کی طرف بڑھا۔

"وہ ابھی نہیں آئے آپ کو کیا کام ہے ان سے؟" سعید بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کام۔۔۔۔" وہ عجیب طرح ہنسا اور اپنا دایاں ہاتھ تنبیہہ والے انداز میں اوپر اٹھایا۔ دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں تھیں جن میں مختلف رنگ کے پتھر جڑے تھے۔

"اسے کہہ دینا کہ یہ جو بکواس وہ آج کل لکھ رہا ہے نا اپنے اخبار میں اسے بند کر دے ورنہ۔۔۔۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟" اب حامد اپنی جگہ کھڑا ہو گیا تھا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ

رہا تھا۔

"ورنہ؟" اس نے چٹکی بجائی۔

"یوں ہوگا یوں۔۔۔۔لاش بھی نہیں ملے گی اس کی۔"

وہ اپنے ہاتھوں کو مروڑتا ہوا پھر اسی طرح سے ہنسا تھا۔ عجیب سی سنسنی خیز پیدا کرتی ہوئی ہنسی۔۔۔۔عروج نے گھبرا کر آمنہ کی طرف دیکھا جو ساکت بیٹھی تھی۔

"تم وہی ہونا، وزیر تجارت فضل ربی کے کارندے۔۔۔۔ایک بار ہاسپٹل میں میری ڈیوٹی لگی ہوئی تھی اور وہ وہاں وی آئی پی روم میں داخل تھے اور تم ان کے پاس تھے۔"

لمحہ بھر کو وہ شخص خاموش ہو گیا اور پھر ایک استہزائیہ سی نظر اس پر ڈالی۔

"ڈاکٹر تم اپنے کام سے کام رکھو۔ تمہیں کیا کہ میں کون ہوں اور کس کے ساتھ ہوں۔"

"اور۔۔۔۔" وہ حامد کی طرف مڑا۔

"کہہ دینا اس سے کہ زیادہ ہاتھ پاؤں نہ پھیلائے ورنہ ہم ہاتھ باندھنا بھی جانتے ہیں اور توڑنا بھی اور تمہارے جیسے احمقوں کا یہ ٹولہ کسی کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" پھر سب کو باری باری دیکھتا ہوا وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح باہر نکل گیا۔

"یہ۔۔۔یہ کیا تھا سعید؟" عاشی اس کے جاتے ہی اٹھ کر سعید کے پاس آ گئی۔

"یہ شخص اس طرح کیوں دھمکیاں دے رہا تھا؟"

"کچھ نہیں۔۔۔۔اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" اس نے ایک تسلی آمیز نظر عاشی پر ڈالی۔

"ویسے آج کل اسید کس موضوع پر لکھ رہا تھا؟"

"آج کل وہ این جی اوز پر کام کر رہا تھا۔ وہ نام نہاد این جی اوز جو عورت کو حقوق دلانے کے نام پر حکومت اور دوسرے اداروں سے لاکھوں روپے کھا رہی ہیں اور وہ این جی اوز جو دیہی علاقوں کی بھلائی کے نام پر وہاں بے ہودہ لٹریچر تقسیم کر کے گمراہی کو فروغ دے رہی ہیں اور وہ این جی اوز جن کے کرتا دھرتا یہودی اور مسلمان دشمن لوگ ہیں جن کا مقصد اسلام کے متعلق غلط نظریات پھیلانا اور لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنا ہے۔" صدف نے

جواب تک خاموش بیٹھی تھی نے تفصیل سے بتایا۔

"ویسے اس وقت اسید ہے کہاں؟ وہ تو ہم سب سے پہلے یہاں موجود ہوتا تھا۔" آمنہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔اس کے چہرے پر بکھری پریشانی کو سب نے ہی نوٹ کرلیا۔

"وہ کسی ڈاکٹر فہد علی سے ملنے گیا تھا ناشتہ کرتے ہی نکل گیا۔"

"یہ ڈاکٹر فہد کون ہے؟" آمنہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"معلوم نہیں۔" سعید نے کندھے اچکائے۔

"صبح وہ دادا جان کو بتا رہا تھا کہ میں ڈاکٹر فہد کی طرف جا رہا ہوں تو میں نے سنا تھا۔"

"دراصل ایک این جی او میں چار سال تک جاب کرتے رہے ہیں سو دوران خانہ کئی رازوں سے واقف ہیں۔انہوں نے پہلا آرٹیکل چھپنے کے بعد خود ہی فون کیا تھا اسید کو اور بتایا تھا کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں اور لکھنا چاہتے ہیں ان کے متعلق کہ ان این جی اوز کی حقیقت کیا ہے؟"

صدف نے پھر تفصیل بتائی۔تب ہی ایک کمرے سے کیمرہ کندھے پر لٹکائے دلیر خان نکلا۔دلیر خان بیس بائیس سال کا ایک بے حد جینیس فوٹو گرافر تھا۔اس کا تعلق باجوڑ ایجنسی کے ایک گاؤں ڈاماڈولا سے تھا۔سب ہی اس سے پیار کرتے تھے اگرچہ اسے یہاں جوائن کئے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے ابھی پچھلے دنوں ایک عمارت میں جو آگ لگی تھی تو وہ تصویریں بنانے کے چکر میں بہت آگے تک چلا گیا تھا جس پر اسید نے اسے ڈانٹا بھی تھا کہ تصویروں سے زیادہ تمہاری زندگی ہمارے لیے اہم ہے دلیر!"

"فرض کے سامنے زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی سر! فرض کے لیے جان بھی قربان کی جاسکتی ہے۔" اسے باہر سے آتے دیکھ کر حامد بھی اپنا بیگ کندھے پر لٹکا کر کھڑا ہوگیا۔

"او کے! تو پھر ہم چلتے ہیں۔"

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو بھئی؟"

"ایک تقریب کی کوریج کرنی ہے۔"

"کوئی سیاسی تقریب؟" فیصل نے پوچھا۔

"ملی جلی۔۔۔۔"

"او کے! زندگی ہوئی تو پھر ملیں گے اللہ حافظ۔" فیصل نے اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔

اس کی عادت تھی کہ جب کوئی باہر جاتا یا خود اسے کہیں جانا ہوتا تو یہ جملہ ضرور کہتا۔گھر سے باہر جانے والا شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ واپس آئے گا یا کسی دھماکے کا شکار ہوجائے گا۔

"اور کیا تم نے تمہیں کالج نہیں جانا؟"

صدف نے پوچھا تو سعید جو فیصل کے کہے جملے پر غور کررہا تھا چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔۔۔۔میرا موڈ نہیں ہے۔"

"یہ تمہارا فائنل ائیر ہے سعید! اور تمہیں لاپرواہی نہیں کرنی چاہیے۔صدف نے بڑی بہنوں کی طرح نصیحت کی۔"

"تم لوگوں کو دیکھ دیکھ کر میرا بھی جی چاہنے لگا ہے کہ میں بھی تمہاری فیلڈ میں آجاؤں۔" وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"ہمارے ملک کو اچھے صحافیوں کی ہی نہیں اچھے ڈاکٹروں کی بھی ضرورت ہے۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک وزیر کا بھلا این جی اوز سے کیا تعلق؟ اور یہ شخص جو ابھی دھمکی دینے آیا تھا یہ۔۔۔۔" عاشی نے جو ابھی تک کھڑی تھی کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔

"بڑی جلدی خیال آگیا حضور!" سعید تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔

"دراصل یہ جو وزیر صاحب ہیں ناں، ان این جی اوز والوں نے ان کی بھینس چرائی تھی۔۔۔۔"

"خبردار! جواب تم نے بھینس کا نام لیا۔" عاشی نے اس کے بازو پر مکہ مارا۔

"ویسے یہ ڈاکٹر فہد رہتا کہاں ہے؟" آمنہ نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' سعید نے کندھے اچکائے۔

''تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا نا؟ جبکہ اسید کو ایک بار بقول تمہارے گاڑی سے کچلنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔''

''Relax آمنہ! کچھ نہیں ہوتا آجائے گا ابھی ۔۔۔۔'' صدف نے آہستگی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''چلو! دیکھیں ذرا صفدر صاحب نے سرخیاں بنالیں ہیں۔ اسید نے کہا تھا ایک نظر دیکھ لینا۔''

تب ہی سعید کے سیل کی بیل ہوئی اور اس نے فون نکال کر دیکھا اور ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''اوہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ آج تو نورین نے ہم سب فرینڈز کو ٹریٹ دینا تھی اپنی برتھ ڈے کی۔ اسی کی مس کال ہے اوکے میں چلا۔''

''تجھے میں بھینس دے دینا۔''

عاشی نے پیچھے سے آواز دی تو دروازہ کھولتے ہوئے اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''تمہارا مشورہ اچھا ہے لیکن میرے جیسا غریب سٹوڈنٹ بھینس کی تصویر دے سکتا ہے بھینس نہیں۔'' اور ہاں اس نے انگلی اٹھائی۔

''اب تم نے بھینس کا ذکر کیا ہے میں نے نہیں۔''

اور عاشی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی تیزی سے باہر نکل گیا اور اس کے جانے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ دوسرے ہال میں بھی اخبار سے متعلق لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ لیکن آمنہ قلم ہاتھ میں تھامے خالی الذہن سی بیٹھی تھی۔

یہ اسید نے کس خاردار میں قدم رکھ دیا ہے گو ایک بے باک صحافی کی حیثیت سے اس نے اپنی پہچان کروائی تھی اور ان چند ماہ میں اخبار کی سرکولیشن مزید بڑھی تھی۔ کئی بڑے اخباروں میں تبصرہ کیا گیا تھا کہ ''صبح نو'' کے بند ہوجانے سے جو خلا ہوگیا تھا۔ ''نوید سحر'' نے اس کی کمی بہت حد تک پوری کردی ہے۔

پھر بھی یہ ہر لمحہ خوف کی زندگی۔

کتنی دھمکیاں دی جاتی تھیں اسید کو۔ بھلا زندگی کو یوں داؤ پر لگانا عقلمندی تو نہیں ہے نا۔ اب جو اسید نے منشیات اور بھکاریوں پر لکھا تو کیا یہ سب ختم ہوگیا یا اب یہ این جی اوز ختم ہوجائیں گی یا اس سے پہلے جو کالا جادو کرنے والوں کے خلاف اتنے آرٹیکل، اتنے انٹرویو چھپے، اتنے لوگوں نے اظہار خیال کیا تو یہ لوگ کام چھوڑ کر چلے گئے ہیں، ان کا کاروبار تو پہلے سے زیادہ چمک رہا ہے اور ہر اخبار میں، کیبل پر، دیواروں پر ان کے اشتہارات کی بھرمار ہے۔ میں کہوں گی اسید سے کہ چھوڑ دے یہ سب، کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ مصیبتیں مول لینے کی۔

جب زندگی سیدھے سادھے راستے پر گزر سکتی ہے تو پھر کیوں آدمی ٹیڑھے راستے اپنائے۔

وہ تو اپنے افسانوں کے کرداروں جیسی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔

نرم اور ندی کی طرح۔

دھیرے دھیرے بہتی زندگی۔

جس میں محبت اور خوشی کے رنگوں کی ہلچل ہو۔

اور بس اس نے یہ سب سوچا تو تھا لیکن جب اسید آفس آیا تو وہ اس سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی وہ بہت پرجوش تھا۔

''ڈاکٹر فہد نے جو انکشافات کیئے ہیں وہ بہت حیران کن ہیں تم تصور بھی نہیں کرسکتی صدف! کہ ان این جی اوز کے پوشیدہ مقاصد کیا ہیں یہ یہاں ہمارے ملک میں کیا انقلاب لانا چاہ رہے ہیں؟''

اس نے مختصر فہد سے معلوم ہوجانے والی باتیں بتائی تھیں وہ سب خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے تھے اور جب اس نے بات مکمل کرلی تو فیصل نے اسے آفس میں آنے والے شخص اور اس کی دھمکی کے متعلق بتایا جو وہ دے گیا تھا۔

''ہوں ۔۔۔۔'' اسید نے سر ہلایا۔

''ایسی دھمکیاں تو بہت دنوں سے مل رہی ہیں۔ میں نے جب اس خارزار

میں قدم رکھا تھا۔ تو میں جانتا تھا کہ یہ آسان نہیں ہے جان بھی جا سکتی ہے مگر مجھے یہ سب کرنا ہے کہ میں نے اس کا عہد کیا ہے احمد سے اور آفتاب حسین سے کہ میں اپنے آخری سانس تک برائیوں کے خلاف جہاد جاری رکھوں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

''ہم سب تمہارے ساتھ ہیں اسید!'' صدف نے فوراً کہا۔

''تم سب۔۔۔۔۔'' اسید نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔

''فیصل! آمنہ! عاشی! عروج!۔۔۔۔ تم سب چاہو تو کہیں کسی اور اچھے اخبار میں جاب کر سکتے ہو۔ حامد اور دلیر کو بھی میرا پیغام دے دینا۔ حامد کے سیاسی تبصرے اتنے زبردست ہوتے ہیں کہ کوئی بھی اخبار اُسے بخوشی قبول کرلے گا۔

فیصل کے فیچر۔۔۔۔۔

صدف اور آمنہ کے سروے۔۔۔۔۔

تم سب کا اتنا نام ہو چکا ہے کہ کہیں بھی تمہیں اچھی جاب مل سکتی ہے۔

اور آمنہ کا تو پہلے ہی ایک نام بن چکا ہے، ادب کی دنیا میں ایک نام۔''

''تم کیا سمجھتے ہو اسید عبدالرحمٰن! کہ صرف تم ہی ایک سچے اور بے باک صحافی ہو اور ہم سب قلم کی حرمت بیچنے والے ہیں؟'' آمنہ کو نہ جانے کیوں غصہ آ گیا تھا۔

''ہم اگر بزدل ہوتے تو اسی روز تمہارا ساتھ چھوڑ جاتے جب تم نے یہاں اسی کمرے میں کہا کہ اب تم وہ لکھو جس کے لیے ہم نے یہ اخبار شروع کیا تھا تمہیں شاید یاد نہ ہو لیکن تم نے بہت اچھی طرح ہر بات ہر خطرے اور ہر مشکل کی وضاحت کر دی تھی۔''

اسید کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''سوری آمنہ! شاید تم میری باتوں سے ہرٹ ہوئی ہو لیکن میرا فرض بنتا ہے کہ تمہیں وہ سب بتا دوں جو تم نہیں جانتے، مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنا مشکل کام ہو گا اور اس طرح قدم قدم پر مجھے روکا جائے گا اور مجھے دھمکیاں دی جائیں گی۔ کبھی قتل کی دھمکی کبھی اخبار کا ڈیکلریشن ضبط کروانے کی دھمکی اور کبھی پیسے سے خریدنے کی دھمکی۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ کسی مشکل میں پڑو۔''

''تو تم یہ سب چھوڑ کیوں نہیں دیتے اسید!'' عاشی نے احمقوں کی طرح کہا۔

''کیا صرف ہماری زندگیاں قیمتی ہیں تمہاری زندگی قیمتی نہیں۔۔۔۔۔''

''اوہ۔۔۔۔۔ عاشی کیا سعید نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ دادی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ تمہیں بلا رہی تھیں؟'' اسید کو اب یاد آیا تھا کہ عاشی کو تو آج گھر ہونا چاہیے تھا۔

''نہیں تو۔۔۔۔۔'' عاشی نے انکار کیا۔

''وہ ہے ہی بھلکڑ پتا نہیں میڈیکل کی اتنی بڑی بڑی کتابیں کیسے رٹ لیتا ہے، خیر میں ابھی چلی جاتی ہوں اب کیسے جاؤں گی اکیلی۔ میرے ساتھ ہی چلنا۔''

''اچھا۔۔۔۔'' عاشی نے اثبات میں سر ہلا دیا موضوع بدل گیا تھا۔

''مجھے آج جلدی جانا ہے۔'' آمنہ کھڑی ہو گئی میں اسے ڈراپ کرتی جاؤں گی۔

''ناراض ہو کر جا رہی ہو؟'' اسید بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

''نہیں آج ماما کے ساتھ جانا تھا کہیں۔۔۔۔'' آمنہ کی آنکھوں میں یکدم روشنی کوندی تھی کہ اسید عبدالرحمٰن کو اس کا احساس ہے۔

''تھینکس۔۔۔۔'' اسید اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا اور آمنہ، عروج اور عاشی باہر نکل گئیں۔

''کچھ محبتیں آہستہ آہستہ سرائیت کر جاتی ہیں اور کچھ محبتیں بند دروازے کھول کر زبردستی دل میں گھس کر بیٹھ جاتی ہیں۔ پلک جھپکنے میں جب احساس ہوتا ہے کہ ایسا ہو گیا ہے تب تک دل اور روح کے تمام خلا پر ہو چکے ہوتے ہیں لیکن خالی محبت دل میں اتر آنے سے کبھی زندگی بھی سہل ہوئی ہے۔''

''یہ حقیقت ہے یا افسانہ۔۔۔۔'' عروج نے آمنہ کے کندھے پر سے جھکتے ہوئے پڑھا۔

''افسانے بھی تو حقیقتوں سے جنم لیتے ہیں نا عروج۔۔۔۔'' آمنہ نے فائل بند کر دی تو عروج اس کی کرسی کی پشت سے ہٹ کر اس کے سامنے پڑی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

''بہت دنوں سے تمہارا کوئی نیا افسانہ نہیں آیا کیا یہ کوئی نیا افسانہ لکھ رہی ہو؟''

"نہیں۔۔۔" آمنہ مسکرائی۔

"بس یونہی قلم چلا رہی ہوں۔۔۔"

"تمہاری قارئین تمہیں مس کر رہی ہیں۔۔۔"

"کب لکھ رہی ہو نیا افسانہ۔۔۔؟"

"پتا نہیں۔۔۔" آمنہ نے پیشانی پر آ جانے والے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"آج کل تو زندگی میرا افسانہ لکھ رہی ہے پتا نہیں اس کا اینڈ ٹریجک ہوگا یا خوشگوار۔۔۔"

"آمنہ ایک بات پوچھوں۔۔۔"

"پوچھو۔" آمنہ نے سوالیہ نظروں سے۔

"تم۔۔۔تم اسید عبدالرحمٰن سے محبت کرتی ہو؟" ایک لمحہ کو آمنہ چپ سی اسے دیکھتی رہی۔

"ہاں شاید۔۔۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"اسے شاید محبت ہی کہتے ہیں۔۔۔" وہ ہولے سے ہنسی۔

"اپنے ڈھیروں ڈھیر افسانوں میں محبت کا ذکر کرنے کے باوجود مجھے لگتا ہے جیسے میں محبت کو صحیح طرح سے نہیں سمجھ سکی، پتا نہیں یہ محبت ہے، انسیت ہے، لگاؤ ہے اور احترام ہے یا کیا۔۔۔؟ لیکن عروج مصطفیٰ! میں اس شخص اسید عبدالرحمٰن کو بہت سوچتی ہوں جب میں نے اسے دیکھا نہیں تھا تب بھی کئی بار خیالوں نے اس کا پیکر تراشا اس کے کالم اور آرٹیکل پڑھ کر۔۔۔" وہ سانس لینے کو ذرا رکی۔

"ایک ناراض خفا خفا سا شخص۔۔۔

اپنے علاوہ تمام لوگوں کے لیے مخلص۔۔۔

اپنے وطن سے جنون کی حد تک محبت کرنے والا۔۔۔

اور پتا ہے جب میں نے پہلی بار اسے آفتاب حسین کے گھر نایاب کی تصویر کے سامنے کھڑے دیکھا تو وہ مجھے ایسا ہی لگا۔ اس وقت اس کی آنکھیں نم تھیں اور پتا نہیں اس

سے کیا کہہ رہا تھا لیکن وہ مجھے ایسا ہی لگا تھا جسے میرے خیالوں نے تراشا تھا۔"

"تم اس سے محبت کرتی ہو اور یہ میں نے پہلے دن سے ہی جان لیا تھا جب یہاں آفس میں پہلی بار میں تمہارے ساتھ آئی تھی اور تم نے اس سے متعارف کرایا تھا۔"

عروج نے پورے یقین سے کہا تو آمنہ ایک بار پھر مسکرا دی۔

"حیرت ہے عروج! وہ بات جسے جاننے میں مجھے اتنا عرصہ لگا بلکہ اب بھی میں کبھی کبھی تذبذب میں پڑ جاتی ہوں کہ کیا یہ محبت ہے؟ یہ جذبہ جو ہولے ہولے دل میں چٹکیاں لیتا ہے اور سارے وجود میں عجیب انوکھی سی سنسنی پیدا کرتی خوشی بن کر بکھر جاتا ہے کیا واقعی محبت ہے؟"

"تم نے اسے لمحوں میں جان لیا لیکن تمہارا دل بھی تو محبت سے آشنا نہیں؟"

اسید عبدالرحمٰن ایک گہری سانس لے کر کلپ بورڈ اٹھائے واپس اپنے آفس کی طرف بڑھا۔ وہ نا جانے آمنہ سے کس بات پر ڈسکشن کرنے آیا تھا کہ عروج کی زبان سے اپنا نام سن کر ٹھٹک گیا۔

"تو۔۔۔"

اپنے آفس میں آ کر کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔

"تو آمنہ شاہ۔۔۔!"

کئی بار اسے گمان تو گزرا تھا لیکن اس نے ہمیشہ ہی اپنے گمان کو جھٹلایا تھا نہیں بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے اور اب عروج مصطفیٰ کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور خود آمنہ نے یونہی بے مقصد کاغذات کو ٹیبل پر ادھر ادھر کیا۔"

"اور تم اسید عبدالرحمٰن کیا تم بھی۔۔۔" اندر دل میں کہیں چراغاں سا ہوا وہ بھی اسے دیکھ کر دل کی ایک دھڑکن مس کر بیٹھا تھا لیکن دل میں یکدم چراغاں نہیں ہوا تھا بلکہ آہستہ آہستہ ایک احساس دل میں سرائیت کرتا چلا گیا تھا جسے شاید محبت کا نام دیا جا سکتا ہو۔

یہ احساس آمنہ کی موجودگی میں اندر کہیں پھول کھلائے رکھتا تھا اور جس روز آمنہ غیر حاضر ہوتی تو جیسے۔۔۔

"اوہ نہیں۔۔۔۔۔" اس نے سر کو جھٹکا۔

"میں جس راہ پر قدم رکھ چکا ہوں۔

وہاں محبت کو ہم قدم لے کر نہیں چلا جا سکتا اسید عبدالرحمٰن!"

اس نے جیسے سر جھٹک کر اندر بیٹھی میٹھی میٹھی احساس کی بو جگاتی محبت کو پرے دھکیل دیا اور میز پر پڑی فائل اٹھائی۔

اور آمنہ کے سامنے بیٹھی عروج آمنہ کی آنکھوں میں محبت کے رنگ دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

"کیا اسید عبدالرحمٰن بھی تم سے محبت کرتا ہے؟"

"پتا نہیں۔۔۔۔" آمنہ نے ایک گہری سانس لی۔

"وہ ایسا شخص ہے کہ محبت اس کے قریب سے ہو کر چلی جائے تو اسے پتا نہ چلے۔" وہ ہولے سے ہنسی۔

"اسے اپنے کام کے سوا کچھ نہیں سوجھتا، لگتا ہے اللہ پاک نے اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھ دیا ہے۔"

"خیر اتنا مبالغہ تو نہ کرو آمنہ! اگر اس کے سینے میں پتھر ہوتا تو وہ اس اجنبی لڑکی عافیہ سلیمان کے لیے یوں سرگرداں نہ ہوتا، یوں انصاف کا ہر دروازہ نہ کھٹکھٹاتا۔"

"پتا نہیں عافیہ سلیمان کہاں کھو گئی زمین نگل گئی اسے یا آسمان۔ ہاں لیکن اس کی ماں کو یقین ہے کہ اسے اس این جی او نے غائب کیا ہے جہاں وہ جاب کرتی تھی۔" آمنہ نے کرسی سے اٹھ کر دراز کھولی اور دراز سے کوئی فائل نکال کر واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے عروج کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"تمہیں پتا ہے عروج! ڈاکٹر فہد نے اسید کو بتایا تھا کہ اس نے عافیہ سلیمان کو نہ جانے کتنی ہی بار اس این جی اوز میں دیکھا تھا بلکہ اس کی عافیہ سے بات چیت بھی ہوتی رہتی تھی۔"

"ڈاکٹر فہد اسی این جی او میں جاب کرتا تھا؟" عروج نے پوچھا۔

"ہاں اور اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس رات اس کی ماں اس کے گھر نہ آنے پر

اس کا پتا کرنے پر این جی او کے آفس گئی تھی اس روز بھی عافیہ سلیمان آفس آئی تھی لیکن وہ لوگ صاف ہی مکر گئے کہ وہ آئی ہی نہیں پھر وہ کہاں گئی؟" عروج کو حیرت ہو رہی تھی۔

"معلوم نہیں۔۔۔۔ لیکن عروج! یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ بے چاری لڑکیاں جو اپنے گھر والوں کو بہتر مستقبل دینے اور ان کی آسائش کے لیے گھروں سے نکلتی ہیں۔ زیادہ تنخواہوں کے لالچ میں ان این جی اوز کے چکروں میں پھنس جاتی ہیں۔" آمنہ نے تفصیل بتائی۔

"یہ عافیہ بھی اسی لالچ میں اس این جی او میں آئی تھی اس کی ایجوکیشن صرف ایف اے تھی۔ باپ کی وفات کے بعد اپنے محلے میں کسی پرائیویٹ سکول میں جاب کرتی تھی جہاں اسے صرف پندرہ سو ملتے تھے پھر وہاں کسی نے مددگار نام کی اس این جی او کا ذکر کیا تھا اور پتا ہے اس کی ماں نے بتایا ہے کہ یہ لوگ اسے دس ہزار تنخواہ دے رہے تھے۔"

"اور انہوں نے اسے غائب کیوں کر دیا؟" عروج نے حیرت سے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں عروج! ان کا مقصد کیا تھا۔ ڈاکٹر فہد نے بتایا تو ہے کہ وہ لوگ بہت مذموم مقاصد رکھتے تھے گو اس نے ابھی تفصیل نہیں بتائی تاہم وہ سب کچھ لکھ رہا ہے جلد ہی اسید کو اپنی رپورٹ دے گا۔"

"لیکن آمنہ۔۔۔۔!" عروج نے جرح کی۔

"اتنے سارے لوگ جو مختلف این جی اوز میں کام کرتے ہیں سنا ہے ان کی تنخواہیں بھی اچھی ہوتی ہیں تو کیا سب این جی اوز کے پس پردہ مقاصد ایک جیسے ہیں؟"

"یار! میں کیا کہہ سکتی ہوں؟" آمنہ ہنستے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"کیا خبر کچھ این جی اوز واقعی کوئی بہت رفاعی کام کر رہی ہوں یہ اسید اور حامد اس پر کام تو کر رہے ہیں مضمون چھپیں گے تو پڑھ لیں گے۔ تو کیا اسید اب بھی مضمون لکھے گا آمنہ! جبکہ وہ شخص اس روز اتنی دھمکیاں دے کر گیا ہے۔" عروج نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اسید ہے عروج۔۔۔۔!"

آمنہ کے لہجے میں خود بخود ہی ایک فخر سا شامل ہو گیا۔

"وہ ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں۔ ماما کہتی ہیں آفتاب حسین کہتے تھے

اسید عبدالرحمٰن روشنی کا مینار ہے۔۔۔۔"

اور ایک بار پھر اسید عبدالرحمٰن دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھے ٹھٹک کر رک گیا اور
کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی کو اتنی بلندیوں پر بٹھا دیتا ہے کہ پھر خود کو ان بلندیوں کا اہل
ثابت کرنے کی کوشش میں آدمی ہانپ ہانپ جاتا ہے ابھی کچھ دیر پہلے وہ سوچ رہا تھا کہ وہ
اس آرٹیکل کو نہ چھپوائے جسے کل رات اس نے لکھا تھا اور اس میں عافیہ سلیمان کی پوری
سٹوری تھی اور اہل اقتدار سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ بیوہ ماں کی اس بیٹی کو اس نام نہاد این
جی او سے رہائی دلوائے۔ اس سے قبل اس سلسلے کے اس کے تین آرٹیکل چھپ چکے تھے اور
حامد کا ایک سروے ان این جی اوز کے متعلق چھپ چکا تھا جو صرف یہاں لاہور میں کام کر
رہی تھیں۔ ابھی اس سلسلے میں اس کا ارادہ مزید سروے کرنے کا بھی تھا بلکہ وہ ان کے اصل
مقاصد کی کھوج میں بھی تھا لیکن مسلسل دھمکی آمیز فون آرہے تھے کہ وہ اس سلسلے کو ختم کردے
ورنہ نقصان اٹھائے گا۔ ابھی کچھ دیر پہلے آفس سے اس نے ایک بے حد ذمہ دار حکومتی افسر کا
فون ریسیو کیا تھا کہ اگر اس نے یہ سلسلہ مضامین کا چھاپنے کا بند نہ کیا تو اس کے اخبار کا
ڈیکلریشن ضبط کرلیا جائے گا۔ تب اس نے سوچا تھا کیا فائدہ اگر یہ مضمون چھپ بھی گئے تو
کیا ہوگا کون سا یہ این جی اوز ختم ہو جائیں گی اور کون سی لڑکیاں ان میں جاب کرنا چھوڑ دیں
گی۔

یہاں جاب کرنے والی 80 فیصد لڑکیاں اخبار کہاں پڑھتی ہیں تو میں خوامخواہ
ڈیکلریشن ضبط کیوں کرواؤں اور فرائی ڈے ایڈیشن کے لیے کوئی اور ٹاپک دیکھ لیتا ہوں
لیکن اب ناب پر ہاتھ رکھے ہوئے اسے لگا تھا جیسے اس کے کندھوں پر کوئی بھاری سا بوجھ
آپڑا ہو اور اسے کسی کی توقعات پر پورا اترنا ہے وہ تو اندھیروں کا حصہ بننے جا رہا تھا اور آمنہ
شاہ کہہ رہی تھی وہ روشنی کا مینار ہے۔ احمد اور آفتاب حسین یکا یک ہی اس کے سامنے
آکھڑے ہوئے تھے۔

"اسید! ہمت نہ ہارنا جو لوگ ہمت نہیں ہارتے ایک وقت آتا ہے کہ راستے خود
ان کے لیے کشادہ ہو جاتے ہیں اور منزلیں بازو واکیے انہیں اپنی منتظر ملتی ہیں۔"

تو یہ طے ہوا کہ فرائی ڈے ایڈیشن میں یہ آرٹیکل چھپے گا اب چاہے ڈیکلریشن

ضبط ہو یا اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور اجازت طلب کرتا ہوا اندر آ گیا۔ آمنہ فائل
ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی اور عروج کرسی پر بیٹھے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے گرلز؟" وہ مسکرایا۔

"اسید! میں آپ کی طرف ہی آ رہی تھی یہ میں نے ہاسپٹلز کی حالت زار پر
رپورٹ تیار کی ہے میں اور صدف پچھلے دو ہفتوں سے مختلف ہاسپٹلوں کے چکر لگا رہی
تھیں۔"

اسید نے فائل لے لی۔ "او کے میں دیکھ لیتا ہوں۔"

اس نے کمرے میں نظر دوڑائی۔

"آج صدف نہیں آئی؟"

"ہاں پتا نہیں کیوں۔" عروج نے جواب دیا۔

"طبیعت خراب تھی۔" آمنہ نے جواب دیا۔

"ٹمپریچر ہو رہا تھا۔" اسید نے سر ہلا دیا۔

"عاشی کیسی ہے آ نہیں رہی؟" آمنہ نے پوچھا اسید ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا
اور فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ دراصل دادی جان کی طبیعت بگڑتی ہی جا رہی ہے۔ ٹمپریچر کم ہی
نہیں ہو رہا، ان کے چیسٹ پر انفیکشن شدید ہے سو عاشی ادھر ہی ہے۔"

"میں آج چلوں گی دادی جان کو دیکھنے عروج! تم چلو گی میرے ساتھ؟"

آمنہ عروج سے پوچھ رہی تھی جبکہ فائل میں موجود پیپر دیکھتے ہوئے اسید کے
لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ ابھری تھی۔

"یہ غالباً تم نے لکھا ہے آمنہ!" روانی میں وہ آمنہ کو اکثر تم کہہ کر بلا جاتا تھا جو
آمنہ کو بہت اچھا لگتا تھا۔

"ہاں۔۔۔۔ ایکچولی صدف کی طبیعت ٹھیک نہ تھی تو اس نے مجھے لکھنے کو کہہ
دیا۔"

"ہاں۔۔۔۔ تمہارا افسانوی رنگ جھلک رہا ہے اس سے اور یہ رپورٹ کی

بجائے دردبھرا افسانہ لگ رہا ہے۔"

"سوری۔۔۔۔یہ فائل مجھے دے دیں میں دوبارہ لکھتی ہوں۔"

"فی الحال اس میں سے فالتو جملوں کو انڈر لائن کر دیتا ہوں تمہیں انداز ہو جائے گا کہ کیسے لکھنا ہے؟"

آمنہ نے سر ہلا دیا اس کا دل کسی انوکھی لے پر دھڑک رہا تھا آج سے پہلے اسید نے کبھی اس طرح اتنی بے تکلفی سے بات نہیں کی تھی۔

"تو کیا محبت کی آنچ نے اس کے دل کو بھی پگھلا دیا ہے۔" اس نے سوچا ابھی کچھ دیر پہلے عروج نے ہی تو کہا تھا کہ

"محبت کی آنچ تو پتھر سے پتھر دل کو بھی پگھلا دیتی ہے اور اسید اتنا پتھر بھی نہیں کہ اسے آمنہ شاہ کی آنکھوں میں کھلتے محبتوں کے پھول نظر نہ آئیں، نہ ہی وہ اتنا کوتاہ بین ہے کہ تمہارے گالوں پر بکھرتے رنگوں کو کوئی مفہوم نہ دے جو اسے دیکھ کر یکدم تمہارے رخساروں پر ہولی کھیلنے لگے ہیں۔" تب اسے عروج کے جملوں پر ہنسی آئی۔

"یار! تم بھی کسی افسانہ نگار سے کم نہیں ہو افسانے لکھنا شروع کر دو۔"

اور عروج نے دل گرفتگی سے سوچا تھا۔

"بھلا وہ کیسے افسانے لکھ سکتی ہے چند لفظ بول دینے سے بھلا کوئی افسانہ نگار بن سکتا ہے۔ افسانہ نگار تو آمنہ شاہ کی طرح پیدائشی ہوتا ہے لیکن اس کے اندر ایک چھپی ہوئی خواہش نے چٹکی ضرور بھری تھی کاش ایسا ہو کہ کبھی وہ بھی لکھ سکے آمنہ شاہ کی طرح۔۔۔۔"

تب اسید عبدالرحمٰن کے موبائل کی بیل ہوئی تو عروج اور آمنہ دونوں ہی اپنے خیالوں سے چونک کر اسید کو دیکھنے لگیں اسید نے ہاتھ میں پکڑی فائل میز پر رکھ کر پاکٹ سے فون نکالا۔

"ارے ڈاکٹر فہد آپ! خیریت۔۔۔۔"

"کیا عافیہ سلیمان کا پتا مل گیا؟"

"اوہ۔۔۔۔کہاں کیا یہ ممکن ہے کہ اس سے بات ہو سکے؟"

"اوکے۔۔۔۔میں آرہا ہوں۔"

اس نے سیل آف کر کے دنوں کی طرف دیکھا۔

"میں ذرا ڈاکٹر فہد کی طرف جارہا ہوں اگر حامد یا فیصل میں سے کوئی آجائے تو انہیں بتا دینا کہ فرائی ڈے اسپیشل میں میرا این جی او والا آرٹیکل بھی لگے گا۔"

اور وہ انہیں خدا حافظ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

"کیا ہوا اسید!" حامد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو؟"

اسید نے سر اٹھاتے ہوئے گہری سانس لی۔

"تم جب سے آئے ہو یوں اپ سیٹ سے لگ رہے ہو؟"

"ہاں میں رات بھر سو نہیں سکا۔" اسید نے پیشانی پر آئے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کیا۔

"کیوں خیریت تھی؟"

"پتا نہیں۔۔۔۔" اسید نے دل گرفتی سے کہا۔

"عافیہ سلیمان کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔"

"کیا۔۔۔۔؟" حامد اچھل پڑا۔

"آمنہ نے بتایا تھا کہ تم اس سے ملنے گئے ہو۔"

"ہاں۔۔۔۔۔۔لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں پولیس تھی اور۔۔۔۔۔"

حامد الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں علم تو ہے حامد! ڈاکٹر فہد اس این جی او میں ملازمت کرتا تھا جہاں عافیہ بھی جاب کرتی تھی۔ فہد نے مجھے بتایا تھا کہ عافیہ بہت پریشان تھی وہ لوگ اسے کسی ایسے کام کے لیے مجبور کر رہے تھے جو وہ نہیں کرنا چاہتی تھی اس نے ایک روز فہد سے کہا تھا کہ وہ جاب چھوڑنا چاہتی ہے لیکن اسے ڈر ہے کہ یہ لوگ اسے نقصان پہنچائیں گے۔ ڈاکٹر فہد نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ اس طرح کا خوف کیوں محسوس کر رہی ہے۔ تو اس نے کہا تھا کہ وہ فون پر اس سے بات کرے گی اور یہ کہ اسے اس کی مدد کی ضرورت ہے۔ فہد نے اسے اپنا سیل نمبر دے دیا اور اس سے اگلے روز کی بات ہے کہ آفس نہیں آئی اور اس این جی او کے کرتا دھرتا

نعیم ملک نے بتایا کہ وہ جاب چھوڑ گئی ہے اور اسی شام عافیہ سلیمان کی ماں اسے تلاش کرتی ہوئی آفس آئی تھی جبکہ آفس والوں نے اس کی آفس آمد سے ہی انکار کر دیا تھا اس کی ماں کو بتایا کہ وہ تو بہت دنوں سے آفس نہیں آرہی جب عافیہ کی ماں کی اپیل ایک اخبار میں چھپی تو فہد نے مجھے فون کر کے اس کے متعلق بتایا اس کا خیال تھا کہ شاید عافیہ نے واقعی جاب چھوڑ دی ہوگی یہ تو اخبار سے اسے پتا چلا تھا کہ وہ گھر نہیں پہنچی۔ یکم دسمبر کی صبح وہ گھر سے نکلی اور واپس نہیں پہنچی۔''

اسید حامد کو تفصیل بتا رہا تھا اور حامد بہت توجہ سے سن رہا تھا۔

''میں نے فہد سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق عافیہ کے متعلق ساری تفصیل اپنے آرٹیکل میں لکھ دی تھیں کہ دو ماہ سے اس کی ماں بیٹی کی تلاش میں خوار ہو رہی ہے اور میں نے فہد کو اس کے متعلق بتایا تھا کہ کل صبح فہد کا فون آگیا کہ عافیہ نے اسے فون کیا ہے وہ اس سے ملنا چاہتی ہے وہ کسی پرائیویٹ ہاسٹل میں تھی۔''

''وہ اپنے گھر کیوں نہیں گئی۔۔۔۔؟''

حامد نے پوچھا تو اسید افسردگی سے مسکرایا۔

''کاش۔۔۔۔ یہ بتانے کے لیے وہ زندہ رہتی، وہ فہد سے مل کر اسے سب کچھ بتانا چاہتی تھی فہد نے مجھے فون کر دیا لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو وہ نہیں رہی تھی۔''

''یہ این جی او کیا کام کرتی ہے؟'' حامد نے پوچھا۔

''اس کا کام دیہی علاقوں میں لوگوں کے پروگرام کا جائزہ لینا۔ ان کی طبی سہولتوں کا جائزہ لینا، ان میں شعور پیدا کرنا، انہیں حفظانِ صحت سے آگاہ کرنا، جس میں فیملی پلاننگ بھی شامل ہے اور پھر ان Activties کی رپورٹ لکھنا ہے۔'' اسید نے تفصیل بتائی۔

''اگر مقصد صرف یہ ہو تو یہ بہت اچھے مقاصد ہیں۔'' حامد نے آہستگی سے کہا۔

''لیکن افسوس۔۔۔۔۔''

''تم بتاؤ جس این جی او کے متعلق تحقیق کر رہے تھے اس کے متعلق کیا جانا؟''

''یہ دراصل فورم کے نام سے بنائی جانے والی تنظیم کی طرح کی ایک این جی او

ہے۔ درون خانہ مقاصد تو ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوئے مجھ پر، لیکن جلد ہی پتا چل جائے گا، بظاہر یہ انسانی حقوق، حقوق نسواں، خواتین کے خلاف امتیازی سلوک اور Gender Balance کے نعرے لگا رہے ہیں اس کی بانی بیگم نصر اللہ سے ملا ہوں ان کا انٹرویو لیا ہے۔''

''فائن۔۔۔۔۔'' اسید کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''کیا فرمایا محترمہ نے۔۔۔۔؟''

''یہی کہ انہوں نے یہ این جی او مظلوم عورتوں کے حقوق حاصل کرنے کے لیے بنائی ہے عورت جس کا استحصال کیا جا رہا ہے۔''

''جتنے حقوق عورت کو اسلام نے دیئے ہیں اتنے حقوق تو دنیا کے کسی مذہب نے نہیں دیئے؟'' صدف نے جو کچھ دیر پہلے خاموشی سے آکر ایک طرف بیٹھ گئی گفتگو میں مداخلت کی۔

''یہ جن رسموں ورواج کا سہارا لے کر مسلمان عورت کی مظلومیت کا رونا ساری دنیا کے سامنے میڈیا پر کرتی پھر رہی ہیں وہ رسم ورواج جہالت اور لاعلمی کا نتیجہ اور اسلام سے دوری کی وجہ سے ہیں اسلام تو ان کی حمایت نہیں کرتا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو صدف! کاش کوئی ریفارمر ان کو شعور دے، ان میں صحیح اسلام کی تبلیغ کرے، یہ نام نہاد فلاحی انجمنیں اور این جی او صرف اپنا مقصد نکالنا چاہتی ہیں۔ تم ایسا کرو مسلمان عورت کے حقوق کے متعلق کچھ آرٹیکل لکھ ڈالو۔'' صدف نے آہستہ سے سر ہلا دیا تو اسید کو یاد آیا کہ اس کی طبیعت خراب تھی۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے اب۔۔۔؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''اور دادی جان اور احمد کی والدہ کی طبیعت کیسی ہے بہت دنوں سے جا نہیں پایا ہوں۔''

''ٹھیک ہیں تمہیں یاد کرتی ہیں لیکن تمہاری مصروفیات سے بھی باخبر ہیں۔'' صدف نے بتایا تب ہی حامد نے اس کی طرف دیکھا۔

''صدف! اگر تمہیں اپنے آرٹیکل کے لیے کچھ معلومات چاہیں تو میں تمہاری Help کرسکتا ہوں۔ 1995ء میں بیجنگ میں بے نظیر کی حکومت میں عورتوں کے حقوق کے متعلق کانفرنس ہوئی تھی اس کے بعد اڑتالیس ممالک کے سفارت خانوں میں ایسے دفاتر کھولے گئے جو ایسے لوگوں کو امداد دیتے تھے جو خواتین کی امداد کے نام پر ادارے یا این جی اوز بناتے تھے۔ انہیں دفاتر، کمپیوٹر، کیمرے اور ملٹی میڈیا سے لے کر گاڑی تک فراہم کی جاتی تھی۔''

صدف بے حد دھیانی سے سن رہی تھی۔

''دراصل این جی اوز کے سلسلے میں تحقیق کرتے ہوئے میرے علم میں یہ ساری معلومات آئیں، مختصر تمہیں بتا رہا ہوں کہ شاید اس میں سے کچھ تمہارے کام آسکے تو میں کیا بتا رہا تھا کہ ان افراد کو ورکشاپ کروانے، کانفرنس کرنے اور احتجاج کرنے کیلئے پیسہ دیا جاتا تھا۔ دراصل امریکہ کی نیشنل سیکورٹی ریسرچ نے پوری مسلم امہ کے خلاف جامع منصوبہ بنایا تھا 2003ء میں جس کا نام تھا۔

Civil Democratic Islam Parters,Resoursces and strategies

اس کی دو اہم شقوں کے متعلق میں تمہیں بتاتا ہوں ایک تو یہ کہ ماڈرن اسکالرز کو سامنے لایا جائے، انہیں چینلز پر مواقع دیے جائیں، ایسے اخبارات اور چینلز کو پیسہ دیا جائے جو اسلام کے خلاف کم علم علما کو سامنے لائیں اور دوسرا یہ کہ مسلمان عورت کو ہر طرح سے تحفظ دیا جائے۔ اسے اعلیٰ تعلیم اور جابز کے مواقع دیئے جائیں، اس کو احساس دلایا جائے کہ وہ بہت گھٹن اور پابندی کی زندگی گزار رہی ہے، اسے آزادی کے نام پر بے راہ روی طرف مائل کرنا، اسے آزاد زندگی گزارنے کی ترغیب دینا، اسے اتنی سہولتیں مہیا کرنا کہ وہ شادی کرنے کے بجائے خود مختار زندگی گزارنے کی طرف مائل ہو جائے، ایسے ایشوز کو سامنے لایا جائے کہ پتا چلے کہ مسلمان عورت دنیا کی مظلوم ترین عورت ہے، مختاراں مائی کا ایشو بھی مجھے ایسا ہی ایک ایشو لگتا تھا۔''

''کیا یورپی ممالک میں مختاراں مائی جیسی عورتیں نہیں ہوتیں؟'' صدف نے کہا۔

''کیوں نہیں ہوتیں؟'' اسید عبدالرحمٰن نے اس کی طرف دیکھا۔

''یورپ کی عورت تو بہت قابل رحم ہے وہاں تو کم عمر بچیاں۔۔۔۔''

اور تب ہی دروازہ کھلا اور آمنہ نے اندر جھانکا، ہمیشہ کی طرح بہت فریش اور شگفتہ سی۔۔۔۔ لمحہ بھر کے لیے اسید کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہریں اور پھر فوراً ہی اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

''اسلام علیکم!'' وہ سب کو سلام کرتی ہوئی اندر آگئی۔

''کیسی ہو صدف! شکر ہے تم آگئیں سچ۔۔۔۔۔ بہت بوریت ہو رہی تھی ان دنوں عاشی اور عروج بھی نہیں آرہی اور وہ سعید بھی آج کل بہت بری طرح سے اپنی سٹڈی میں مصروف ہے۔''

تیز تیز بولتی ہوئی وہ صدف کی کرسی کے ہتھے پر ہی ٹک گئی اور پھر اسید کی طرف دیکھا۔

''اسید! تمہاری ملاقات ہوئی عافیہ سے؟''

''کیا کہا۔۔۔؟ تم نے آج صبح کا اخبار نہیں دیکھا؟'' اسید کے بجائے حامد نے پوچھا۔

''نہیں تو کیا ہوا۔۔۔؟''

''عافیہ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔''

''اوہ نو۔۔۔'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''کب۔۔۔؟ کیسے۔۔۔؟ اسید کی ملاقات سے پہلے۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔'' اسید نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔

''اور ڈاکٹر فہد تو ٹھیک ہے نا۔۔۔؟''

''ہاں، فہد تو ٹھیک ہے تمہارا مطلب اوہ نو۔۔۔''

اسید عبدالرحمٰن یکدم پریشان نظر آنے لگا۔

''تم صحیح سوچ رہی ہو۔ مائی گاڈ! مجھے پہلے اس کا خیال ہی نہیں آیا جو لوگ عافیہ کو قتل کر سکتے ہیں وہ ڈاکٹر فہد کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔'' بات کرتے کرتے اس نے فون اپنی طرف گھسیٹا اور فہد کا نمبر ملانے لگا۔

اسے چند ہی ملاقاتوں میں یہ نوجوان ڈاکٹر فہد بے حد عزیز ہو گیا تھا اس کی باتوں سے وطن کی محبت خوشبو آتی تھی۔ بہت سچا کھرا اور بولڈ لڑکا تھا۔

"ہیلو۔۔۔ہیلو۔۔۔۔۔ڈاکٹر فہد سے بات کرنی ہے۔" شاید نمبر مل گیا تھا۔

تینوں اسید کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"میں ڈاکٹر فہد بول رہا ہوں اسید! خیریت ہے۔۔۔۔" دوسری جانب سے ڈاکٹر فہد پوچھ رہا تھا۔

"اوہ ہاں۔۔۔۔" اسید نے اطمینان بھرا سانس لیا۔

"میں نے پریشانی میں تمہیں پہچانا نہیں، میں تمہارے لیے پریشان ہو رہا ہوں۔ یار! وہ لوگ تمہارے لیے بھی خطرہ ہو سکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ میرے متعلق نہیں سوچ سکتے، میرا تعلق تو طبی شعبے سے تھا، یہ جو کچھ میرے علم میں آیا اتفاقاً تھا اور عافیہ سے نہ تو وہاں میری بات چیت اکثر ہوتی تھی اور نہ ایسی کوئی خاص ملاقات تھی، یہ تو صرف دو تین بار وہ میرے کلینک میں آئی تھی اپنی آنکھیں چیک کروانے کے لیے الرجی ہو گئی تھی تو اتفاق سے میں اکیلا تھا تو اس نے بات کی۔ میں چونکہ ان دنوں ان کی سرگرمیوں سے متعلق کچھ مشکوک ہو چکا تھا تو میں نے اس کی Help کا وعدہ کیا تھا۔" فہد نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"بہرحال اپنا خیال رکھنا بہت۔۔۔۔"

"او کے۔۔۔۔تھینک یو۔۔۔۔" فون بند کر کے اس نے فہد کی گفتگو سے انہیں آگاہ کیا۔

"تو میرے لیے اب کیا حکم ہے سر!" حامد نے قدرے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں تم اپنا آرٹیکل مکمل کر لو میں چاہتا ہوں دونوں آرٹیکل ایک ہی ایڈیشن میں آ جائیں اسی فرائی ڈے کو۔۔۔۔"

"او کے۔۔۔۔"

حامد اٹھ کھڑا ہوا تو اسید ٹیبل پر بکھرے کاغذات کو اکٹھا کر کے فائل میں رکھنے لگا۔

"اسید! جو لوگ عافیہ کو قتل کر سکتے ہیں وہ ان آرٹیکل کے چھپنے کے بعد تمہارے

بھی تو دشمن ہو سکتے ہیں۔" آمنہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

"پھر۔۔۔۔؟" اسید نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔

"کیا ان آرٹیکلز کے چھپنے کا کوئی فائدہ ہو گا اسید۔۔۔۔!" آمنہ اب اسے دیکھ رہی تھی۔

"معلوم نہیں آمنہ! اگر نہ بھی ہو تو ایک کوشش تو کی ہے نا ہم نے، حکومت کو لوگوں کو آگاہ کرنے کی، کہ یہ ہے ان کا اصل چہرہ۔۔۔۔ہماری مجبوری یہ ہے آمنہ شاہ! کہ ہم بہت سے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں بے روزگاری، لامحدود خواہشات، آسائشوں کی طلب ہمیں اندھا دھند بھگا رہی ہے۔

ہمیں جہاں پیسہ زیادہ ملتا ہے ہم ادھر ہی لپکتے ہیں، ان آرٹیکلز کو پڑھ کر چند افراد نے بھی ان کے جال میں آنے سے خود کو بچا لیا تو یہ میرے نزدیک کامیابی ہے۔ بڑی نہ سہی چھوٹی کامیابی ہی سہی۔۔۔۔کہیں نہ کہیں سے تو کام کی ابتدا کرنی ہے نا آمنہ!"

اس نے بے حد ٹھہرے انداز میں سمجھایا تو آمنہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا وہ صحیح کہتا تھا کہ

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے نا تو پھر یہاں سے ہی سہی۔ لیکن کیا اس شخص کے دل میں کبھی میرا بھی خیال آتا ہو گا۔

میں آمنہ شاہ۔۔۔۔۔جو اپنے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ہر لمحہ تمہیں سوچتی ہوں اور ہر لمحہ میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کیا کبھی آمنہ شاہ کو اسید عبدالرحمٰن کی رفاقت مل سکتی ہے؟"

"آمنہ۔۔۔۔!" صدف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی۔

"چلیں اپنے کمرے میں۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو! مجھے ابھی فرائی ڈے ایڈیشن کے لیے اپنی رپورٹ مکمل کر کے دینی ہے حامد کو۔۔۔۔" اسید بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تم کہیں جا رہے ہو اسید۔۔۔۔!" صدف نے پوچھا۔

"ہاں مجھے ذرا حسن پرنٹنگ پریس تک جانا ہے اخبار کے سلسلے میں کچھ بات کرنا ہے۔"

"نوید سحر" حسن پرنٹنگ پریس سے ہی چھپتا تھا۔

"خیریت ہے نا؟ انہوں نے بصیر پرنٹنگ والوں کی طرح ہمارا اخبار چھاپنے سے انکار تو نہیں کر دیا۔" صدف نے بے اختیار پوچھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں کچھ اور مسئلے ہیں۔"

اسید اپنا موبائل اٹھا کر باہر نکل گیا تو آمنہ اور صدف بھی اس کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ ہال میں فیصل اور حامد کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے اور سعید ٹیبل پر پڑی ہوئی تصویروں کو چھانٹ رہا تھا جبکہ دلیر اس کے پاس خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔

"صدف! تمہیں اپنے آرٹیکل کے سلسلے میں اگر کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو مجھے بتانا میرے پاس اسلام میں عورت کے حقوق پر ایک کتاب بھی ہے وہ میں تمہیں لا دوں گا۔"

حامد نے بات کرتے کرتے مڑ کر صدف سے کہا اور صدف سر ہلاتی ہوئی آمنہ کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں وہ تینوں بیٹھتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"نی سیوا سی نیناں دے آکھے لگے"

کتاب گود میں دھرے آنکھیں بند کیے آگے پیچھے جھومتے ہوئے سعید گنگنا رہا تھا جب عاشی، آمنہ صدف اور عروج آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ پڑھائی ہو رہی یا ریاض؟" عاشی نے آگے بڑھ کر کتاب اسکی گود سے اٹھا لی۔

"ہائے۔۔۔۔نی سیوا سی نیناں دے آکھے لگے"

نیم وا آنکھوں سے عاشی کو دیکھتے ہوئے وہ پھر گنگنایا۔

"آنکھیں کھولو۔ دیکھو کون آیا ہے۔"

"اوے۔۔۔۔ہاں ہاں۔۔۔۔" اس نے آنکھیں کھولیں اور یکدم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"بڑی بڑی ہستیاں تشریف لائی ہیں آج غریب خانے پر آیئے! آیئے! حضور۔۔۔۔!" وہ تھوڑا سا جھکا۔

"زہے نصیب اتنی بڑی افسانہ نگار اور کالمسٹ نے ہمارے غریب خانے پر قدم رکھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔۔۔۔پھول بچھاؤں۔"

"بکومت۔۔۔۔" عاشی نے بیٹھتے ہوئے تینوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"نانو کہاں ہیں یہ سب نانو کی مزاج پرسی کے لیے آئی ہیں۔"

"تمہاری نانو اور ہماری دادو اس وقت دادا جان کے ساتھ گھومنے نکلی ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ نانو ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں نانا جان کے ساتھ۔ تم نہیں جا سکتے تھے ساتھ۔۔۔۔؟"

"ہاں جا سکتا تھا؟" سعید نے سر کھجایا اور کمرے میں پڑی اکلوتی میز پر اچھل کر بیٹھ گیا۔

"لیکن افسوس وہ میرے کالج سے واپس آنے سے پہلے ہی اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک تک چہل قدمی کر کے واپس آ گئے تھے۔"

"توبہ سعید! تم کس قدر فضول بولتے ہو؟" عاشی نے عاجز آ کر کہا۔

"نانو کہاں ہیں۔۔۔۔؟"

"ظاہر ہے عاشی بی بی! اپنے کمرے میں ہوں گی یہ کمرہ جس میں آپ تشریف فرما ہیں میرا اور راحیل کا ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم نانو کے کمرے میں جا رہے ہیں۔" عاشی نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ فوراً بول اٹھا۔

"ارے نہیں۔۔۔۔اب اگر اس کمرے کی قسمت جاگ ہی اٹھی ہے کہ اتنی اہم ہستیاں یہاں تشریف لائی ہیں تو یہاں سے جا کر اس کی قسمت کو سلانے کی کوشش نہ کریں یوں بھی دادی جان محترمہ اس وقت خواب استراحت کے مزے لے رہی ہیں اور دادا جان کری پر نیم دراز عمرو عیار کے کارنامے پڑھ رہے ہیں اور گا ہے بگاہے ان پر نظر بھی ڈال لیتے ہیں۔" عاشی نے اس کی اس اتنی لمبی چوڑی گفتگو پر برا سامنہ بنایا۔

"اسید بھائی اور ماموں بھی نظر نہیں آ رہے۔"

"اسید بھائی اور تمہارے ماموں کچھ دیر پہلے ہی گھر سے باہر نکلے ہیں، لیکن چونکہ اس وقت میں یہ غور کر رہا تھا کہ ہم آخر نینو کے آ کھے ہی کیوں لگتے ہیں اور یہ دونیاں کب ہمیں مشورے دینے لگتے ہیں اور مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان بے چاری گونگی آنکھوں پر الزام کیوں لگایا جاتا ہے۔ خواہ مخواہ میں اور میرا دل ان کی مظلومیت پر اتنا رنجیدہ ہو رہا تھا کہ میں پوچھ ہی نہ سکا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔"

تب ہی راحیل ٹرے میں کوک کے گلاس رکھے اندر داخل ہوا۔

"اٹھیے، سعید بھائی! میز خالی کریں۔"

"اوہ۔۔۔ہاں۔۔۔میز کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔"

"ماشاءاللہ بہت سگھڑ ہے میرا بھائی۔۔۔!"

راحیل نے ٹرے ٹیبل پر رکھا اور گلاس اٹھا کر سب کو دیئے۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" عروج نے گلاس لیتے ہوئے کہا۔

"ابھی ہم عاشی کے گھر پی کر آئے ہیں۔"

"اوہ۔۔۔اچھا!" سعید نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا صدف نے پوچھا۔

"سعید دادی جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اسید بہت پریشان تھا کل۔۔۔"

"ٹمپریچر کیوں نہیں اتر رہا؟"

"ایکچولی ملیریا بگڑ گیا تھا اب کافی بہتر ہیں۔ پہلے ڈاکٹر یوں ہی دوا دیتا رہا۔ دو دن پہلے ہی تو ٹیسٹ کروایا تو پتا چلا کہ ملیریا ہے۔"

"یہ ڈاکٹر بس ایویں ہی ہوتے ہیں صدف! یوں ہی بس تکے سے دوائیاں دے دے کر مریض کو مار ڈالتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر ڈاکٹر بننے کی ضرورت ہی کیا ہے جب مریض کو مارنا ہی ہے تو بے چارے کو بغیر علاج کے ہی مرنے دیں۔ اچھا خاصا دوائیوں کا خرچ بچ جائے گا۔" عاشی کو اب موقع ملا تھا سعید کو تنگ کرنے کا۔

"ہاں۔۔۔واقعی میں اکثر سوچتا ہوں بالکل ایسا ہی ہے یہ ہم دونوں کی سوچ کتنی ملتی ہے نا؟"

صدف اور آمنہ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ تب ہی ایک طرف کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑے راحیل نے کہا۔

"بھائی! میں تو جا رہا ہوں ٹیوشن، پھر چائے آپ خود بنا لیجیے گا۔"

"ہاں ہاں تم جاؤ۔" اس نے اپنا گلاس خالی کر کے میز پر رکھا۔

"یہ ہے نا عاشی۔۔۔اپنا ہی گھر ہے اس کا، کل بھی تو اس نے ہی میزبانی کرنی ہے، تو آج۔۔۔۔"

"جی نہیں۔" عاشی نے اس کی بات کاٹی۔

"آج تو میں مہمان ہوں چائے تم بناؤ گے۔" آمنہ نے ایک نظر عاشی پر ڈالی۔

"تو۔۔۔اسید کے ساتھ عاشی۔۔۔"

"یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے میرا دھیان اس کی طرف نہیں گیا اور اسے لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔

"کیا یوں بھی ہوتا ہے ابھی تو دل نے اسید کے نام پر دھڑکنا شروع کیا تھا ابھی تو آنکھوں میں خواب اترے تھے۔"

"اور بڑی گھنی ہو تم!" عروج نے عاشی کی کمر پر مکا مارا۔

تو وہ چونک کر عاشی کو دیکھنے لگی۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" عاشی منمنا رہی تھی۔

"اس سے پوچھو۔۔۔"

"میں کیا بتاؤں؟"

سعید دانتوں تلے انگلی دبائے شرمانے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

"جوں ہی میں نے دنیا میں آنکھ کھولی تو بس ہماری پھپھو صاحبہ نے جھٹ پٹ اپنی بیٹی کا نام ہمارے ساتھ لگا دیا کہ اتنا سوہنا منڈا ہے کہیں کوئی اغوا ہی نہ کر لے بڑا ہونے پر۔"

"پڑوس میں بالا گجر بھی تو رہتا ہے نا۔" عاشی شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تو۔۔۔تو تم۔۔۔اور سعید۔" آمنہ نے اک اک کر کے اپنا جملہ مکمل کیا۔

"یعنی تم دونوں کی انگیجمنٹ ہو چکی ہے۔" اندر جیسے ایک بار پھر سے چراغاں ہو گیا۔

"پتا نہیں یہ انگیجمنٹ ہے یا کیا ہے؟ بس دادی نے اسی وقت ایک لڈو پھوڑ کے منہ میں ڈالا اور کہا، لو۔۔۔منہ میٹھا کرو آج سے منڈا تمہارا ہے۔"

"بکومت۔۔۔اماں کی تب شادی بھی نہیں ہوئی جب تم پیدا ہوئے تھے۔" عاشی جھینپ رہی تھی۔

"تو بعد میں جب مامی بیمار تھیں تو انہوں نے اماں سے مجھے مانگ لیا تھا۔"

"چلو بعد میں سہی۔۔۔لیکن تمہاری اماں تو مجھ پر فدا تھیں نا، نہیں تو اسید بھی تھا اور راحیل بھی تھا۔"

"تم خود ہی ہر وقت اماں کی گود میں گھسے رہتے تھے تو قدرتی بات ہے اماں کو تم سے محبت تھی اور جب مامی نے کہا تو انہوں نے تمہارا نام دے دیا۔"

"ویسے۔۔۔" وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔

"یہ اماں نے اپنی محبت کچھ تمہاری طرف بھی منتقل کی ہے یا نہیں؟"

عاشی کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی، وہ تینوں ان کی باتوں کو انجوائے کر رہی تھیں جب سعید نے ٹرے اٹھا کر راحیل کو پکڑائی۔

"یہ تم کھڑے کھڑے کیا دانت نکال رہے ہو؟ ٹیوشن پر نہیں جانا؟"

"تم پڑھا دیا کرو نا اسے؟" عروج نے مشورہ دیا۔

"پتا نہیں ٹیوشن سنٹر میں کیسا پڑھاتے ہیں؟ پیسہ کمانے کا ذریعہ ہے سب۔"

"مشورہ اچھا ہے عروج بی بی۔۔۔!" سعید اچھل کر پھر ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

"لیکن یہ ٹیوشن لینے نہیں دینے جاتا ہے اور یہ حضرت خود اس قدر تیز ہیں کہ میرے جیسے دس بندوں کو پڑھا دیں مجھ سے کیا پڑھنا ہے اسے؟"

"یعنی این مہ خانہ آفتاب است۔" عاشی نے اپنی فارسی کی لیاقت جھاڑی۔

"تمہیں فارسی پڑھنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟" سعید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"فارسی میں نمبر زیادہ آتے ہیں ہماری کلاس کی سب لڑکیوں کے آپشنل میں فارسی ہی رکھا تھا۔"

"ہائے۔۔۔کاش مجھے بھی کوئی مشورہ دے دیتا فارسی رکھنے کا، خیر مستقبل میں تم سے پڑھ لوں گا، بہت کام آتی ہے فارسی، ویسے تم اب کیوں نہیں فارسی میں ماسٹر کر لیتی خواہ مخواہ ٹائم ضائع کر رہی ہو۔"

"جی نہیں، میں نے وقت تو ضائع نہیں کیا نانو نے منع کیا تھا مجھے ایڈمیشن لینے سے۔"

"اوہ ہاں۔۔۔تو نے تو ہاؤس جاب بھی کرنی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ عاشی نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر آمنہ کی طرف دیکھا۔

"آمنہ! کیا انگلش میں ماسٹر کرنا بہت مشکل ہے؟"

"نہیں خیر ایسا مشکل بھی نہیں، شوق ہو تو سب کچھ ممکن ہے اب کے ایڈمیشن کھلیں تو تم لے لینا۔"

"بی اے میں میرے پاس اسلامیات ہسٹری اور اردو تھی کیا پھر بھی میں۔۔۔"

"چھوڑو یار! انگلش میں کیا رکھا ہے مجھے بالکل پسند نہیں ہے انگلش، اب دیکھو نا انگریزی ادب کا ہمارے احساسات سے کیا تعلق؟ ہمارے ہاں آہ ہوتا ہے ان کے ہاں آوچ ہے اور پھر انگریزی میں عشق نہیں ہوتا محبت ہوتی ہے یعنی Love لیکن محبت بھی کہاں ہوتی ہے ویسے آمنہ جی! عشق کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟"

آمنہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔

"دیکھا۔۔۔" اس نے چٹکی بجائی۔

"تم اتنا کیوں بولتے ہو سعید؟" عاشی زچ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"میں اس لیے بولتا ہوں کہ تم مجھے یاد رکھو ایسے ہی جیسے کوئی بادشاہ اس۔۔۔"

وہ غالباً خلیل جبران نے کہا ہے۔

''اور مجھے اس وقت بالکل بھول گیا ہے کہ خلیل جبران نے کیا کہا تھا۔''

''آمنہ کو پتا نہیں کیوں لگا جیسے اس کی آواز کی شوخی اچانک ختم ہوگئی ہو لیکن جب اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ویسی ہی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں یوں ہی چمک رہی تھیں۔

''ویسے آمنہ جی!'' اس نے آمنہ کو اپنی طرف دیکھتے پا کر پھر سے بولنا شروع کر دیا تھا۔

''آپ لوگوں نے ادب کو شیکسپیئر کے عامیانہ ڈراموں تک ہی کیوں محدود کر دیا ہے، حیرت ہے کسی نے خلیل جبران، حافظ اور شیرازی کی تہہ دلی کو محسوس نہیں کیا۔''

''آمنہ جی! کبھی جبران اور حافظ کو پڑھ کر دیکھیں۔''

''میں چائے بنا کر لاتی ہوں آپ ادھر ہی دادی جان کے کمرے میں آجائیے گا میں دیکھتی ہوں اگر وہ جاگ رہی ہیں تو۔۔۔۔''

''لو جی اسید بھائی بھی آگئے۔'' وہ جہاں ٹیبل پر بیٹھا تھا وہاں قریب ہی کھڑکی سے باہر گلی کا منظر نظر آ رہا تھا۔

آمنہ کی آنکھیں یکدم جگمگا اٹھیں وہ دن میں نا جانے کتنی بار اسید کو دیکھتی تھی اور ہر بار اسے لگتا تھا جیسے نہ جانے کب سے وہ اسید سے نہیں ملی اور ہر بار ہی اس کی پرشوق نظروں میں یوں ہی جگمگاہٹیں اتر آتی تھیں۔

غیر ارادی طور پر وہ کھلے دروازے سے باہر دیکھ رہی تھی سعید ہولے سے کھنکھارا اس کے لبوں پر بڑی شریر سی مسکراہٹ تھی آمنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں کچھ نہیں۔۔۔۔آمنہ جی! آپ بڑے شوق سے باہر کا نظارہ کریں میں تو یوں ہی کھانسا تھا گلے میں خراش پڑ گئی تھی۔''

آمنہ اس کی بات سمجھ نہیں سکی تھی جبکہ صدف کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی تھی۔ تب ہی اسید صحن میں نظر آیا اور پھر وہ دادی جان کے کمرے کی طرف جاتے جاتے سعید کے کمرے کی طرف مڑ گیا شاید عاشی نے کچن سے آواز دے کر اسے بتایا تھا۔

''اسلام علیکم۔۔۔۔!'' کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے سب پر ایک اچٹتی سی نظر دوڑائی اور لمحہ بھر کے لیے اس کی نظریں آمنہ کے چہرے پر ٹھہریں تھیں پھر اس نے سعید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ سعید کچھ بتاتا عاشی نے دروازے کے باہر سے آواز لگائی۔

''دادی جان جاگ چکی ہیں۔''

''اوہ اچھا آمنہ سب سے پہلے کھڑی ہوئی تھی۔''

''ہم سب دادی جان کی مزاج پرسی کے لیے آئے ہیں۔'' آمنہ نے اس کے الجھے سے انداز کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

''اوہ۔۔۔۔۔۔۔تھینکس۔'' وہ چونک کر ایک طرف ہٹا۔

''دادی جان اب تو کافی بہتر ہیں لیکن پچھلے دنوں بہت طبیعت خراب ہوگئی تھی ان کی، وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تفصیل بتانے لگا۔'' دادی جان انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

''خوش رہو۔۔۔۔سکھی رہو'' انہوں نے سب کو دعا دی۔

''آمنہ جگہ نہ ہونے پر ان کے پاس ہی ان کی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ عاشی نے میز درمیان میں رکھ کر چائے کی ٹرے رکھی تھی ساتھ میں نمکو، بسکٹ اور سموسے بھی تھے۔

''ارے اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟'' صدف نے عاشی کی طرف دیکھا لیکن جواب اسید نے دیا۔

''تکلف کہاں؟ یہی کچھ میسر ہوتا ہے۔ گھر میں کوئی خاتون تو ہے نہیں کہ کچھ بنا کر محظوظ کر دے۔''

''یعنی کچھ کیا؟'' عروج کے لہجے میں شرارت تھی۔

''یہ کباب، نگٹس وغیرہ۔۔۔۔''

سعید نے سموسہ اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''تو کب سے کہہ رہا ہوں تمہاری دادی جان سے کہ اب اسید کی شادی ہو جانی چاہیے لیکن ہماری بات تو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دی جاتی ہے۔''

"ارے مانے بھی تو تب نا۔۔۔؟"

"میں۔۔۔میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" اسید سٹپٹایا۔

"تو مطلب نہیں تھا تب بھی، اب سیٹل ہو گئے ہو اخبار بھی چل رہا ہے تو۔۔۔"

"نہیں دادا جان۔۔۔" اسید نے ان کی بات کاٹی۔

"ابھی نہیں آپ پہلے سعید کی کر دیں۔"

"اور وہ کہے گا میں نے ابھی امتحان دینا ہے۔ ہاؤس جاب کرنی ہے پھر پارٹ ون کرنا ہے پارٹ۔۔۔"

"ارے نہیں دادا جان! آپ اپنی خوشی پوری کریں باقی سب تو چلتا رہے گا۔"

"حاضر ہوں جان و دل سے کیڑا ہوں گرچہ میں ذرا سا۔۔۔"

اس نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر سر خم کیا۔

"میں تو چاہتی ہوں دونوں کی اکٹھی ہی کر دوں۔" دادی جان نے محبت بھری نظر دونوں پر ڈالی۔

"رہے راحیل اور وحید تو دونوں ابھی چھوٹے ہیں جب سے بیمار ہوں دونوں کچن کی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں اور پڑھائی بھی۔۔۔"

"ہاں یاد آیا یہ وحید کدھر ہے صبح سے نظر نہیں آیا مجھے۔۔۔؟" اسید نے پوچھا۔

"ہاں میں نے بھی نہیں دیکھا۔"

"راحیل بتا رہا تھا کہ وہ صبح کہہ رہا تھا کہ دیر سے آئے گا۔ سکول میں فٹ بال کا میچ ہے۔" دادا جان نے بتایا تو اسید نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

"لیکن اب تو چھ بجنے والے ہیں۔"

آمنہ نے یکدم نظر اٹھا کر اسید کی طرف دیکھا وہ بے حد پریشان اور مضطرب سا لگ رہا تھا۔

"اسید خیریت ہے نا آپ یکایک پریشان ہو گئے ہیں؟" آمنہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"ہاں بس یوں ہی۔۔۔" وہ مضطرب سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"میں پتا کرتا ہوں اس کا سکول سے۔۔۔"

"بیٹھ جاؤ اسید بیٹا! وہ اب اتنا چھوٹا بچہ بھی نہیں، میٹرک کا طالب علم ہے ماشاء اللہ۔۔۔قد تو راحیل سے بھی بڑا ہو گیا ہے اس کا۔۔۔"

دادا جان نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

لیکن وہ یونہی مضطرب اور بے چین سا بار بار گھڑی کی طرف نگاہ ڈالتا رہا۔ آمنہ نے دو تین بار اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہم اب چلتے ہیں دادی جان! پھر کسی روز آئیں گے۔"

صدف اور عروج بھی کھڑی ہو گئیں۔

"خوش رہو بیٹا! جیتی رہو! کیسی رونق سی ہو گئی تھی تمہارے آنے سے کبھی کبھی آتی رہا کرو۔"

"جی ضرور۔۔۔" آمنہ اور صدف نے ایک ساتھ کہا اور سب کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلیں۔

"اسید۔۔۔!" آمنہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"وحید کا سکول کہاں ہے ہمارے ساتھ آ جاؤ سکول سے پتا کر لینا تمہاری تسلی ہو جائے گی۔"

"ہاں۔۔۔" اسید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا۔

"ساڑھے چھ ہونے والے ہیں اور وہ کبھی اتنی دیر تک گھر سے باہر نہیں رہا۔ آج کل حالات بھی تو ایسے ہی ہیں۔"

وہ دادا جان کو بتا کر ان کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔

"کدھر جانا ہے اسید۔۔۔!" آمنہ نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے اسید کی طرف دیکھا۔

"یہ ادھر سامنے ہی سیدھی روڈ ہے، چوک سے رائیٹ سائیڈ پر ہو جانا۔" آمنہ نے سر ہلا دیا۔

"پریشان نہ ہوں اسید! انشاء اللہ وحید سکول میں ہی ہو گا۔" وہ سامنے روڈ پر دیکھ

رہی تھی۔

اسید کی نظریں اسٹیرنگ پر دھرے اسکے ہاتھوں پر ٹک سی گئیں بہت خوبصورت ہاتھ تھے آمنہ کے یا اسے ہی لگ رہے تھے وہ یوں ہی بے دھیان سا انہیں دیکھے جا رہا تھا جب آمنہ نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔

"اب کدھر جانا ہے اسید۔۔۔!"

"یونہی سیدھی لے چلو۔ کچھ آگے جا کر جہاں پیپسی کا بڑا سا بورڈ لگا ہوا ہے وہاں بائیں طرف موڑ لینا کچھ فاصلے پر مسجد آئے گی بس مسجد سے چند گز آگے۔۔۔" اسید نے چونک کر راستہ سمجھایا۔

عروج اور صدف خاموش بیٹھی تھیں اسید اب سامنے دیکھ رہا تھا اس کی پیشانی پر گہری لکیریں تھیں۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ وہ لوگ وحید کو اغوا کر لیں۔۔۔"

اس کے ذہن میں ذرا سی دیر کو بس یہ خیال آیا تھا۔ پچھلے تین چار دنوں میں کتنے ہی دھمکی آمیز فون آ چکے تھے لیکن وہ ان کی پرواہ کیے بغیر لکھ رہا تھا وہ سب جو اس کے علم میں آ رہا تھا۔ بیگم زبیدہ حسن کی این جی اوا ور۔۔۔ ان کے کچے چھٹے۔۔۔ ایک سابق فلمی اداکارہ عذرا سبحان کا پارلر اور وہاں ہونے والی سرگرمیاں۔۔۔ نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کا اغوا اور ان میں ملوث یہ پارلر اور این جی اوز۔۔۔"

"تو کیا۔۔۔" اس نے سر جھٹک کر دائیں طرف دیکھا۔

گاڑی وحید کے سکول کے پاس کھڑی تھی۔

"اسید! مجھے تو سکول ویران ہی نظر آ رہا ہے بہر حال تم اتر کر چوکیدار سے پتا کرو۔ وہ یہاں کہیں ہوگا۔"

"ہاں تھینک یو آمنہ! تم لوگ جاؤ اب میں پتا کر کے پھر گھر چلا جاؤں گا۔" اس نے گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آمنہ کی طرف دیکھا۔

"نہیں اسید! تم پتا کر کے آؤ، میں انتظار کر رہی ہوں سکول کے اندر اتنی خاموشی ہے کہ مجھے پریشانی ہوگئی ہے اور پھر گیٹ بند ہے اگر میچ کھیلنے والے بچے ابھی تک یہاں

ہوتے تو اتنی ویرانی نہ ہوتی۔"

اسید کچھ جواب دیئے بغیر گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا لیکن کچھ دیر بعد پلٹ آیا چوکیدار کہہ رہا ہے میچ تو چار بجے ختم ہو گیا تھا اور سب لڑکے ساڑھے چار بجے تک چلے گئے تھے۔

"تو پھر۔۔۔" آمنہ نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے میں گھر جا کر راحیل سے اس کے دوستوں کے متعلق پتا کرتا ہوں۔" اس نے قریب سے گزرتے ہوئے رکشے کو ہاتھ دیا۔

"میں تمہیں گھر ڈراپ کر دیتی ہوں اسید۔۔۔!"

"نہیں مغرب کی اذان ہونے والی ہے تم لوگ گھر جاؤ میں چلا جاؤں گا۔"

"اسید! کیا کوئی پریشانی کی بات ہو سکتی ہے تم کیا سوچ رہے ہو۔۔۔؟"

صدف نے کھڑکی کا شیشہ سرکا کر پوچھا۔

"میں۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔ خدا کرے ایسا کچھ نہ ہو لیکن کچھ لوگ دھمکیاں دے رہے تھے کئی دنوں سے گو کچھ واضح نہیں تھا کہ وہ کیا کریں گے لیکن۔۔۔"

"صاحب! جانا ہے یا میں جاؤں۔۔۔؟"

رکشے والے نے پوچھا تو وہ انہیں پریشان نہ ہونے کی تاکید کرتا ہوا رکشے میں بیٹھ گیا۔

"وحید کے متعلق انفارم کرنا اسید! فکر رہے گی۔" آمنہ نے کہا۔

"وہ ضرور کسی دوست کی طرف ہی چلا گیا ہوگا۔" صدف نے گویا تسلی دی۔

اسید کا دل پتا نہیں کیوں مطمئن نہیں تھا ابھی کل شام ہی کو تو فون آیا تھا۔

"صبح اخبار والے اداریئے کے سلسلے میں معذرت اور تردید چھپنی چاہیے ورنہ انجام کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔"

اداریئے میں اس نے ان نام نہاد این جی اوز اور ان پارلر کے متعلق لکھا تھا جو بے حیائی پھیلا رہے تھے اور جن کے رابطے خلیج کی ریاستوں تک تھے اس نے کسی بھی طرح کی کوئی تردید نہیں کی تھی اور نہ ہی اس نے خود کو جھٹلایا۔

''وہ وحید کو نہیں لے جا سکتے اور پھر وحید کوئی ننھا بچہ تو نہیں ہے کہ وہ اسے زبردستی اغوا کر لیں گے میں بھی بس یونہی۔ انہیں کوئی نقصان پہنچانا ہوتا تو مجھے پہنچاتے نہ کہ میرے بھائی کو۔۔۔۔''

اس نے جیسے خود کو مطمئن کر لیا تھا لیکن اس کا یہ اطمینان زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا تھا وحید کہیں بھی کسی دوست کے گھر نہیں تھا۔

''پولیس میں رپورٹ کرواتے ہیں۔۔۔۔'' اسید کے اباجان نے مشورہ دیا۔

لیکن اسید جانتا تھا اس کا کوئی فائدہ نہیں پولیس والے کہیں گے کہ لڑکا گھر سے بھاگ گیا ہے۔ بھلا پندرہ سال کے لڑکے کو کس نے اغوا کرنا ہے اور بالفرض محال وہ اس بات پر اگری کر لیں کہ کسی نے اسے دشمنی میں اغوا کیا ہے تو دشمنوں کے نام پوچھیں گے کہ ایف آئی آر میں کس کا نام درج کروائیں۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس میں رپورٹ لکھوانے کا مطلب ہے ذلیل وخوار ہونا۔ وحید خود سے کہیں نہیں جا سکتا تھا، یہ اسے یقین تھا سڑک تک وہ اپنے دوست کے ساتھ ہی آیا تھا اس کے دوست نے بتایا پھر وہ اپنی گلی کی طرف مڑ گیا تھا تو کیا گلی سے گھر تک کے فاصلے میں اس کے ساتھ کچھ ہو گیا۔

''آخر کہاں چلا گیا ہو؟'' دادی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اسید کی طرف دیکھا۔

''کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔۔۔۔؟''

''میں نے مختلف ہاسپٹلز سے پتا کروایا ہے آج کوئی اتنی عمر کا بچہ زخمی ہو کر ایمرجنسی میں تو نہیں آیا۔'' سعید دادی کو بتا رہا تھا جب اسید کا سیل بج اٹھا اسید نے نمبر دیکھا آمنہ کا فون تھا۔

''کچھ پتا چلا وحید کا۔۔۔۔؟''

''نہیں آمنہ۔۔۔۔!''

''اسید کہیں۔۔۔۔؟''

''ہاں شاید۔۔۔۔'' اسید نے آمنہ کی بات کاٹی۔

''تمہیں جس نمبر سے دھمکیاں ملتی رہی ہیں اس نمبر پر چیک کرو فون کر

کے۔۔۔۔''

''وہ نمبر کسی پی سی او کا تھا میں نے اسی وقت چیک کر لیا تھا۔'' اسید نے مختصر بات کر کے فون آف کر دیا۔

تب ہی پھر بیل ہونے لگی تو اسید نے سکرین پر نظر ڈالی کوئی اجنبی نمبر تھا وہ ٹھٹکا اور پھر کمرے سے باہر آ گیا۔

''ہیلو مسٹر اسید۔۔۔۔!''

''آپ کون۔۔۔۔؟''

''اس سوال کو رہنے دو یہ بتاؤ ہمارا سرپرائز کیسا رہا۔۔۔۔؟''

''کیا مطلب۔۔۔۔؟ صاف بات کرو۔''

''ارے۔۔۔۔'' لہجے میں حیرانی تھی۔

''کیا تمہیں ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ تمہارا بھائی آج گھر نہیں پہنچ سکا۔''

''تم۔۔۔۔؟'' اسید کے ماتھے کی رگیں ابھر آئی۔

''ہاں میری جان! ہم نے کہا تھا تم سے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ مت ڈالو لیکن۔۔۔۔''

''شٹ اپ۔۔۔۔!'' اسید کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''اگر وحید کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا تم بلیک میلر، ڈاکو، بردہ فروش۔۔۔۔''

''ہاہاہا آ۔۔۔۔'' دوسری طرف وہ شخص عجیب طرح سے ہنسا تھا۔

''کیا کر لو گے؟ کیا حقیقت ہے تمہاری ہمارے سامنے، تم محض ایک معمولی قلم اور چند لفظوں پر اترا رہے ہو۔۔۔۔''

''دیکھو۔۔۔۔'' اس نے لہجے کو حتی الامکان نرم رکھنے کی کوشش کی، تمہیں جو بھی کچھ شکایت ہے یا جھگڑا ہے وہ میرے ساتھ ہے میری فیملی کے افراد کو اس میں ملوث نہ کرو جو کچھ کرنا ہے کہنا ہے میرے ساتھ کرو۔''

''تمہارے ساتھ ہی تو کر رہے ہیں۔۔۔۔'' وہ پھر ہنسا تھا۔

"ابھی تو تمہارا بھائی ہے پھر باپ پھر دادا پھر۔۔۔"

"بکومت۔۔۔" اس نے کہتے کہتے خود کو روکا۔

"ہاں کہو کیا کہہ رہے ہو۔۔۔؟"

"دیکھو تم وحید کو چھوڑ دو۔۔۔"

"چھوڑ دیں گے لیکن آئندہ تمہارے اخبار میں میڈم عذرا کے پارلر کے متعلق کچھ غلط چھپا تو یاد رکھنا پھر زندہ بھائی کے بجائے دو بھائیوں کی لاشیں وصول کر لینا۔"

اسید ہونٹ بھینچے کھڑا تھا دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔

"اسید! کس کا فون تھا؟" سعید نے جو نہ جانے کب باہر آ گیا تھا اس کے کندھے ہاتھ رکھا۔

اسید نے ایک گہری سانس لی اور سعید کو برآمدے میں پڑی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارا کیا اور خود بھی کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ہولے ہولے اسے سب تفصیل بتا دی۔

"تو اب۔۔۔؟" سعید اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اس وقت کیا کیا جا سکتا ہے۔۔۔؟" اسید سوچ رہا تھا۔

"اگر تم کہو تو میں اپنے ایک دوست کو فون کروں؟ اس کے بھائی ایس پی ہیں۔" سعید نے پوچھا۔

"یہاں لاہور میں۔۔۔؟" اسید نے جھکی نظریں اٹھائی تھیں۔

"نہیں میرا خیال ہے وہ فیصل آباد میں ہیں آج کل، لیکن تعلقات تو ہوتے ہیں نان۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا سعید! کہیں وہ وحید کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں اگر ایسا ہوا تو میں کبھی خود کو معاف نہ کر سکوں گا کہ محض میری وجہ سے۔۔۔" اس کی آواز میں نمی تھی۔ سعید ہولے سے اس کے کندھے تھپک کر فون کی طرف بڑھ گیا۔

"آخر کیا ضرورت تھی؟ مجھے سچائی کھوجنے اور اس کا ڈھنڈورا پیٹنے کی، اتنے سارے سالوں سے تو کسی نے آواز نہیں اٹھائی اور اگر کوئی میرے جیسا بیوقوف سچائی کا

علمبردار بن کر اٹھا بھی تو کیا کر لیا اس نے، کوئی تبدیلی آئی، وہی سب کچھ ہے جو پہلے تھا وہی رشوت، وہی کرپشن، وہی فریب و دغا۔۔۔" وہ ہولے سے ہنسا۔

"اور میں چلا ہوں معاشرے کو سنوارنے بھلا کیا کر لوں گا میں آج وحید کو کھو دوں گا تو کل۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔

"وحید کو کچھ نہیں ہوگا۔۔۔" اس کی آواز قدرے بلند ہوگئی۔

"انشاءاللہ۔۔۔"

سعید فون کر کے پھر اس کے پاس آ گیا تھا۔ اسید کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

"میں نے بات کی ہے ریاض سے ابھی بھائی سے بات کر کے مجھے انفارم کرتا ہے۔"

اسید نے جواباً کچھ نہیں کہا وہ پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"یار! کبھی نہ ہارنا۔۔۔"

احمد نے جیسے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"یہ بہت مشکل راہ ہے کانٹوں سے بھری لیکن مجھے یقین ہے تم سچائی کا علم اٹھائے چلتے رہو گے" آفتاب حسین نے کہا تھا۔

"دیکھو اسید! کئی مقام تمہاری زندگی میں ایسے آئیں گے جب تم سوچو گے کہ شاید تم نے غلط کیا ہے، لوگ تو بھر بھر جھولیاں فیض یاب ہو رہے ہیں اور تم لہولہان ہو رہے ہو، شاید تمہیں پچھتاوا ہو کہ تم نے ایسے راستے پر قدم رکھا ہے جس پر چلتے ہوئے تمہاری ذات سے تمہارے پیاروں کو دکھ ہو رہا ہے اور یہی آزمائش کے دن ہوں گے، یہیں تمہیں اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنا ہے، اگر یہاں لڑکھڑا گئے تو پھر کبھی پورے قد سے کھڑے نہیں ہو پاؤ گے۔"

اسید نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور ایک ندامت کے احساس نے اسے گھیر لیا ابھی کچھ دیر پہلے وہ کیا سوچ رہا تھا یعنی سب جدوجہد اور تگ و دو بے معنی لگ رہی تھی اہم

صرف وحید اور اس کی زندگی تھی۔

چارپائی پر پڑا اس کا سیل فون بج رہا تھا شاید رنگ کی آواز پر ہی وہ چونکا تھا لیکن سمجھ نہیں پایا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے فون اٹھایا دوسری طرف ڈاکٹر فہد تھا۔

''یار! ابھی آمنہ نے وحید کے متعلق بتایا تھا کچھ پتا چلا۔۔۔؟''

''یہ وہ این جی او والے نہ ہوں؟''

ڈاکٹر فہد نے خدشہ ظاہر کیا۔

''وہی جنہوں نے عافیہ کو قتل کروایا ہے۔''

''نہیں۔۔۔؟'' اسید نے اسے ساری بات بتائی۔

''پریشان نہ ہونا میں آرہا ہوں۔۔۔''

''نہیں، اس وقت مت آنا اور پھر آ کر کیا کرو گے۔۔۔؟''

''جو کچھ تم کر رہے ہو۔۔۔''

ڈاکٹر فہد نے فون بند کر دیا تھا اسید کو اس پر پیار آیا۔

''یہ نوجوان ڈاکٹر فہد بے حد مخلص اور محب وطن تھا اور ایسے ہی نوجوانوں کی وجہ سے یہ ملک اب تک قائم ہے ورنہ جس قدر لوگ اس ملک کو لوٹ گھسوٹ رہے ہیں اس کا قائم رہنا کمال ہی نہیں معجزہ ہے۔''

رات بہت طویل اور کٹھن تھی حالانکہ گرمیوں کی راتیں اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ لگتا ہے کہ ابھی سوئے تھے اور ابھی صبح ہوگئی لیکن آج تو رات گزر ہی نہیں رہی تھی دادی اور دادا جان کو سعید نے بمشکل سلیپنگ پلز دے کر سلایا تھا۔ ابا جان جاگ رہے تھے انہیں کسی پل چین نہیں تھا کبھی جائے نماز بچھا کر نفل پڑھنے لگتے، کبھی برآمدے اور صحن میں ٹہلنے لگتے، سعید نے ان سے بھی سونے کے لیے کہا تھا۔

جواب میں انہوں نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ اصرار نہ کر سکا تھا کہ اپنے سارے بچوں میں سے انہیں وحید سب سے پیارا ہے شاید سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے اور خود وحید بھی والدہ کی ڈیتھ کے بعد باپ سے زیادہ قریب ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر فہد، اسید، سعید، راحیل میں سے بھی کوئی نہیں سویا تھا عاشی اور پھپھو بھی ادھر ہی تھیں عاشی نے کتنی بار

چائے بنا کر دی تھی۔

اسید، سعید اور فہد کے ساتھ یوں ہی بے مقصد کتنی دیر تک مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے رہے۔

''انتظار۔۔۔'' ڈاکٹر فہد نے اسید سے کہا۔

''انہوں نے کہا تھا نا تم سے کہ وہ وحید کو چھوڑ دیں گے۔ سعید کے دوست کے بھائی نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ صبح تک انتظار کریں اگر کوئی کال آئے تو ریکارڈ کر لیں۔''

اور صبح فجر کی نماز کے لیے عبدالرحمٰن صاحب مسجد گئے ہوئے تھے اور اسید وضو کر رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی سعید بے اختیار ہو کر دروازے کی طرف بھاگا یہ۔۔۔ یہ دستک دینے کا انداز وحید کا ہے۔ اسید بھی ایک دم کھڑا ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا اس کا دل بے تحاشہ تیز سے دھڑک رہا تھا اور پھر سعید نے دروازہ کھولا کر وحید کو جیسے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا تھا۔

''وحید۔۔۔! وحید۔۔۔!'' وہ اسے گلے سے لگائے کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں برس رہی تھیں وہ ان سب کو کتنا عزیز اور پیارا تھا اس کا اندازہ دور کھڑا ڈاکٹر فہد کر سکتا تھا۔ سعید کے بعد اسید نے اسے گلے سے لگایا۔

''دادی! عاشی!'' سعید وہیں کھڑے کھڑے چیخا۔

''وحید آ گیا ہے۔''

اور پھر عاشی کے پیچھے پیچھے سب ہی باہر نکل آئے۔

''ویدو!'' اسید اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں کبھی بھی خود کو معاف نہ کر سکتا کبھی بھی نہیں۔۔۔''

اس سے الگ ہوتے ہوئے اس نے قدرے پیچھے ہٹ کر اپنی آنکھوں میں آ جانے والی نمی کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا۔ تو فہد نے آہستگی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہولے سے دبایا۔

اور مسکرا کر اسے دیکھا۔

مدھم سی مسکراہٹ نے اسید کے لبوں کو چھوا اور فہد کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھک کی طرف

بڑھ گیا۔

"تم کچھ دیر سو جاؤ یہاں میرے بیڈ پر رات سے جاگ رہے ہو۔۔۔۔ ڈونٹوری نائیس بھگت بھگت کر عادی ہو گئے ہیں راتوں کو جاگنے کے، تم کچھ دیر آرام کر لیتے۔"

"ہاں کر لوں گا آرام لیکن تم بھی کچھ دیر لیٹ جاؤ ہاسپٹل بھی جانا ہے تمہیں تو۔۔۔"

"او کے ایز یو ویش۔" فہد مسکراتا ہوا بیڈ پر لیٹ گیا۔

جبکہ اسید جلد آنے کا کہہ کر باہر نکل آیا۔ باہر ابھی تک سب وحید کو گھیرے بیٹھے تھے وہ بتا رہا تھا کہ

"جوں ہی میں نے گلی میں قدم رکھا ایک شخص نے اس کا بازو پکڑ لیا دوسرے نے ماؤزر کمر سے لگا دیا اور وہ چیخ بھی نہ سکا اتفاق سے گلی بھی سنسان تھی وہ اسے گلی کے ساتھ ہی باہر روڈ پر کھڑی گاڑی تک لے آئے۔

لیکن تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو ہم کوئی امیر آدمی نہیں ہیں مجھے اغوا کر کے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس نے احتجاج کیا لیکن وہ اسے زبردستی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔"

"توبہ۔۔۔" دادی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"کیسا زمانہ آگیا ہے کہ دن دہاڑے اتنے بڑے لڑکے کو اغوا کر لیا۔"

"انہوں نے تمہیں مارا تو نہیں؟" راحیل نے جو اس کے ساتھ لگا بیٹھا تھا پوچھا تھا۔

"نہیں۔۔۔ انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا بس لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ رات کو کھانے کے لیے بھی دیا اور پھر صبح یہاں گلی کے کنارے پر اتار کر چلے گئے شاید انہیں پتا چل گیا تھا کہ میں کوئی دولت مند لڑکا نہیں ہوں۔"

"ضرور یہی بات ہوگی۔۔۔" دادی نے بھی سر ہلایا۔

"بے چاروں کی محنت غارت گئی۔"

وحید ہنسا تو اسید نے دل میں ایک اطمینان سا پھیلا محسوس کیا۔

"سعید! کسی نے ابا کو بتایا۔" اس نے پوچھا۔

"اوہ ہاں۔۔۔ میں جاتا ہوں مسجد میں۔" سعید تیزی سے صحن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"وحید دوبارہ وہ لوگ تمہیں نظر آئیں تو پہچان لو گے؟" اسید نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ پہچان لوں گا۔"

"اے چھوڑو! ہمیں کیا پہچان کر کرنا ہے ہمارا بچہ واپس آگیا بس اللہ کا شکر ہے کسی سے دشمنی مول لینے کی ضرورت نہیں چلو سب کمرے میں کچھ دیر کمر سیدھی کر لو۔" دادی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اور عاشی! تم نماز پڑھ چکی ہو تو چائے کا پانی رکھ دو۔"

"اسید!" دادی جان نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن پھر خاموش ہو گئیں۔

"جی دادی جان!"

"کچھ نہیں تم جاؤ اور ہاں ڈاکٹر فہد کہیں یوں ہی بغیر ناشتے کے نا چل دے دھیان رکھنا۔ ساری رات ہمارے ساتھ پریشان رہا اللہ اسے زندگی دے بہت اچھا بچہ ہے۔"

اسید سر ہلا کر بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔

فہد جو جاگ رہا تھا اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

"میں اب چلتا ہوں۔"

"کہاں۔۔۔؟" اسید نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے اسے پھر بٹھا لیا۔

"گھر۔۔۔" اس کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"گھر ہی سمجھ لو۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" اسید اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"گھر تو گھر میں رہنے والے افراد سے بنتا ہے وہ تو ایک اپارٹمنٹ ہے بس

جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"تم نے کبھی اپنے متعلق بتایا نہیں فہد!"

"تمہاری فیملی۔۔۔۔"

"پھر کبھی سہی۔۔۔" فہد نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ابھی تو میں چلتا ہوں نو بجے ہاسپٹل بھی جانا ہے۔"

"کمال کرتے ہو یار! عاشی ناشتہ بنانے لگی ہے ناشتہ کر کے جانا ابھی تو بہت
ہے۔" تب ہی سعید اندر داخل ہوا۔

"ابا آگئے کیا؟" اسید نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔!" سعید سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے کہ کیا تردید چھاپو گے؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا مجھے، تم سب۔۔۔ نہیں سعید! شاید میرا سفر یہاں ت
ہی تھا شاید میں کسی ایسے امتحان کے قابل نہیں ہوں۔"

"تم اپنے راستے پر چلتے رہو اسید! پرواہ مت کرو کسی کی۔۔۔"

"کیسے پرواہ نہ کروں؟" اسید کی آواز قدرے بلند ہوگئی۔

"کیسے۔۔۔؟ سعید! جانتے ہو گزری رات کا ایک پل پل میں نے کتنی اذ
میں کاٹا ہے۔ کتنا کرب سہا ہے میں نے، اگر خدانخواستہ وحید کو کوئی نقصان پہنچتا تو میں ا
دادا کو، دادی کو کسی کو عمر بھر منہ نہ دکھا سکتا تھا۔"

"ریلیکس اسید۔۔۔!" فہد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبراؤ مت آئندہ چند دنوں تک تم ان کے متعلق
بھی مت چھاپو، کیا صبح کے اخبار میں پارلر کے متعلق کوئی آرٹیکل ہے؟"

"نہیں۔۔۔" اسید نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ لوگ کچھ ایسے اونچے لوگ نہیں ہیں جانتا ہوں میں۔ ماضی کی ا
ایکسٹرا کے طور پر کام کرنے والی یہ اداکارہ کوئی اتنی پاورفل بھی نہیں ہے چند ایک کرائے
غنڈے پال رکھے ہیں اس نے اور۔۔۔"

"نہیں فہد! بھلے وہ ایکسٹرا ہی سہی لیکن اس وقت اس کی رسائی عرب ریاستوں
تک ہے۔"

"او کے۔۔۔ دیکھ لیں گے اسے بھی۔"

اس نے اندر آتی ہوئی عاشی کی طرف دیکھا۔

وہ ٹرے اٹھائے ہوئے آرہی تھی اور اس کے ساتھ راحیل تھا راحیل کے ہاتھ
ں بھی ٹرے تھی سعید نے ٹیبل بیڈ کے قریب کیا عاشی نے ٹیبل پر ناشتہ لگایا۔ پراٹھے
لیٹ، اچار۔۔۔۔"

"آج تو مزا آگیا۔" فہد مسکرایا۔

"مدتیں ہوگئیں پراٹھے اور آملیٹ کا ناشتہ کیے۔"

"تھینکس سسٹر۔۔۔!"

راحیل نے بھی ٹرے ٹیبل پر رکھ دیا تھا جس میں پیالیاں اور ٹی پاٹ وغیرہ رکھے
ے۔

"آجاؤ سعید!" اسید نے پلیٹ فہد کو پکڑائی۔

"چائے آپ خود بنا لو گے یا میں آکر بناؤں۔" عاشی نے سعید کی طرف دیکھا۔

"بنا لیں گے تم جاؤ، ویسے یہ پراٹھے تمہارے ہاتھ کے پکے تو نہیں لگتے تم
ساری دنیا کے نقشے بنا دیتی ہوں۔"

"امی بنا رہی ہیں۔" عاشی نے برا نہیں منایا تھا۔

"اسید بھائی! کہیں یہ لوگ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے وحید کو اغوا کر کے لے
نے والے وہ نہ ہوں جو آپ کو دھمکیاں دے رہے ہیں وہی این جی او والے؟"

"ماشاءاللہ! یہ ہماری عاشی کچھ زیادہ عقلمند نہیں ہوگئی اسید!" سعید نے ایک شریر
نظر اس پر ڈالی۔

"بکو مت۔۔۔" عاشی نے جو فہد کی وجہ سے کچھ احترام سے بات کر رہی تھی
بھول کر اسے جھڑکا۔

"میں صحیح کہہ رہی ہوں نا اسید بھائی! ایسا بھی ہوسکتا ہے آپ سوچیے گا

اگر۔۔۔“

”اب مزید غوروفکر مت کرنا اور جاؤ پھپھو آواز دے رہی ہیں تمہیں۔۔۔“

اس نے تیز نظریں سعید پر ڈالی اور باہر نکل گئی۔

”بہت تنگ کرتے ہو تم اسے سعید۔۔۔!“ اسید نے سعید کو تنبیہہ کی۔

”کہاں بھائی۔۔۔!“ سعید نے معصومیت سے کہا۔

”میں تو بالکل تنگ نہیں کرتا۔“

”جیسے میں تو تمہیں جانتا نہیں ہوں۔“

اسید نے اچار کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

”مان لو کہ اس کا اندازہ بہرحال صحیح تھا۔۔۔“

”مان گئے جناب!“ سعید مسکراتے ہوئے پلیٹ میں آملیٹ ڈالنے لگا اور
سا گیا۔

کہیں کسی منظر نے یادداشت کے کینوس پر ابھر کر جیسے اسے اپنے سحر میں جکڑ
اور وہ ارگرد کے ماحول بے خبر سا ہو گیا تھا۔

”فہد! یہ لو نا آملیٹ سب ٹھنڈا ہو رہا ہے تم کیا سوچنے لگے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔“ وہ چونکا۔

”کچھ نہیں، یوں ہی میڈم عذرا اور اس کے حواریوں کے بارے میں
تھا۔“

”میں ریاض کے بھائی جان سے بات کروں گا۔“ سعید نے کہا۔

”اور پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔۔۔“

فہد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا تھا لیکن اند
پھیلتی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

”اور بالآخر وہ سب انجام کو پہنچ گئے۔“

صدف نے شولڈر بیگ میز پر پھینکا اور خود کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ سب انجام کو پہنچ گئے؟“ آمنہ نے فائل میں کاغذات کو ترتیب سے رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ۔۔۔؟“

صدف نے کرسی کو گھسیٹ کر میز کے مزید قریب کیا اور دونوں کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔

”سب مجرم گرفتار ہو گئے پارلر سیل ہو گیا این جی او کا بھی خاتمہ ہوا سب کرتا دھرتا پکڑے گئے پھر۔۔۔؟“

”یقین نہ کرنے کی بہت سی وجوہات ہیں۔“ آمنہ نے بغور اسے دیکھا۔

”اس ملک کی ساٹھ سالہ تاریخ۔۔۔اور۔۔۔“

ذرا سے توقف کے بعد اس نے بات آگے بڑھائی۔

”تمہارا کیا خیال ہے کیا اس طرح کی اور این جی اوز نہیں ہوں گی جو عافیہ جیسی لڑکیوں کی مجبوریوں کو اس طرح خریدنا چاہتی ہوں گی اور ناکامی اور راز کے افشا کے خوف سے پھر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتی ہوں گی اور کیا کسی اور شہر میں کہیں اور کسی نے ایسے پارلر نہ کھول رکھے ہوں گے جو کسٹمرز اور ملازم لڑکیوں کو اس طرح فراڈ کر کے اپنے گھناؤنے کاروبار میں ملوث کرتے ہوں گے۔“

”May Be.“ صدف نے یونہی میز پر کہنی دھرے دھرے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن آمنہ! ہم نے کوشش تو کی ہے نا، اپنی حد تک برائی کو ختم کرنے کی اور شاید کہیں کسی اور جگہ ہمارے جیسا سر پھرا اٹھ کھڑا ہو اور یوں چراغ سے چراغ جلتا جائے۔“

اس کی آنکھیں یوں دمکنے لگیں جیسے ان میں اچانک کسی خواب کی تعبیر پانے کی امید لو دینے لگی ہو لیکن آمنہ یوں ہی دل گرفتگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم دیکھ لینا صدف! یہ سب چند دنوں میں آزاد ہو جائیں گے اور پھر کسی اور نام سے اور کسی اور جگہ اپنا دھندہ شروع کر دیں گے سالوں سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے اس طرح این جی اوز ان کی سرگرمیاں اور یہ اس طرح کے پارلر سالوں سے ہی سب کچھ کر رہے

ہیں کبھی یوں ہی شور مچتا ہے۔ پکڑ دھکڑ ہوتی ہے اور پھر سب کچھ پہلے کی طرح ہو جاتا ہے مجھے یاد ہے مما نے بتایا تھا کہ آج سے دس بارہ سال پہلے بھی یوں ہی ان این جی اوز کے خلاف شور اٹھا تھا اور کسی پارلر کے متعلق ایسی ہی کوئی کہانی اخبار میں چھپی تھی غالباً آفتاب حسین کے اخبار میں اور پھر کیا ہوا؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے صدف کو دیکھا۔

''یو آر رائیٹ۔۔۔۔ آمنہ جی! کم از کم میں اپنی جگہ بہت مطمئن ہوں کہ ہمیں ایک برائی کا کھوج ملا اور ہم نے صرف اس برائی کی نشاندہی ہی نہیں کی بلکہ اسے ختم کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کیا، ہم نے اپنے حصے کا کام کر دیا ہے۔''

''بہت مثبت سوچ رکھتی ہو تم صدف! لیکن میں پتا نہیں کیوں تمہاری طرح اس سارے عمل سے جو ہوا مطمئن نہیں ہوں جیسے سب رائیگاں اور بے فائدہ ہے حالانکہ پہلے میں ایسی نہ تھی۔

بہت پر امید رہتی تھی، مجھے زندگی بہت خوبصورت لگتی تھی، بہت حسن دکھتا تھا مجھے، چھوٹی چھوٹی رومانی کہانیاں لکھنا بہت اچھا لگتا تھا مجھے، دنیا میرے لیے میرے افسانوں جیسی تھی۔۔۔۔ خوبصورت حسین، جہاں سب اچھا تھا، یہاں اتنی بدصورتیاں جواب مجھے اپنے چاروں طرف نظر آتی ہیں پہلے کبھی نظر نہیں آتی تھیں لیکن جب میں یہاں آئی تم سب کی باتیں سنیں، اسید کی پریشانیاں۔۔۔۔ دلیر کے دکھ۔۔۔۔ فیصل کی رپورٹس۔۔۔۔ تو میں چونک کر اپنے ارد گرد دیکھنے لگی، حیران ہو کر کہ یہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ میرے اس ملک میں میرے اس وطن میں، جسے اتنی قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا تھا۔۔۔۔۔''

وہ ہولے ہولے بول رہی تھی اور صدف خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔

''ہم لوگ ایسے کیوں ہیں اتنے لالچی اور حریص۔۔۔۔ دولت، پیسہ، چاہے کہیں سے اور کیسے بھی حاصل ہو، کیا ہمارا مقصد زندگی صرف یہی ہے۔۔۔۔ اسے پانے کے لیے ہم لوگوں کی زندگیوں اور عزتوں سے کھیلتے ہیں۔۔۔۔ ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ یہ سب یہاں ہی رہ جائے گا اور ہمارا نصیب وہی مٹھی بھر خاک اور دو گز زمین، تو پھر کس لیے۔۔۔۔ ہمیں تو سب کے لیے مثال بننا تھا، سب سے بڑی مسلمان ریاست۔۔۔۔ لیکن میں پاکستانی قوم سے بہت مایوس ہو چکی ہوں۔''

''مایوسی کفر ہے آمنہ۔۔۔۔! ہمیں اچھی امید رکھنی چاہیے۔''

''لیکن میں پر امید نہیں ہوں ہر آنے والا دن جیسے اس قوم کو مزید ذلتوں میں گراتا جا رہا ہے، کچھ سال پہلے تک تو ہم ایسے نہ تھے اور نہ ہی ہمارے ملک میں اس طرح اتنی۔۔۔۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''تم نے اس لڑکی کا بیان پڑھا تھا جو اس پارلر میں کام کرتی تھی؟ اس کے انکشافات پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔۔۔۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسکے گھر زکوۃ اور خیرات کا پیسہ آئے، وہ تو اپنے خاندان والوں کو عزت کی روٹی دینے کے لیے گھر سے نکلی تھی، کیا عزت سے جینے کے لیے سوچنا اور حلال کی روزی کمانے کے لیے تگ ودو کرنا جرم ہے؟''

''آج تم بہت قنوطی ہو رہی ہو آمنہ۔۔۔۔!'' صدف نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''ہر اندھیرے کے پیچھے اجالے کی کوئی نہ کوئی کرن ضرور چھپی ہوتی ہے، پتا نہیں کیوں میں اتنی قنوطی ہو رہی ہوں؟''

حالانکہ سب ان دنوں بہت خوش تھے۔ ڈاکٹر فہد نے آئی جی صاحب سے خود بات کی تھی۔ ایک بار ان کی بیٹی اس کے کلینک میں ایڈمٹ ہوئی تھی اور تب سے ہی وہ ان کو جانتا بلکہ اچھی واقفیت تھی۔ وہ جب بھی ملتے بہت محبت سے ملتے تھے اسے، پھر سعید کے دوست کے بھائی نے بھی کافی ہیلپ کی تھی۔ بڑی خاموشی سے ثبوت اکٹھے کئے گئے۔ اس دوران ایس پی صاحب کی ہدایات کے مطابق اخبار میں ان دونوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں چھاپا جا رہا تھا پھر دس بارہ دن بعد یکا یک وسیع پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں، چھاپے مارے گئے اخبارات دھڑا دھڑ سنسنی خیز انکشافات چھاپ رہے تھے۔

''چیئر اپ آمنہ۔۔۔۔!'' صدف نے اسے خاموش دیکھ کر خوشی دلی سے کہا۔

''میں خوش ہونا چاہتی ہوں صدف! لیکن خوش نہیں ہو پا رہی، پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے صدف کہیں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''یار! ہمیشہ اچھی امید رکھنی چاہیے۔'' صدف ہولے سے ہنسی۔

''صدف! تم جانتی تھیں کہ احمد کو بلڈ کینسر ہے تو کیا تم پھر بھی پُر امید تھیں۔ تمہیں یقین تھا کہ۔۔۔؟''

صدف کی آنکھیں یکدم سی بجھ گئیں۔

''یقین تو نہیں لیکن امید تو تھی کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔'' اور اس کی آواز بھرا گئی۔

''اور جب ڈاکٹروں نے بتایا کہ He is no more تب بھی مجھے لگا کہ شاید وہ زیادہ اچھی جگہ چلا گیا ہے۔ بس ہم۔۔۔۔۔۔۔۔'' اس نے لب بھینچ کر بے اختیار اُمڈ آنے والے آنسو پینے کی کوشش کی۔

''ہمارے پاس صرف اس کی یادیں رہ گئیں۔''

''تم بہادر ہو صدف!'' آمنہ نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم احمد سے محبت کرتی تھیں لیکن تم نے اس کی جدائی کو بڑے حوصلے سے برداشت کرلیا ہے لیکن مجھے لگتا ہے جیسے میری محبت کی قسمت میں نارسائی کے سوا کچھ نہیں۔۔۔''

''پھر وہی مایوسی۔۔۔''

صدف مسکرائی لیکن اسکی آنکھوں کے گوشے ابھی نم تھے۔

''تم اسید سے کہہ دو نا سب۔۔۔؟''

''کیا۔۔۔ کیا کہہ دوں۔۔۔؟'' آمنہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''وہی جو تم سوچتی ہو۔۔۔''

''پاگل ہو تم کیا محبت بھی اپنے اظہار کے لیے لفظوں کی محتاج ہوتی ہے۔۔۔؟ کیا وہ خود نہیں بتاتی کہ میں ہوں۔۔۔ یہاں تمہارے لیے اس دل میں۔۔۔''

''کیا تم نے کبھی احمد کو بتایا تھا کہ تم اس سے محبت کرتی ہو۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔ لیکن میری بات اور تھی ایک طویل عرصہ تک ہم ایک ہی گھر میں رہے۔ ہمارا بچپن، ہمارا لڑکپن، جوانی سب ایک ساتھ ہی تو گزرا۔ ہم جانتے تھے کہ ہمیں

ایک دوسرے کا رفیق بننا ہے۔ باشعور ہوتے ہی ہمارے کانوں میں پڑا تھا کہ ہمیں ایک ساتھ زندگی گزارنی ہے ہم نے گھنٹوں ایک جگہ بیٹھ کر مستقبل کے پلان بنائے تھے لیکن ہمیں کبھی ایک دوسرے کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں وہ کہتا تھا۔ صدف! ہمیں ساری عمر ایک ساتھ چلنا ہے قدم سے قدم ملا کر لیکن کون جانتا تھا وہ آدھے راستے میں ہی تھک کر چھوڑ جائے گا۔ آمنہ ہم۔۔۔۔''

''اسید صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ آرٹیکل مل گیا ہو تو لے آئیں۔''

دلیر نے ذرا سا کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

''اوہ ہاں۔۔۔'' آمنہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں بس آ ہی رہی تھی۔۔۔''

اس نے میز پر پڑی فائل میں سے پن اپ کئے ہوئے چند پیپرز نکالے اور کھڑی ہو گئی۔

''یہ آرٹیکل اسید نے مانگا تھا اور میں تم سے باتیں کرنے لگی میں ابھی دے کر آتی ہوں اتنے میں تم عروج کا کام دیکھ لو۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ دادا جان کو کوئی کام تھا اسے ان کا میسج دے دوں تاکہ وہ انہیں فون کرلیں۔''

صدف بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسید کے کمرے میں اس کے علاوہ فیصل، حامد اور ڈاکٹر فہد بھی تھے فہد سے بات کرتے کرتے اس نے آمنہ کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ سے آرٹیکل لے لیا اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فہد کی طرف وہ کاغذات بڑھا دیئے۔

''یہ ہے وہ آرٹیکل۔۔۔ جو کسی عرفان عزیز نامی شخص نے بھیجا ہے اور درخواست کی ہے کہ اسے چھاپ دیا جائے۔''

''تم نے اسے پڑھا آمنہ۔۔۔!''

کاغذات فہد کو دے کر وہ پھر آمنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ آمنہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے یہ سب سچ ہے جو اس نے لکھا ہے۔۔۔؟"

"May be۔۔۔۔لیکن اس شخص نے اپنا اڈریس وغیرہ نہیں لکھا، سو ہم اس سے رابطہ نہیں کر سکتے، بغیر پروف کے تو یہ نہیں چھاپا جا سکتا، ممکن ہے یہ سب جھوٹ ہو۔"

اسید نے ایک ستائشی نظر اس پر ڈالی۔

"تم صحیح کہتی ہو، بغیر کسی پروف کے اسے چھاپنا صحافی کی غیر ذمہ داری ہوگی۔"

"لیکن اس آرٹیکل میں ہے کیا۔۔۔؟" حامد نے پوچھا جو کونے میں کمپیوٹر ٹیبل کے ساتھ کھڑا تھا۔

"یہ کسی دور دراز دیہات میں قائم ہونے والی ایک این جی او کے متعلق ہے ایک آدمی نے رپورٹ بھیجی ہے اور بتایا ہے کہ یہ ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہے اس نے ان سرگرمیوں کی کچھ تفصیل بھی لکھی ہے۔"

"لیکن بہرحال اسے اپنا ایڈریس لکھنا چاہیے تھا یا کوئی فون نمبر۔۔۔نام تو جعلی بھی ہو سکتا ہے۔" فیصل نے بھی رائے دی۔

"ایسی بہت سے ملکی اور غیر ملکی تنظیمیں اور انجمنیں ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور یہ کئی سالوں سے ہو رہا ہے اگر کوئی ایسی کسی سرگرمی کے متعلق عوام کو باخبر کرنا چاہتا ہے تو اسے کم از کم ہم پر تو اعتماد کرنا پڑے گا بہرحال اس شخص نے اگر رابطہ کیا تو سوچیں گے۔"

اسید کی بات سے کسی نے اختلاف نہیں کیا تھا۔

"اسید! کیا اب تم اس طرح کی دوسری این جی اوز پر بھی کام کرنا چاہتے ہو؟"

ڈاکٹر فہد نے کاغذات میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے اس وقت اور بھی بہت سے اہم ایشوز ہیں جن پر ہمیں کام کرنا چاہیے میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ منشیات، این جی اوز، وہ پارلر جو فحاشی پھیلا رہے ہیں بچوں کی اسمگلنگ، کالجوں کا ماحول، ثقافتی یلغار، کلچر کے نام پر بے حیائی، ہمیں ان سے کام کرنا ہے لیکن بعد میں، اس وقت ہماری ترجیح ہونا چاہیے اپنے ملک کو بچانا۔"

حامد کمپیوٹر سے ہٹ کر اسید کے پاس آ گیا تھا اور اب اسید کی ٹیبل پر دونوں ہاتھ

رکھے ہولے ہولے کہہ رہا تھا۔

"ان سب پر نہ جانے کب سے لکھا جا رہا ہے؟ لکھا جاتا رہے گا؟ شاید کہیں کچھ بہتر بھی ہو جائے گا لیکن آپ لوگ جانتے ہیں لوگ ہمارے ملک کے ٹوٹنے کی باتیں کرتے ہیں اور میرا دل کہیں پاتال میں گر جاتا ہے۔

نہیں۔۔۔۔یہ ملک اس لیے نہیں بنا تھا کہ یہاں قتل وغارت گری کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ اپنے اپنوں کا قتل کریں۔ فاٹا، سوات، وزیرستان، یہاں کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ ہمیں اس کو کھوجنا چاہیے، کون صحیح ہے؟ کون غلط ہے؟ صوبوں میں ایک دوسرے کے خلاف اتنی نفرت کیوں ہے؟ ہمیں اس نفرت کو ختم کرنا ہے ان سازشوں کے خلاف کام کرنا ہے جن کے تانے بانے کہیں اور بنے جا رہے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو حامد۔۔۔!" اسید نے میز پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

حامد کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ وہاں سے ہٹ کر ڈاکٹر فہد کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"ہمیں پینے کے لیے صاف پانی ملے نہ ملے، روشنی نصیب ہو یا نہ ہو، پیٹ بھرے یا نہیں لیکن ہمارا عدالتی نظام ضرور آزاد ہونا چاہیے۔" فیصل نے سب کی طرف دیکھا۔ اس فرائی ڈے کو میں اس موضوع پر اپنا فیچر لکھوں گا۔

"ڈیٹس گڈ۔۔۔" اسید نے تائید کی۔

"میں خود سوچ رہا تھا کہ ہمیں اس موضوع پر کچھ زیادہ لکھنا چاہیے جبکہ ابھی تو ہم صرف خبروں پر ہی انحصار کر رہے ہیں۔ ذاتی طور پر میں چیف جسٹس صاحب کی معطلی پر بہت اپ سیٹ ہوں جس ملک میں انصاف نہ ہو، جہاں انصاف بھی خریدا جا سکتا ہو، اس ملک میں جو کچھ ہو جائے کم ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو اسید۔۔۔۔! ہمیں دوسرے موضوعات کے ساتھ ساتھ ان تمام ہاٹ ایشوز پر بھی کھل کر لکھنا چاہیے۔" فیصل نے اسید کی تائید کی۔

"وہ حکومتیں جلد زوال پذیر ہو جاتی ہیں جو انصاف نہ دے سکیں۔ ویسے قابل

تعریف ہیں وہ لوگ جو انصاف کی بحالی کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔" حامد اب اسید کی کرسی کے بائیں طرف کھڑا ٹیبل پر پڑی ایک فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے چیف صاحب اور دوسرے جج بحال ہوجائیں گے۔۔۔؟" فیصل نے پوچھا۔

"میں ہمیشہ اچھے گمان رکھتا ہوں تم دیکھنا ادھر ڈکٹیٹر آمریت کی پیداوار صدر مستعفی ہوا، ادھر چیف جسٹس اور دوسرے ججز بحال ہوئے۔"

"خدا کرے کہ تمہارا گمان صحیح ہو جبکہ مجھے ایسی کوئی امید نہیں ہے۔۔۔" فیصل نے حامد سے فائل لے لی۔

"تم جو یہ انسانی سمگلنگ اور اغوا برائے تاوان کے سلسلے میں انفارمیشن اکٹھی کر رہے تھے کیا وہ مکمل ہوگئی ہیں۔۔۔؟" حامد نے فائل اسے دے دی۔

"نہیں۔۔۔ اس کا شکار بننے والے کچھ لوگوں سے انٹرویو لیا ہے، کچھ سے ملا ہوں اور ابھی مزید کچھ لوگوں سے ملنا ہے اور ابھی تک میرا تجزیہ یہ ہے کہ زیادہ کیسز میں جاننے والوں نے ہی اغوا کیا ہے اور جہاں تک انسانی اسمگلنگ کا معاملہ ہے تو اس میں تو ایک پورا مافیا کام کر رہا ہے اور اس پر لکھنا خاصا وقت طلب ہے۔"

"ٹھیک ہے تم پہلے اپنا اغوا برائے تاوان والا آرٹیکل مکمل کرلو پھر دوسرے پر کام کرنا، ہمارے محلے میں بھی ایک صاحب اس کا شکار ہوئے ہیں۔" اسید نے فیصل سے کہا۔

"ان کے بیٹے کو اغوا کرنے والا ان کے دفتر کا ساتھی تھا۔ بچے کو مار دیا ظالم نے حالانکہ اکبر صاحب نے بھاگ دوڑ کر پیسہ بھی اکٹھا کرلیا تھا۔"

"میرا خیال ہے ہم چلیں۔۔۔؟" صدف نے آہستگی سے آمنہ سے کہا جو بہت دھیان سے اسید کو دیکھ رہی تھی۔

"نہیں بھئی۔۔۔" اسید نے سن لیا۔

"چائے آرہی ہے اور آپ کے لیے اچھی خبر بھی ہے۔"

"وہ کیا۔۔۔؟" صدف نے اس کی طرف دیکھا۔

"اب ڈاکٹر فہد بھی ہمارے لیے لکھیں گے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے میرا خیال ہے سب سے پہلے آپ کو ڈاکٹروں کے رویے پر لکھنا چاہیے، مریض کے ساتھ تو ایسے پیش آتے ہیں جیسے وہ کوئی بہت گھٹیا مخلوق ہوں۔"

"اس پر لکھیں گے کبھی، لیکن اس وقت وہ کام کرنا چاہتا ہوں جو اقبال نے کہا تھا اس قوم کو جگانے کا کام، احساس دلانے کا کام، میں بتانا چاہتا ہوں کہ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

جسے نہ ہو خیال آپ اپنی حالت بدلنے کا"

"تو آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر فہد! آپ کے چند لفظ اس قوم کو غفلت کی نیند سے جگادیں گے۔۔۔؟" آمنہ نے یکدم پوچھا۔

"ہاں شاید۔۔۔" ڈاکٹر فہد اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"غلط فہمی ہے آپ کی۔۔۔" آمنہ کے لبوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ ابھری۔

"نہیں جاگے گی یہ قوم۔۔۔ اس قوم میں پہچان ہوتی تو اتنے عرصہ تک ظالم حکمران ہمارے اوپر مسلط نہ رہتے۔۔۔ یہ غلامی میں خوش ہیں ڈاکٹر فہد! امریکہ کی غلامی۔۔۔ پیسے کی غلامی۔۔۔ نفس کی غلامی۔۔۔"

"اتنی ناامیدی اچھی نہیں ہوتی، آمنہ بی بی! یہ قوم یہ پاکستانی قوم۔۔۔ خدا نخواستہ اگر پاکستان پر کوئی بیرونی مشکل آئی تو یہ لوگ سروں پر سامان اٹھا کر مہاجر بننے کے بجائے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر سرحدوں کی طرف بھاگیں گے۔

میں ہمیشہ کہتا ہوں آمنہ بی بی! پاکستانیوں جیسی وطن پرست قوم زمین نے دوسری بار جنم نہیں دی، اس جیسے جیالے دنیا کی کسی ماں نے نہیں جنے، میدان جنگ میں پاکستانیوں جیسی سرپھری قوم روئے زمین میں کوئی دوسری نہیں ہے، وہ پاگل ہیں، عاشق ہیں کہ ایک قومی ترانہ سنا کر ان کی لاشوں کی سڑک بنالو، یہ اپنے ہاتھ سے اپنا سر دھڑ سے الگ کر کے پاکستان پر وار دینے والی قوم ہے، اس کی ماؤں اور بہنوں کے کلیجوں میں وہ آگ ہے کہ پیٹھ پھیرنے والوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کردیں۔"

ڈاکٹر فہد یکدم جذباتی ہوگیا تھا سب نے اسکی اتنی لمبی چوڑی بات بہت دھیان سے کی تھی آمنہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری تھی وہ ڈاکٹر فہد کی طرف مڑ گئی۔

"ہم نے بھی سنا تھا۔ 65 کی 71 کی جنگوں کے بارے میں خاص طور پر
65 کی جنگ کے بارے میں اس پاکستانی قوم کی ایسی ہی باتیں لیکن یہ صرف سنی سنائی
باتیں اور ان میں نہ جانے کوئی حقیقت ہے بھی یا نہیں آپ اس قوم کی بات کر رہے ہیں ان
لوگوں کی ڈاکٹر فہد! جنہوں نے ڈاکٹر عبدالقدیر کی اسلام آباد میں قبر بنائی اور انسانی دشمن قرار
دیا جنہوں نے محسن پاکستان کو۔۔۔۔۔۔۔۔"

وہ لمحہ بھر خاموش ہوگئی۔

"یہ میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگوں سے بھری قوم ہے اور یہ بڑھتے جارہے ہیں
یاجوج ماجوج کی طرح۔ پاکستانی خون میں زہر کی آمیزش ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر فہد!

عورت، روپے اور عریانی نے نئی جنریشن کو بے کردار کر ڈالا ہے۔ آپ کچھ بھی لکھ
لیں چاہے قلم کو خون دل میں ڈبو لیں کچھ نہیں ہونے والا۔۔۔"

"بری بات ہے آمنہ۔۔۔! اتنی مایوسی اچھی نہیں۔" ڈاکٹر فہد مسکرایا۔

"اس جنریشن میں آپ، صدف، فیصل، اسید، حامد جیسے لوگ بھی تو ہیں نا۔۔۔
ان جیسے ہزاروں ہوں گے روشنی کی ایک ننھی سی کرن بھی اندھیرے کی موت ہوتی ہے۔"

"چیئراپ۔۔۔ لیجیے چائے آگئی۔۔۔"

ہوٹل والے لڑکے نے ٹرے ٹیبل پر رکھ دی تھی اور چائے دانی سے چائے پیالیوں
میں ڈال رہا تھا حامد سب کو چائے پکڑانے لگا۔ اسید کی نظریں آمنہ کی طرف دو تین بار اٹھیں
اور اس نے بغور آمنہ کو دیکھا۔

اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں تھکی تھکی لگ رہی تھیں حالانکہ ہمیشہ وہ بہت
فریش نظر آتی تھی۔

"کیا کوئی پرابلم ہے اسے؟ کوئی گھریلو پرابلم۔۔۔ جو یہ اتنی ڈسٹرب ہو رہی ہے؟
ورنہ پہلے تو کبھی اتنی تلخ باتیں نہیں کرتی تھی۔۔۔" چائے پیتے ہوئے وہ مسلسل آمنہ کے
متعلق ہی سوچ رہا تھا۔

چائے پی کر ڈاکٹر فہد اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوکے اسید! پھر ملیں گے میں چلتا ہوں۔۔۔"

"اللہ حافظ۔۔۔" اسید نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا۔

"تو پھر تمہارا کالم پکا ہے۔۔۔؟"

"Sure" ڈاکٹر فہد مسکرایا۔

"آپ اپنا کالم اس عنوان کے تحت لکھیں"

"نہ ہو جس کو خیال۔۔۔۔"

"تو کیسا رہے گا ابھی آپ نے شعر پڑھا تھا نہ کہ خدا نے آج تک اس قوم کی
حالت نہیں بدلی۔ تو اس وقت میرے دل میں خیال آیا تھا لیکن پھر بات اور سمت چلی گئی۔"

صدف نے اپنا خیال ظاہر کیا تو فہد سمیت سب نے اس تائید کی کہ یہ بالکل صحیح
ہے۔ فیصل کا کالم "شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے" کے عنوان سے چھپتا تھا جسے بہت پسند
کیا جارہا تھا اس میں وہ ہمیشہ کسی نہ کسی مسئلے پر لوگوں کی توجہ مبذول کرواتا تھا لکھنے کا انداز
بہت متاثر کن تھا۔

"اور اب ڈاکٹر فہد کا کالم بھی یقیناً اتنا ہی پسند کیا جائے گا۔۔۔"

یہ صدف کا خیال تھا جس کا اس نے اظہار بھی کر دیا تھا۔ فہد نے مسکرا کر شکریہ ادا
کیا اور سب کو اللہ حافظ کہتا ہوا چلا گیا اس کے بعد فیصل اور حامد بھی چلے گئے صدف بھی
چائے پی کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اسے اٹھتے دیکھ کر آمنہ بھی اٹھی تھی۔

"آمنہ۔۔۔!" اسید نے اپنا خالی کپ ٹرے میں رکھا۔

"تم نے فرائی ڈے سپیشل کے لیے ابھی تک کچھ نہیں بتایا کہ کیا لکھ رہی ہو آؤٹ
لائن لکھ لی ہیں تو ڈسکس کر لیتے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ ابھی تو نہیں لکھا کچھ۔۔۔ شاید اس بار نہ لکھ سکوں۔۔۔"

"کیوں خیریت ہے آمنہ! کوئی پریشانی۔۔۔؟"

اسید پوچھ رہا تھا۔ صدف باہر نکل گئی تھی ابھی اسے اپنا کام مکمل کر کے عروج کا
کام بھی دیکھنا ہے۔

"نہیں تو۔۔۔ کوئی پریشانی نہیں۔۔۔"

"کچھ تو ہے آمنہ! کیا تم میرے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی؟" آمنہ نے نظریں اٹھائیں، اسید اسے دیکھ رہا تھا آمنہ کی نظریں جھک گئیں۔

"نہیں۔۔۔۔ایسا کچھ خاص نہیں ہے بس یونہی شاید ملکی حالات کی وجہ سے مایوسی سی طاری ہوتی جا رہی ہے کہیں سے بھی کچھ اچھا سنائی نہیں دیتا۔"

"بات اگر صرف ملکی حالات کی ہے آمنہ۔۔۔۔! تو یقین رکھو ایک دن سب اچھا ہو جائے گا انشاء اللہ۔۔۔"

"اور پتا نہیں۔۔۔۔اس ایک دن تک ہم زندہ رہیں گے یا نہیں۔"

"مایوسی، دل گرفتگی، اداسی۔ یہ آمنہ کی شخصیت کا حصہ تو نہیں تھی ملکی حالات تو پچھلے سات سالوں سے ایسے ہی چل رہے تھے مایوس کن تکلیف دہ۔۔۔۔کچھ اور بھی ہے آمنہ! جو آپ کو پریشان کر رہا ہے۔"

"آپ پلیز۔۔۔۔کہہ دیں مجھے، شاید میں آپ کے کام آ سکوں۔"

"میرا خیال ہے کچھ معاملوں میں کوئی بھی کسی کے کام نہیں آ سکتا۔۔۔۔" آمنہ کے لہجے میں گہری افسردگی جھلکی تھی۔

"جب انسان کا اپنا دل آپ سے بغاوت کرنے لگے تو آپ کیا کر سکتے ہیں بھلا۔۔۔۔؟" وہ ہولے سے ہنسی۔

"بے چارے دل نے کیا بغاوت کر دی ہے آمنہ!" اسید نے خوشدلی سے پوچھا۔

"یونہی ایک بات ہے۔۔۔۔" آمنہ نے نظریں چرا لیں۔

"آمنہ۔۔۔۔!" اسید اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے قریب آ گیا۔

"ایسا کیا مسئلہ ہے۔۔۔۔جو تم مجھ سے ڈسکس نہیں کر سکتی۔۔۔۔؟"

"پلیز کوئی اور بات کریں میں نے بتایا تو ہے کہ۔۔۔۔"

"ایسا بتانے کے لائق کچھ نہیں ہے۔"

"کوئی اور بات۔۔۔۔" اسید نے بغور اسے دیکھا تو اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔ اس کو اس کی آنکھوں میں نمی سی پھیلتی محسوس ہوئی اس نے یکدم چہرہ جھکاتے ہوئے رخ

موڑ لیا۔

"صدف انتظار کر رہی ہو گی۔" اس نے یونہی جھکے اور رخ موڑے موڑے کہا۔

"کیا میں۔۔۔۔" اسید نے سوچا۔

"کیا اس کی اس بے تحاشہ اداسی کی وجہ میں ہوں۔۔۔۔؟"

"کیا وہ۔۔۔۔؟" اس نے پھر اس کی طرف دیکھا۔

وہ سر جھکائے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی میں نے تو کبھی اس سے کچھ نہیں کہا کوئی ایسی بات نہیں کی جو اس کی دل آزاری کا باعث بنی ہو لیکن۔۔۔۔

"وہ تم سے محبت کرتی ہے اسید! اور تم اس بات کو جانتے ہو۔۔۔۔" دل نے سرگوشی کی۔

"اور محبت کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے، اسے سراہا جائے لیکن میں کیسے اس لڑکی سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس کی محبت کی قدر ہے، میں بھی اسے چاہتا ہوں، اگر میں دل کے دروازے پر دستک دیتا ہوں تو وہ اسی کا ہو گا، لیکن مسائل ذاتی نہیں اجتماعی ہیں۔ میں دو وعدوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں اور مجھے لگتا ہے میں بیک وقت دو ذمہ داریوں کو نہیں سنبھال سکتا۔ میں نے محبت کا آنچل تھاما تو شاید اپنے فرائض سے کوتاہی کر جاؤں۔۔۔۔"

"آمنہ! بیٹھ جاؤ۔۔۔۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور واپس ٹیبل کے پیچھے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے آج تم سے کچھ کہنا ہے۔۔۔۔"

آمنہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر تک وہ یوں ہی پیپر ویٹ کو دائیں ہاتھ سے گھماتا رہا۔ شاید کہنے کے لیے لفظ ڈھونڈ رہا تھا لیکن بعض اوقات لفظ کوشش کے باوجود ساتھ نہیں دے پاتے۔ اسید کو بھی اس وقت مشکل کا سامنا تھا۔

آمنہ کبھی کبھی سر اٹھا کر اسے دیکھ لیتی تھی۔ پتا نہیں اسید کیا کہنا چاہتا ہے اور کہہ

نہیں پا رہا۔

''آمنہ! محبت ہمیشہ اپنا آپ منوا لیتی ہے۔۔۔'' بالآخر اسید نے کہا۔

''اور محبت چھپ نہیں سکتی چاہے کوئی اسے لاکھ چھپائے۔ ہزاروں پردوں میں بھی یہ اپنی جھلک دکھاتی رہتی ہے، اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ مجھے تمہارے دل کی خبر نہیں تو ایسا نہیں ہے میں پتھر دل یا بے حس انسان نہیں ہوں، میں تم سے کچھ کہتے ہوئے اس لیے ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے حالات مجھے اتنا بے بس نہ کر دیں کہ میں اپنے کہے ہوئے لفظوں کو نبھا نہ پاؤں۔۔۔''

''تم۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور تمہارا دل بہت خوبصورت ہے۔ ایسا اور کوئی نہیں ہے۔۔۔'' اس نے ذرا سا توقف کیا آمنہ سر جھکائے خاموشی سے سن رہی تھی۔

''بخدا آمنہ۔۔۔!'' اس نے ایک نظر آمنہ پر ڈالی۔

''تمہاری یہ افسردگی، تمہاری آنکھوں کی نمی، مجھے بے چین کر دیتی ہے، پتا نہیں کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کا سبب میں ہوں۔

آمنہ! تم ایک حسین خیال ہو، بہت کشادہ ظرف اور انوکھی، میں تمہارے لائق نہیں۔۔۔تمہاری محبت کے لائق۔۔۔''

آمنہ نے یکدم تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔۔۔ یہ فیصلہ تو کسی اور دل کا ہے کہ آپ کس لائق ہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ شاید میں آپ کے لائق نہیں۔''

آمنہ نے سوچا صدف اور عروج کہتی ہیں کہ مجھے اسید سے سب کچھ کہہ دینا چاہیے تو آج موقع ہے اور شاید آج کے بعد یہ موقع نہ ملے۔

''لیکن میں نے آپ سے کچھ طلب نہیں کیا، کچھ مانگا نہیں، ہاں کچھ جذبوں میں آدمی بے اختیار ہوتا ہے اور میں بھی شاید بے اختیار ہو گئی تھی، ام سوری آئندہ آپ کو مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میری آنکھوں کی نمی اور میری افسردگی سے آپ ڈسٹرب ہوئے ہیں، تو میں خیال رکھوں گی کہ اب ایسا نہ ہو، یہ آنسو اور یہ افسردگی محبت کی ناقدری تھی۔۔۔''

اس کی آواز بھرا گئی وہ یکدم کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھ جاؤ آمنہ۔۔۔!'' اسید کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''بڑے بدنصیب ہوتے ہیں جو محبت کی قدر نہیں کرتے اور میں ان بدنصیبوں میں نہیں، تم کیا جانو کس لائق ہو، تم پاس ہو تو صرف تمہیں دیکھنے اور سننے میں عمر بیت جائے، تم کیا جانو آمنہ! میں کب سے تمہاری محبت کے سحر میں گرفتار ہوں لیکن میں نے اپنی محبت کے پیدا شدہ احساس کو خود ہی دفن کیا بار بار کہ میں۔۔۔'' وہ یکدم جذباتی ہو گیا تھا۔

آمنہ نے یکدم کہا ''پلیز اور کچھ مت کہیے گا اسید! میرے لیے آپ کا اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے، میں خود اپنی نظروں میں معتبر ہو گئی ہوں، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے اور میں آپ سے کبھی کچھ نہیں طلب کروں گی نہ آپ کی محبت نہ آپ کی رفاقت، میری محبت رائیگاں نہیں ہے آپ کو اس کی قدر ہے میرے زندہ رہنے کے لیے یہ احساس ہی بہت ہے۔۔۔'' بات مکمل کرتے ہوئے وہ اٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

اسید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر حیرت سے منہ کھولے کچھ دیر دروازے کی طرف دیکھتا رہا پھر مسکراتے ہوئے ایک فائل اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

''عاشی کیا سوچ رہی ہو۔۔۔'' صدف نے یکایک لکھتے لکھتے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں، سوچ رہی تھی کہ یہ ہمارے ملک کے مقدر میں ہمیشہ انوکھے اور نایاب قسم کے لیڈر ہی کیوں آتے ہیں۔۔۔؟''

''یہ تو ہے۔۔۔ہم ہمیشہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جاتے ہیں۔'' عروج نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''جمہوریت، الیکشن، کتنا رولا تھا اور ہم بھی سمجھ رہے تھے کہ ادھر جمہوری حکومت قائم ہوئی ادھر سب مسائل ختم ہو جائیں گے۔ نہ اس جمہوری حکومت نے کچھ کیا اور نہ تمہارے یہ مضامین، کالم اور آرٹیکل کچھ کر سکے۔ ایویں ہی لکھ لکھ کر کاغذ سیاہ کرتے رہے

ہم۔۔۔۔‘‘

’’یار! ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔۔۔۔جمعہ جمعہ آج آٹھ دن ہوئے ہیں نئی حکومت کو۔۔۔۔‘‘صدف نے مسکرا کر عروج کی طرف دیکھا۔

’’پوت کے پاؤں پنگوڑے۔۔۔۔میں‘‘ عاشی کے لہجے میں تلخی تھی۔

’’نظر تو آرہا ہے کہ سب کیا ہورہا ہے اور کس کی ایما پر۔۔۔۔؟‘‘

’’یار عاشی! یہ آج تم اتنی سنجیدہ کیوں ہو۔۔۔۔‘‘ آمنہ نے بھی لکھنا چھوڑ کر قلم دانتوں تلے دباتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

’’یونہی۔۔۔۔‘‘ عاشی نے افسردگی سے کہا۔

’’آج دل بہت اداس ہے جب جب خبریں سنتی ہوں کہ آج امریکی جاسوس طیارے نے وزیرستان میں میزائل گرایا۔۔۔۔اتنے قبائلی مسلمان شہید گئے۔۔۔سیکورٹی فورسز پر حملہ ہوا، آج سوات آج باجوڑ۔۔۔۔۔۔

اوہ مائی گاڈ آمنہ۔۔۔۔!

مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔۔۔۔

یہ سب کیا ہے۔۔۔۔؟

ہم اپنے ہی شہریوں کو کیوں قتل کر رہے ہیں۔۔۔۔؟

کیوں ان کے خون سے کھیل رہے ہیں۔۔۔۔؟

نیٹو افواج قبائلی علاقوں میں کیوں حملے کر رہی ہیں۔۔۔۔؟

آمنہ! مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا میں تمہاری طرح تو رائٹر نہیں ہوں، نہ ہی صحافی، ادیب، یا ماہر تجزیہ نگار۔۔۔۔میں تم سب کے کالم پڑھتی ہوں ڈاکٹر فہد کا ’’نہ جس کا خیال۔۔۔‘‘ فیصل کا ’’شاید کہ تیرے میں اتر جائے۔۔۔۔‘‘ اور تمہارے اسید بھائی کا، یہ سب مجھے الجھا دیتے ہیں کیوں۔۔۔۔؟

کس لیے۔۔۔۔؟ کس لیے۔۔۔۔؟ آمنہ! چند سال پہلے تک تو یہاں اس ملک میں کوئی دہشت گرد نہیں ہوتے تھے۔ اب یکا یک یہ سارے دہشت گرد کہاں سے پیدا ہو گئے۔۔۔۔کیا کسی جادو کے زور سے زمین سے اُگ آئے ہیں۔۔۔۔انگورا، فاٹا، ڈومہ

ڈولا میں مرنے والے سات آٹھ دس گیارہ سال کے بچے کیسے دہشت گرد بن گئے۔۔۔۔؟‘‘

’’دراصل یہ اسامہ کی تلاش میں قبائلی علاقوں پر حملے کر رہے ہیں ان کا خیال ہے کہ اسامہ یہاں چھپا ہوا ہے۔‘‘ عروج نے عاشی کو مطمئن کرنا چاہا۔

’’تورا بورا کی پہاڑیوں کے پتھر تک پگھل گئے۔۔۔۔امریکی بمباری سے لیکن اسامہ بن لادن نہیں ملا۔ عروج بی بی۔۔۔۔!‘‘ صدف نے عروج کو مخاطب کیا۔

’’اندرون خانہ کہانی کچھ اور ہے مختصر یہ سمجھ لو کہ امریکہ پاکستان کے بے پناہ ذخائر کا بلا شرکت غیرے مالک بننا چاہتا ہے اور اس کا اصل ہدف اسلام ہے وہ تمام عالم اسلام کے ذخائر کو اپنے تصرف میں لانا چاہتا ہے عراق پر حملہ، افغانستان پر حملہ۔۔۔اس کے بعد ایران اور پاکستان اب اس کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔‘‘

عاشی الجھی الجھی سے اسے دیکھ رہی تھی اسے اب بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ

’’امریکہ کو آخر تکلیف کیا ہے کہ وہ خود اتنا امیر ملک ہے ہمارے ملک سے لوگ بھاگ بھاگ کر پیسہ کمانے وہاں جاتے ہیں اسے پھر کیوں اتنا لالچ ہے؟‘‘

عاشی سوالیہ نظروں سے صدف کو دیکھ رہی تھی جب حامد کاغذوں کا پلندہ اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔

’’کیا ہو رہا ہے خواتین!‘‘

’’فی الحال تو عاشی کی الجھن دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔‘‘

صدف نے حامد کو ساری تفصیل بتائی۔

صدف نے صحیح کہا: ’’امریکہ نے بہت پہلے یہ پلان کر لیا تھا کہ اسے خود کو مضبوط بنانے کے لیے تیسری دنیا کا استحصال کرنا اور ان کے ذخائر پر قبضے کرنے ہیں جہاں تک ہمارے قبائلی علاقوں کا تعلق ہے تو یہ بھی اس کے منصوبے کا ایک حصہ ہے کہ پہلے مرحلے میں اس نے قبائلی علاقوں میں دہشت گردوں کا انکشاف کیا قبائلیوں کو اسلحہ اور امداد دی پھر پاک فوج کو آگے بڑھایا اور اب میزائل حملے۔۔۔۔یہ سب ایک باقاعدہ پلان کے تحت ہو رہا ہے۔‘‘

''آپ لکھنے والے صحافی قلم کار سب جانتے ہیں تو پھر اسے لکھتے نہیں ہیں بتاتے کیوں نہیں لوگوں کو امریکہ کے عزائم۔۔۔۔'' عاشی نے حامد کو ٹوک دیا۔

''سب نہ سہی لیکن کچھ لوگ ہیں جو لکھ رہے ہیں تم سب یاسر محمد کے آرٹیکل پڑھا کرو، سمیع اللہ ملک نے آنے والے خطرات پر لکھا ہے کئی ویب سائٹ ایسی ہیں جہاں سے تمہیں ان اسلام دشمن لوگوں کی سازشوں کا پتا چلے گا یوں لگتا ہے جیسے ساری دنیا اسلام کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔''

''تو یہ جو ہمارے لیڈر ہیں ہمارے سربراہ ہیں یہ نہیں پڑھتے یہ سب جو امریکہ کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں حامد! آپ ان سارے مضامین اور تجزیوں کی کٹنگ انہیں بجھوادیں تو شاید پڑھ کر انہیں بھی پتا چل جائے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟''

عاشی نے معصومیت سے کہا تو سب کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

''ہمارے لیڈر اپنی آنکھیں اور کان بند رکھتے ہیں تمہیں علم نہیں ہے کیا؟'' صدف نے کہا۔

''پگلی سب جانتے ہیں یہ اور سب کچھ ان کے علم میں ہے کیا ہماری ایجنسیوں نے انہیں خبر نہیں دی ہوگی کہ بیت اللہ محسود اور اس کے ساتھیوں کے پاس یہ جدید اسلحہ کہاں سے آیا ہے؟ کون ان کی پشت پناہی کر رہا ہے؟'' حامد نے کاغذوں کا پلندہ میز پر رکھا اور خود کرسی پر بیٹھتے ہوئے عاشی سے مخاطب ہوا۔

''کون کر رہا ہے؟'' عاشی نے پوچھا۔

''امریکہ۔'' حامد کا جواب تھا۔

اور ہماری آئی، ایس، آئی نے یہ حقیقت جان لی تھی ایک بار نشاندھی کے باوجود امریکی ڈرون نے بیت اللہ محسود پر نہ صرف یہ کہ اس پر فائر نہیں کیا بلکہ اس ایریے کو اپنے سیٹلائٹ کمیونیکیشن سے لاک کر دیا تھا تاکہ کوئی اور نقصان نہ پہنچا سکے اس سے ثابت ہو گیا کہ بیت اللہ محسود کو کس ملک نے تحفظ دے رکھا ہے اور امریکی تعاون حاصل ہے اسے اور آئی ایس آئی کی مخالفت بھی اسی سبب ہے کہ اس نے اصل حقیقت جان لی ہے کہ کون امریکہ کا ایجنٹ ہے اور کون پاکستان کو کافر ریاست قرار دے کر اس کے خلاف جنگ کو جہاد کا

نام دے رہے ہیں۔''

عاشی حیرت سے منہ پھاڑے حامد کو دیکھ رہی تھی۔

''لیکن میں تو طالبان کو بہت اچھا سمجھتی تھی میں نے ان کے متعلق پڑھا تھا کہ وہ سچے مسلمان ہیں قرون اولیٰ کے مسلمانوں جیسے۔۔۔۔''

''ہاں ہوں گی ان کے متعلق مختلف رائیں۔۔۔۔ کچھ لوگ سچے مسلمان اور مومن ہیں اور کچھ انتہا پسند ہیں۔۔۔۔ بکاؤ مال ہیں اور مسلمانوں کے نام پر دھبہ ہیں ان کا افغان مجاہدین یا طالبان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عاشی! یہ وہی لوگ ہیں جو خود کش حملے کر رہے ہیں۔۔۔۔ را، خاد، موساد اور سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں۔۔۔۔ سب ملک میں افراتفری پھیلا کر اسے توڑنا چاہتے ہیں۔'' حامد کے لہجے میں نفرت تھی۔

''تم کیا جانو عاشی! یہ کیسے چاروں طرف سے ہم پر حملہ آور ہو چکے ہیں؟ ایک طرف تو یہ دہشت گردی کا سلسلہ ہے۔ دہشت گردی کے نام پر کتنے ہی بے گناہوں کا خون بہایا جا چکا ہے۔ ہر طرح سے ہماری معیشت کو تباہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اندر ہی اندر ہماری جڑیں کاٹی جا رہی ہیں۔

ہمارا بے چارہ کاشتکار۔۔۔۔

اسے تباہ کرنے کی سازش۔۔۔۔

ضرورت کے وقت ان سے دھان نہیں خریدا جا سکتا، کپاس بونے والے الگ [illegible] رہے ہیں۔۔۔۔

ہمارے حکمرانوں کی انتظامی نااہلی۔۔۔۔

وجہ کیا ہے؟ کیوں دھان نہیں خریدا گیا وقت پر کہ وہ رقم حاصل کر کے گندم کی پیداوار کر سکیں؟ کیوں کھاد مہنگی کی گئی؟ کیوں گندم گودام میں پڑے پڑے خراب ہو گئی؟ آنے والا وقت بتائے گا کہ یہ سب سازشیں کہاں اور کس جگہ بیٹھ کر تیار کی جا رہی تھیں۔۔۔؟

کون نہیں جانتا کہ یہ سب ہمارے ملک کو قحط اور مہنگائی سے دوچار کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے، دریاؤں کا پانی بند کر دیا گیا، ہماری زمینیں بنجر کرنے کی کوشش کی جا رہی

ہے۔۔۔ہمارے ملک میں دوسروں کے احکام چل رہے ہیں۔۔۔ ہمارے حکمران صرف دانتوں کی نمائش کرنے کسی چینل پر آجاتے ہیں۔۔۔۔'' حامد بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

''بکے ہوئے زرخرید لیڈر ملک کو کیا دے سکتے ہیں؟ سوائے قرضوں کے۔۔۔ ہمارا ملک آج بھی معاشی لحاظ سے مضبوط ہوسکتا ہے بس تھوڑی سی ہمت چاہیے۔''

''آج کی تازہ خبر آج کی تازہ خبر۔۔۔''سعید اخبار ہاتھ میں لہراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''کیا ہوا۔۔۔کیا امریکہ نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔۔۔'' عاشی نے بوکھلا کر پوچھا۔

اس کے ذہن میں ابھی تک حامد کی باتیں گونج رہی تھیں۔

''امریکہ پاکستان پر کب کا حملہ کر چکا ہے مائی ڈیئر کزن۔۔۔!''سعید نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور کونے میں پڑی ٹیبل پر سے فائلوں کا ڈھیر ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے ٹیبل پر ہی بیٹھ گیا۔

''تم ہمیشہ ٹیبل پر ہی کیوں بیٹھتے ہو۔۔۔؟''صدف نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں کسی ایسی چیز پر نہیں بیٹھنا چاہتا جس سے چپک جانے کا خطرہ ہو۔۔۔''سعید نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے عاشی کی طرف دیکھا۔

''تو عاشی ڈیئر! تمہاری لاعلمی پر حیرت ہو رہی ہے کتنے سال ہو گئے ہیں امریکہ کو ہمارے ملک میں دراندازی کرتے ہوئے اور تم اتنی معصوم ہو کہ تمہیں خبر نہیں۔۔۔''

''لیکن وہ حملہ تو نہیں ہے نا۔۔۔''

''یار! اور حملہ کسے کہتے ہیں۔۔۔دندناتا پھر رہا ہے امریکہ یہاں۔۔۔جب جی چاہتا ہے اس کے ڈرون آکر میزائل گرا کر چند بندے پھڑکا جاتے ہیں۔ ابھی تو قبائلی علاقے اس کی زد پر ہیں۔۔۔دیکھنا کسی روز اسکا کوئی ڈرون یہاں بھی میزائل پھینک جائے گا اسامہ بن لادن یا کسی اور دہشت گرد کی آڑ میں اور ہم احتجاج کا ڈرامہ کر دیں گے

بس۔۔۔''

عاشی کی رنگت زرد ہو گئی۔

''کیا وہ سچ مچ ادھر آسکتے ہیں۔۔۔؟''

''تم میڈیا کی طرح خواہ مخواہ خوف و ہراس نہ پھیلاؤ سعید!''صدف نے اسے ٹوکا اور عاشی کی طرف تسلی آمیز نظروں سے دیکھا۔

''لو میں کوئی جھوٹ بولتا ہوں ڈاکٹر فہد آج بتا رہے تھے کہ امریکیوں کے عزائم خاصے خطرناک ہیں۔''

''تمہیں آج پتا چلا ہے۔۔۔؟''حامد نے طنزیہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

''نہیں پتا تو خیر بہت پہلے سے تھا آج تو ڈاکٹر فہد نے حسن پور کے متعلق بتایا کہ وہاں امریکہ نے ہمارے فوجیوں کو ٹریننگ دینے کی آڑ میں بہت بڑا فوجی اڈا بنا رکھا ہے زیر زمین سرنگیں، برکس اور جنگی جہازوں کے اترنے اور اڑنے کی سہولت، تین سو سے زائد امریکی فوجی ہر وقت پہرہ دے رہے ہیں۔۔۔کسی پاکستانی کو قریب سے گزرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔۔۔تنصیبات براہ راست ان کے نشانے پر ہیں۔''حامد نے آہستگی سے کہا۔

''کیا ہمارے لیڈر اتنے ہی بیوقوف ہیں کہ دشمنوں کو انہوں نے اپنے ملک میں ایسے اڈے بنانے کی اجازت دی ہے؟''عاشی نے حیرت سے پوچھا۔

''بھئی امریکہ ہمارا دشمن کب ہے؟ وہ تو ہمارے لیڈروں کا دوست ہے ہاں پاکستان اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔''سعید کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

''لیکن یہ تو بہت غلط ہے سعید۔۔۔!

ایسا نہیں ہونا چاہیے ہمارے ایٹمی اثاثے۔۔۔کیا یہ تباہ ہو جائیں گے۔۔۔کیا امریکہ انہیں۔۔۔''عاشی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''یہ بہت غلط ہے بہت غلط ہے تم لوگ کچھ کر نہیں سکتے۔۔۔؟''

''کیوں نہیں۔۔۔اوباما میرا لنگوٹیا یار ہے میں آج ہی اس سے ریکویسٹ کرتا ہوں کہ یار۔۔۔!''

"مذاق مت کرو سعید!۔۔۔۔۔" آنسو اسکے رخساروں پر پھیل آئے تھے جنہیں وہ ہاتھوں کی پشت سے صاف کرتی جا رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی۔

"ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ہمیں کتنا مضبوط کر دیا تھا ایٹمی طاقت تھے ہم۔۔۔"

"ہم اب بھی ایٹمی طاقت ہیں۔"

"پتا نہیں مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے ہم نے ایٹم بم بھی امریکہ کے حوالے کر نہ دیئے ہوں۔ہاں ایسی گپ شپ سنتے رہتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔۔۔" حامد سنجیدہ تھا۔

"ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے یاد آیا۔۔۔ میں تمہیں جو زبردست نیوز سنانے والا تھا وہ یہ تھی کہ ڈاکٹر عبداللہ خان کا انٹرویو چھپا ہے۔"

"کس اخبار میں۔۔۔؟"

"یہ اس میں۔۔۔" سعید نے اخبار ہوا میں لہرایا۔

"یہ ایک مقامی اخبار ہے۔"

حامد کھڑا ہو گیا تھا۔

"مجھے تو فیصل کے ساتھ جانا تھا۔۔۔ یہاں ہی آ کر بیٹھ گیا۔"

"کہاں جا رہے ہو تم۔۔۔!"

"یار!ایک بندے کا انٹرویو لینا تھا۔۔۔"

"پچھلے دنوں وہ خبریں آ رہی تھیں نا۔۔۔کہ فلاں ہاسپٹل میں۔۔۔فلاں ڈاکٹر۔۔۔گردوں کی چوری میں ملوث ہیں۔تو مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ مسیحا قاتل کیسے بن سکتا ہے۔فون آیا تھا ایک بندے کا بے چارہ ہاسپٹل میں گیا، پیٹ میں درد تھا۔ڈاکٹر نے کہا اپینڈکس ہے آپریشن کرنا پڑے گا۔پرائیویٹ کلینک تھا آپریٹ کروایا۔ڈاکٹر نے ایک گردہ نکال لیا جس کا انکشاف اتفاق سے دو ہفتے بعد ہی ہو گیا کیونکہ اسے اچانک یورین پرابلم ہو گیا تھا پتا چلا کہ ایک گردہ ہی غائب ہے۔" حامد نے تفصیل بتائی۔

"میں تو اپنے پیشے پر شرمندہ ہوتا ہوں ایسی ایسی کہانیاں پڑھ کر۔۔۔" سعید نے شرمندگی سے کہا۔

"کہانیاں نہیں حقیقت۔۔۔" آمنہ نے جو بہت دیر سے خاموش بیٹھی تھی کہا۔

"آج کل ڈاکٹر بہت ظالم ہو گئے ہیں جب تک روپے تمہاری ٹیبل پر نہ رکھ دیے جائیں تم مریض کو ہاتھ نہیں لگاتے ہو۔۔۔"

"لوگ اتنے لالچی کیوں ہو گئے ہیں آمنہ۔۔۔؟"

عاشی ابھی تک روہانسی ہو رہی تھی۔

"ہمارے ملک کے یہ حالات ہو رہے ہیں۔۔۔امریکہ دانت گاڑھے بیٹھا ہے اور بھارت اور اسرائیل بھی اپنے پنجے تیز کیے اسے نگلنے کو تیار ہیں اور ہمارا لالچ اور ہوس ختم نہیں ہو رہا جیسے یہ سب کسی اور ملک کے ساتھ ہو رہا ہو۔۔۔ہمارا ملک۔۔۔ہمارا اپنا پاکستان اگر اسے کچھ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔۔۔ کہاں جائیں گے۔۔۔آمنہ۔۔۔!ہمارے حکمران کب تک اپنے مفاد پر ہمیں اور ہمارے ملک کو قربان کرتے رہیں گے؟"

"یہ ملک۔۔۔یہ پاک سرزمین پر حکومت کرنے والے ان چند سو یا چند ہزار لوگوں نے حاصل نہیں کیا، ارے یہ تو اللہ کا معجزہ ہے اور معجزہ خدانخواستہ کبھی حرف غلط نہیں ہوتا کہ اسے آرام سے مٹایا جا سکے اور اسے بنانے والے اللہ کے بعد اس کے عوام ہیں اور وہی اسے قائم رکھیں گے انشاء اللہ۔جان دے دیں گے مر جائیں گے اس کی حفاظت کے لیے۔۔۔" خدا بخش چاچا نا جانے کب اندر آئے تھے۔

بزرگ آدمی تھے چند ماہ پہلے ہی یہاں آئے تھے کچھ عرصہ انہوں نے حسین احمد کے دفتر میں بھی کام کیا تھا انہوں نے پاکستان کو اپنی آنکھوں سے بنتے دیکھا تھا۔

عاشی کے سہمے سہمے دل کو خدا بخش چاچا کی بات سے حوصلہ سا ملا تو اس نے اچھی طرح سے اپنا چہرہ ہاتھوں سے صاف کیا پلکیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔

"فیصل صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں حامد بیٹا۔۔۔!"

"ہاں بس آ رہا ہوں۔۔۔" دونوں ہی آگے پیچھے باہر نکل گئے تو عاشی نے سعید سے پوچھا۔

"تم ہاسپٹل سے آ رہے ہو۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔"

"گھر جاؤ گے اب۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔" سعید نے سر ہلایا۔

"مجھے بھی لے جانا۔۔۔"

"ویسے تم آتی کیوں ہو نہ کام نا کاج خواہ مخواہ انہیں بھی آ کر ڈسٹرب کرتی ہوگی اور آنے جانے کا خرچہ الگ۔۔۔"

میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں کچھ کروں اپنے وطن کے لیے، اس ملک کو غاصبوں سے بچانے کے لیے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"تم بس دعائیں کرتی رہو یوں ہی آنسو بہا بہا کر بارگاہ ایزدی میں کبھی تو شنوائی ہوگی۔"

سعید لمحہ بھر کے لیے سنجیدہ دکھائی دیا تھا۔

"خالی دعاؤں سے تو کچھ نہیں ہوتا نا سعید!"

"تو پھر اور کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"یہ تو سمجھ میں نہیں آتا؟" اس نے بے بسی سے کہا۔

"میری طرح نہ جانے کتنی لڑکیاں اور کتنے لڑکے ہوں گے جو دن رات کڑھتے ہوں گے اور کچھ کر نہیں سکتے ہیں نا؟"

"چلو ایسا کرتے ہیں ہم دونوں مل کر ایک پارٹی بناتے ہیں۔ ق لیگ، م لیگ، ن لیگ وغیرہ تو ہیں ہم اپنی پارٹی کا نام بھاری بھر کم رعب دار سا رکھیں گے سعید اینڈ عاشی لیگ۔۔۔ واؤ کیا فنٹاسٹک نام ذہن میں آیا ہے۔"

"بکومت۔۔۔ ملک کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں اور تمہیں مذاق سوجھتا رہتا ہے۔" عاشی نے جھڑکا۔

"اس ملک کے خلاف سازشیں تو تب سے ہو رہی ہیں جب سے یہ بنا تھا لیکن لوگ تب سے عیش کر رہے ہیں، پیسہ بنا رہے ہیں، سو سے پچاس کروڑ، کروڑوں سے دس کروڑ، سب مگن ہیں، مست ہیں، میں تو۔۔۔" عاشی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

صدف نے لکھتے لکھتے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم ڈاکٹر فہد سے کب ملے تھے سعید۔۔۔!"

"آج ہی بلکہ ابھی چند گھنٹے پہلے لیکن کیوں پوچھ رہی ہو کوئی کام تھا کیا۔۔۔؟"

"نہیں بس یوں ہی۔۔۔ بہت دن سے آئے نہیں ادھر۔۔۔"

صدف بات کر کے پھر لکھنے لگی تھی اور سعید نے بغور اس کے چہرے کے تاثرات کو جانچا بالکل سپاٹ فہد کا ذکر کرتے ہوئے کوئی رنگ دمکتے نظر نہیں آئے تھے، نہ آنکھوں میں کوئی چمک آئی تھی، تو کیا فہد میاں کا دل پتھروں میں الجھ گیا ہے اور شاید صدف اب بھی احمد کی محبتوں کے حصار میں رہتی ہے۔

تب ہی تو ڈاکٹر فہد کی آنکھوں کے رنگ پہچان نہیں پائی اور فہد اس کی محبت میں گوڈے گوڈے ڈوب گیا تھا۔

آمنہ نے کلپ بورڈ سے کاغذ الگ کیے اور میز پر پڑے کچھ کاغذ سمیٹتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"ارے آمنہ جی! یہ آپ کہاں چل دیں اتنے دنوں بعد تو ہم آئے ہیں کچھ خاطر تواضع کچھ چائے پانی تو پوچھ لیں۔" سعید نے چونک کر آمنہ کی طرف دیکھا۔

"میں ذرا اسید کے کمرے میں جا رہی ہوں۔۔۔ ابھی آتی ہوں تم جانا نہیں میں چائے کا کہہ جاتی ہوں چھوٹے کو۔۔۔"

جب سے اسید نے محبت کا اعتراف کیا تھا آمنہ کے چہرے پر رنگ ہی رنگ بکھرے رہتے تھے اور وہ بے حد خوبصورت ہو گئی تھی۔۔۔ اعتماد اور محبت ان سب نے مل کر اس کے حسن میں جیسے رنگ بھر دیئے تھے۔

"آمنہ بہت پیاری ہو گئی ہے صدف! ہیں نا۔۔۔؟"

"پیاری ہو گئی ہے کیا۔۔۔ وہ تو ہمیشہ سے پیاری ہے۔۔۔"

صدف نے لکھتے لکھتے عاشی کی بات کا جواب دیا اور آمنہ نے باہر نکلتے ہوئے دونوں کی بات سنی تھی اور اس کے لبوں پر ایک دلفریب سی مسکراہٹ بکھر گئی۔۔۔

"یہ سب محبت کا اعجاز ہے جس نے عام سی آمنہ کو خاص بنا دیا ہے۔"

اسید کمپیوٹر ٹیبل کے سامنے بیٹھا تھا جب آمنہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی تو ریوالنگ چیر کو گھماتے ہوئے اسید نے آمنہ کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"ہاں تو تیار ہو گئے تمہارے آرٹیکل، کیا لکھا ہے۔۔۔؟"

"ابھی کوئی چیز کمپلیٹ نہیں ہے مجھے آپ سے ڈسکس کرنا تھا۔۔۔"

"ہاں ضرور۔۔۔ کیا مسئلہ ہے بیٹھ جاؤ۔۔۔" آمنہ سائیڈ پر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں نے انڈین کلچر کی یلغار اور کیبل کے نقصانات پر لکھنا شروع کیا تھا لیکن پھر چھوڑ دیا، میں نے کچھ ٹاپک سلیکٹ کیے اور ان پر مرحلہ وار لکھنا چاہتی ہوں، میڈیا بھی اس میں شامل ہے، پرنٹ میڈیا تو بہرحال کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ کر ہی رہا ہے لیکن الیکٹرانک میڈیا نے تو اسلامی اقدار کے پرخچے ہی اڑا دیئے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ آج کل کے دور میں الیکٹرانک میڈیا قوم کو بگاڑ بھی سکتا ہے اور سنوار بھی سکتا ہے بہرحال میں نے یہ ٹاپک سلیکٹ کیے ہیں۔

نظام عدل، معاشرے کی تباہی کا ایک بڑا سبب ایسا نظام عدل ہے جو نظریہ ضرورت کے تحت قائم کیا جائے اور ہر قیمت پر بک جائے مجھے اس پر لکھنا ہے۔ پھر ہمارے ملک کا نظام تعلیم ہے۔

سیاست اور سیاستدان۔۔۔ میں تو کہتی ہوں اسید! ایک بار ہمارے سیاستدان صحیح ہو جائیں تو سب صحیح ہو جائے گا۔۔۔

ہمارے علماء، ہماری مساجد، ہمارے تعلیمی ادارے، ہماری زرعی و صنعتی پالیسیاں بنانے والے مجھے ان سب پر لکھنا ہے لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ میں کیسے اور کہاں سے شروع کروں۔ میں ایک بات بتاؤں کل کی بات ہے پڑوس سے ایک بچہ ہمارے گھر آیا ہوا تھا بمشکل چار سال کا ہوگا میں نے اس کے مانگنے پر اسے پانی دیا وہ دونوں ہاتھوں میں گلاس پکڑے بیٹھ گیا اور اس نے بیٹھ کر پانی پیا کیوں۔۔۔؟ اس لیے کہ اس کے گھر میں اسے بتایا گیا تھا کہ پانی بیٹھ کر پیو اور میں نے دیکھا کہ اس بچے کے ذہن میں یہ بات

موجود تھی اس لیے وہ بمشکل پاؤں کے بل بیٹھا تھا۔ تو ہمارا میڈیا، ہمارا نصاب۔۔۔ ہم جو کچھ انہیں دیں گے وہ وہی سیکھیں گے لیکن ہم تو انہیں صرف ناچ، گانا، دیوی، دیوتاؤں کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا، ہی سکھا رہے ہیں نا۔۔۔"

اسید نے ایک پرستائش نظر اس پر ڈالی اور لمحہ کے بھر کے لیے اس کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ دل نے چاہا کہ وہ کچھ دیر یونہی اس چہرے کو اپنی نظروں میں بسائے رکھے، دل کی خواہش کو رد کرتے ہوئے اس نے اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔

"بہت اچھا خیال ہے آمنہ! ضرور لکھو، ہماری قوم کے ہر فرد کو آگاہی کی ضرورت ہے، فی الحال تم میڈیا کے حوالے سے لکھنا، اپنا یہ آرٹیکل مکمل کر لو۔۔۔"

"لیکن ہر فرد اخبار تو نہیں پڑھتا۔۔۔"

بے اختیار آمنہ کے لبوں سے نکلا تو اسید کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"تم نے آج عاشی جیسی بات کی آمنہ! ہمارا کام آگاہ کرنا ہے سب نہ سہی کچھ تو آگاہ ہوں گے نا۔۔۔"

آمنہ نے سر ہلا دیا اور ہاتھ میں پکڑے کاغذات ٹیبل پر رکھے۔

"میں نے کچھ پوائنٹ لکھے ہیں آپ ایک نظر دیکھ لیجئے گا۔۔۔"

"میرے خیال میں اس کی ضرورت تو نہیں آپ لکھنے کا ہنر جانتی ہو بہرحال تمہاری تسلی کے لیے دیکھ لوں گا۔۔۔"

آمنہ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"آمنہ۔۔۔!" بے اختیار ہی اسید کے لبوں سے نکلا تھا۔

"کچھ دیر بیٹھو۔۔۔"

دل کسی ضدی بچے کی طرح مچل اٹھا تھا۔ آمنہ جھجک کر رک گئی اگرچہ اس دن کے بعد اسید کے اور اس کے درمیان کبھی اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ روٹین کی گفتگو، کسی ایشو پر اخبار کے حوالے سے، کسی آرٹیکل کے متعلق، لیکن ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس دونوں کے دلوں میں انہونی خوشی کا احساس دھڑکتا رہتا تھا۔

"تم آمنہ۔۔۔! کیا چیز ہو، تمہارا جادو، مجھے خوفزدہ رکھتا ہے، میں تم سے بھاگتا

تھا کہ کہیں اس سحر میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔۔۔۔لیکن اب جی چاہتا ہے کبھی کبھی بڑی شدت سے کہ میں اس سحر سے کبھی نہ نکلوں۔۔۔۔تم میرے سامنے بیٹھی رہو اور میں اس محبت کے سحر میں گم ہو جاؤں۔۔۔۔" اسید نے گہری سوچوں کو جھٹک کر آمنہ کی طرف دیکھا۔

"بیٹھ جاؤ نا آمنہ۔۔۔۔!"

وہ پرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور آمنہ جھجکتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

غلام فریدا دل اوتھے جتھے اگلا اس دی قدر جانے

دھوپ میں کرسی پر نیم دراز آنکھیں موندھے سعید گنگنا رہا تھا کبھی کبھی آنکھیں کھول کر عاشی کو بھی دیکھ لیتا تھا جو آمنہ کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھی ہولے ہولے اس کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی۔آج چھٹی کی وجہ سے اخبار کا آفس بند ہے اور آمنہ کو عاشی کے ساتھ شاپنگ کے لیے بھی جانا تھا، عاشی کو اپنی شادی کی تیاری کے سلسلے میں شاپنگ کرنا تھی۔

"یار! کس کو دل دیا ہے۔۔۔۔؟"

ڈاکٹر فہد نے بیٹھک سے باہر نکل کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا جب سے اسید کو پتا چلا تھا کہ ڈاکٹر فہد کے خاندان کے سب افراد زلزلے میں ختم ہو گئے تھے۔فہد اپنی پڑھائی کے سلسلے میں لاہور تھا اور باقی خاندان مظفر آباد میں وہ ڈاکٹر فہد کو ہر ویک اینڈ پر گھر لے آتا تھا اور ڈاکٹر فہد بھی اس گھریلو ماحول میں اپنا دکھ بھول جاتا تھا۔

"ہمیں تو موقع ہی نہیں ملا دل دینے کا، وہ کیا کہتے ہیں کہ اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے ہم۔۔۔۔" اس نے کن اکھیوں سے عاشی کی طرف دیکھا۔

"تو آزاد کرلو خود کو۔۔۔۔" عاشی کو بلاسوچے سمجھے بولنے کی عادت تھی۔

"تو اجازت ہے۔۔۔۔؟"

"بکومت۔۔۔۔" عاشی نے اپنے مخصوص انداز سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

"فہد بھائی! آپ کے لیے چائے بناؤں۔۔۔۔"

"نہیں، یہ اسید کہاں ہے؟ مجھے کام سے جانا تھا۔۔۔۔"

"دادا جان کے پاس ہیں۔۔۔۔" سعید نے جواب دیا۔

"تم تو چائے پیو گی نا۔۔۔۔؟"

عاشی نے آمنہ سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن یار! جلدی کرنا گیارہ تو بج گئے ہیں اور آج کل دن اتنے چھوٹے ہیں شام ہو جائے گی، مارکیٹیں بھی تو گیارہ بجے سے پہلے نہیں کھلتیں۔"

عاشی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"میرے لیے بھی ایک کپ بنالو۔آج ناشتے پہ وحید نے جو چائے بنائی تھی اس میں اور حکیم افضل خان کے جوشاندے میں کوئی فرق نہ تھا۔۔۔۔"

"خود بنالو۔۔۔۔" عاشی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"ناراض ہو گئی ہے سعید۔۔۔۔!"

آمنہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔"اب چائے کی خاطر منانا ہی پڑے گا۔۔۔۔"

وہ اٹھ کر عاشی کے پیچھے کچن میں چلا گیا۔

آمنہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اسے عاشی اور سعید دونوں ہی بے حد عزیز ہو گئے تھے، سعید کے برجستہ جملے، مذاق، سنجیدہ صورت حال میں بھی مسکرانے پر مجبور کر دیتے تھے۔کل دادی جان کا پیغام اسید نے دیا تھا کہ" وہ عاشی کے ساتھ جا کر اس کی پسند کے کپڑے وغیرہ لے لے" ان کا ارادہ تھا عید کے بعد سعید اور عاشی کی شادی کا، یوں وہ ناشتہ کر کے گھر سے نکلی تھی۔وحید عاشی کو بلا لایا تھا چونکہ دادی جان نفل پڑھ رہی تھیں اس لیے وہ برآمدے میں ہی بیٹھ کر سعید سے باتیں کرنے لگی تھی۔چائے پینے تک دادی جان بھی فارغ ہو جائیں گی تو ان سے تفصیل پوچھوں گی کہ کیا کیا خریدنا ہے۔

آمنہ نے جھک کر چارپائی پر پڑا اخبار اٹھایا اور دیکھنے لگی تب ہی اسید ڈاکٹر فہد کے ساتھ باتیں کرتا ہوا کمرے سے نکلا۔

"او کے فہد! پھر جلد آنا پھپھو نے آج نہاری بنائی ہے کھانا ادھر ہی کھانا پھپھو بھجوا دیں گی ادھر۔۔۔۔"

فہد کو خدا حافظ کہہ کر وہ چارپائی پر بیٹھ گیا گو ابھی زیادہ سردی نہیں پڑی تھی لیکن دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔

"یہ عاشی کدھر ہے تم لوگوں کو کب جانا ہے۔۔۔؟"

"چائے بنا رہی ہے پی کر چلتے ہیں۔۔۔"

"گھر میں سب ٹھیک ہیں نا۔۔۔؟" اس نے آمنہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔۔۔"

آمنہ عاشی کہہ رہی تھی۔

"تم نے افسانے لکھنے چھوڑ دیئے کیوں۔۔۔؟ لکھا کرو آمنہ۔۔۔!"

"ان حالات میں جب ملک میں اتنی مہنگائی ہے، اتنے لوگ مارے جا رہے ہیں، ہر روز اس ملک کے خلاف سازشوں کے جال بنے جا رہے ہیں، میرا رومینٹک افسانے لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔۔۔"

اس نے ذرا سی نظریں اٹھا کر اسید کو دیکھا۔

"مرد حضرات، خاص طور پر لکھاری مرد تو خواتین کے پرچوں میں چھپنے والی کہانیاں اور افسانوں کا بڑا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ انہیں پڑھنا توہین سمجھتے ہیں۔۔۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں نے چند ایک کہانیاں پڑھی ہیں بہت اچھا اور خوبصورت لکھ رہی ہیں خواتین۔۔۔"

"اور میری کوئی کہانی پڑھی ہے آپ نے۔۔۔؟" آمنہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ دو تین۔۔۔" اسید نے بتایا۔

"کیسی لگیں۔۔۔" تمہارا ہر لفظ تمہاری ہر تحریر بہت اچھی ہے، دل میں اتر جاتی ہے، تمہاری تحریر رگوں میں سرائیت کر جاتی ہے۔۔۔" آمنہ کے رخسار شفق رنگ ہو گئے۔

"تمہاری طرح۔۔۔"

آمنہ کے دل نے دہرایا تو شفق کے رنگ گہرے ہوئے۔ اسید دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جب عاشی ٹرے اٹھائے باہر آئی۔ سعید اس کے ساتھ تھا، سعید نے پلاسٹک کی تپائی اٹھا کر آمنہ کے سامنے رکھی اور عاشی نے ٹرے اس پر رکھ دی۔ سعید، اسید کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

"آج کل الیکٹرانک میڈیا زیادہ پاورفل ہے، رات فہد بھائی کہہ رہے تھے کہ میں اپنے نصب العین کو، اپنے خیالات کو، لوگوں تک پہنچانے کے لیے الیکٹرانک میڈیا کا استعمال کرنا چاہتا ہوں، اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنا چینل ہو۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے اسید! تمہارے لیے ایسا ممکن ہے کہ تم ایک چینل لانچ کر سکو۔۔۔" سعید نے چائے کا کپ اسید کو اٹھا کر دیتے ہوئے پوچھا۔

"فہد صحیح کہتا ہے میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں اس کے متعلق۔ اخبار کتنے لوگ پڑھتے ہوں گے کتنے لوگوں کو آگاہی ہوتی ہو گی جو ہم دے رہے ہیں لیکن ٹی وی تو ہر کوئی دیکھتا ہے حتیٰ کہ جھگیوں میں رہنے والوں نے بھی ٹی وی لگا رکھے ہیں میں بہت دنوں سے اس پر ورک کر رہا ہوں لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں ہے اس میں کچھ وقت لگے گا۔۔۔"

اسید نے بتایا تو عاشی نے فوراً ہی کہا "آپ یہ چینل کا کام رہنے دیں اسید بھائی! مجھے زہر لگتے ہیں سب میڈیا والے۔۔۔"

"ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ کیوں؟ عاشی گڑیا! ان بے چاروں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" اسید نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"میرا کیا بگاڑنا ہے لیکن ملک و قوم کا بہت کچھ بگاڑ رہے ہیں۔۔۔"

"تو قوم ایسے بیہودہ پروگرام نہ دیکھے نا جو دوسرے ممالک دکھا رہے ہیں۔۔۔" سعید چینل رن کرنے کے بارے میں بہت سنجیدہ تھا۔

"اول تو یہ کہ حکومت کا کام ہے ایسے فضول اور بیہودہ چینل بند کر دے جو ہماری اسلامی ثقافت کی نفی کرتے ہیں۔ قوم کو تو مفت میں دیکھنے کو سب کچھ ملے گا تو وہ دیکھیں گے ہی۔۔۔"

عاشی سعید کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"لیکن میرا مطلب ان بیہودہ چینل سے نہیں تھا، ہمارے اپنے چینل بھی ان سے کم نہیں ہیں اب میں تو میڈیا کے عمومی کردار کی بات کر رہی ہوں۔۔۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" اسید نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ہمارا میڈیا منفی کردار ادا کر رہا ہے لیکن بہت ساری باتوں کی طرح

ہمیں اس کا احساس نہیں ہے اور ہم خواہ مخواہ میں تعریفوں کے ڈونگرے برساتے رہتے ہیں ان پر۔۔۔“

”تم یہ اوٹنگے بونگے پروگرام دیکھنے کی بجائے سنجیدہ پروگرام دیکھا کرو عاشی! مثلاً ٹاک شو، انٹرویوز، سیاسی ڈسکشن وغیرہ۔۔۔“ سعید نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مشورہ دیا۔

”سب دیکھ رکھے ہیں میں نے۔۔۔“ عاشی نے جل کر کہا۔

”جتنا ٹی وی میں دیکھتی ہوں اتنا تم میں سے کبھی کسی نے نہیں دیکھا ہوگا تمہارے اس میڈیا نے مجھے بے حد مایوس کیا ہے۔۔۔ انتہائی غیر ذمہ دار انٹرویو لینے والے ہیں انہیں بات کرنے کا پتا نہیں جیسے لڑ رہے ہوں اپنی معلومات صفر۔۔۔ اردو تلفظ غلط۔۔۔ اور۔۔۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا چائے کپ نیچے رکھا اور تلخی سے بولی۔

”جن دن مسجد حفصہ کا مسئلہ ہوا تھا تو میں ایک منٹ کے لیے بھی ٹی وی کے سامنے سے نہیں ہٹی تھی اور تمہارے یہ میڈیا کے لوگ صرف کمنٹری کر رہے تھے یہ ہو رہا ہے۔۔۔ وہ ہو رہا ہے۔۔۔ معاملہ ختم کریں۔۔۔ خدا کی قسم اسید بھائی! اگر یہ میڈیا والے ذمہ داری کا ثبوت دیتے اور مثبت انداز میں تبصرہ کرتے کہ یہ سب جو کیا جا رہا ہے غلط ہے صحیح نہیں ہے اسے فوراً ختم ہونا چاہیے تو کبھی بھی معصوم بچیاں اتنی تعداد میں شہید نہ ہوتیں۔۔۔“ وہ یکدم جذباتی ہوگئی تھی۔

”لیکن میڈیا تو در پردہ اکسا رہا تھا کہ یہ سب کرو کچھ لوگ ہوتے ہیں نا سنسنی پیدا کر کے خوش ہونے والے تو یہ بھی ایسے ہی ہیں۔ بچیوں کی شہادت کا ذکر نہیں ہو رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے کرکٹ میچ کی کمنٹری کی جا رہی تھی اور تاریخ کے صفحوں پر دنیا کی تاریخ کا سیاہ ترین باب رقم ہو رہا تھا ایک ریاست، ایک حکومت کا چند ہزار بچیوں پر وہ بھی سات سال سے چودہ پندرہ سال کی عمر کی بچیوں کے خلاف آپریشن۔۔۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھیں چھلک جانے کو بیتاب ہو رہی تھیں۔

”کیا میڈیا والے نہیں جانتے تھے کہ دو تین بندوں کو گرفتار کرنا حکومت کے لیے مشکل نہیں ہے اس کے لیے اتنا ظلم۔۔۔ یہ ان بچیوں کے مجرم ہیں یہ سب میڈیا والے،

صحافی، ہم لوگ۔۔۔ کسی نے احتجاج نہیں کیا، اس وقت سیاست چمکائی انہوں نے، سوچا یہ سیاہ ترین باب جو رقم ہو رہا ہے اس سے حکومت کمزور ہوگی اور وہ پھر سیاست سیاست کھیلیں گے۔۔۔“

عاشی کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی آمنہ نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور ہولے ہولے تھپکنے لگی۔

”ایکچولی میڈیا کے لوگوں کو خود اندازہ نہیں تھا کہ ایسا کچھ ہو جائے گا۔ وہ سمجھتے تھے کہ تھوڑی سی گولیاں چلیں گی اور بس۔۔۔“ سعید نے رائے دی لیکن عاشی یونہی آمنہ کے کندھے سے لگی سسکتی رہی۔

”ناؤ ریلیکس عاشی۔۔۔!“

اسید نے پرسوچ انداز میں عاشی کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”اس کی پیشانی کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔“ اور بعد میں عاشی نے آنسو پونچھتے ہوئے سعید کی طرف دیکھا۔

”یہ صحافی۔۔۔ اور یہ میڈیا والے رونے لگے کہ غلط ہو گیا تھا سب، ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، معصوم لڑکیوں کی کہانیاں لکھی جانے لگیں۔ فلاں لڑکی۔۔۔ فلاں لڑکی۔۔۔ نے موبائل پر ہم سے بات کی۔۔۔ حالانکہ کسی بچی کو موبائل رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی وہاں اور یہ کہانیاں تھیں۔۔۔ متاثر کرنے کی عوام کو۔۔۔ وہ تو چپ چاپ جل کر راکھ ہوگئیں بلا وجہ۔۔۔ بے قصور۔۔۔ وہ غلط تھے۔۔۔ مانا۔۔۔“

”تمہارا میڈیا بھی تو آزادی کو پسند کرتا ہے ان کی نظروں میں بھی تو مذہبی اور دینی لوگ کھٹکتے ہیں اسی لیے چند شخص اگر ڈٹ جاتے، سڑکوں پر نکل آتے، میڈیا والے شور مچاتے تو کیا یہ آپریشن ہوتا۔۔۔ پھر بھی۔۔۔؟“ وہ سانس لینے کو رکی۔

”جہاں کہیں دھماکہ ہوتا ہے ان کی رننگ کمنٹری شروع ہو جاتی ہے۔۔۔ بے حس انداز میں اکثر غلط انفارمیشن۔۔۔ انہیں تو یہ تک نہیں معلوم کہ کون سی بات ہائی لائیٹ کرنی ہے اور کون سی بات کا سرسری ذکر کرنا ہے اور جو باتیں نہیں کرنے والی وہ بار بار کریں گے، نہ انہیں پاکستان کی عزت کا خیال ہے نہ وقار کا۔۔۔ غلط بات کی تردید کرنے کے

بجائے اسے اچھالیں گے۔۔۔۔جھوٹ کو اتنی بار بولا جائے تو وہ سچ لگنے لگتا ہے اور یہ بھی غیر ملکی چینلز پر بولے گئے جھوٹ کو اتنی بار دہراتے ہیں کہ وہ سچ لگنے لگتا ہے۔اگر آپ کے چینل نے بھی یہی کچھ کرنا ہے تو مت شروع کریں یہ چینل۔۔۔۔

I Hate this media

میں اس میڈیا سے نفرت کرتی ہوں۔۔۔۔''

اس نے ٹیبل پر پڑا چائے کا کپ اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں ٹھنڈی چائے پی لی۔

''یار عاشی! تم تو بہت بدگمان ہو رہی ہو۔۔۔۔حالانکہ سب ایسے نہیں ہیں بہت سے صحافی ایسے ہیں جو بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں، بغیر کسی خوف اور ڈر کے، میں تو خود کئی پروگرام بہت شوق سے دیکھتا ہوں۔۔۔۔'' سعید نے اسکی بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی۔

''ہوں گے کچھ ایسے لوگ، لیکن مجھے تو بہت ڈرامہ لگتے ہیں جیسے وہ کچھ ایکٹ کر رہے ہوں ایک دن لگے گا ان سے زیادہ محبت وطن اور قوم کا درد رکھنے والا کوئی ہے ہی نہیں اور دوسرے دن لگے گا جیسے کوئی سی آئی اے کا ایجنٹ بول رہا ہے۔

میں تو ایک عام شہری ہوں تمہاری طرح بہت ایجوکیٹڈ نہیں ہوں میری سوچ بھی میری طرح عام ہے ہو سکتا ہے میں غلط ہوں لیکن کیا رائیٹر اور کیا صحافی اخبار میں لکھ رہے ہیں یا ٹی وی چینلز پر آرہے ہیں سب مجھے ڈاکٹر جلیبی لگتے ہیں۔۔۔۔''

عاشی نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے تو اسید کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کچھ بھی ہے سعید! ہماری عوام اب اتنی باشعور ہے وہ ڈرامے اور حقیقت کا فرق محسوس کرتی ہے، اسے جھوٹ اور سچ میں بھی فرق کرنا آتا ہے، عاشی کی بات اور خیالات نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے، عاشی کی باتوں سے تمہیں اتفاق ہو یا نہ ہوں لیکن یہ بات تمہیں ماننی پڑے گی کہ ہمارے میڈیا والوں میں احساس اور ذمہ داری نہیں ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ میڈیا میں بہت پاور ہوتی ہے، چاہے تو قوموں کی تقدیر بدل دے، حکومتوں کو فیصلے بدلنے پر مجبور کر دے لیکن اس کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے اس کا

فقدان ہے تاہم کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جنہیں سلام کرنے کو دل چاہتا ہے۔۔۔۔''

اسید بات ختم کر کے کھڑا ہو گیا۔

''او کے۔۔۔۔مجھے جانا تھا عاشی کی باتوں میں دیر ہو گئی۔''

''کہاں۔۔۔۔؟'' سعید نے پوچھا۔

''اخبار کا آفس تو بند ہے آج۔۔۔۔''

''ہاں کسی سے ملنا تھا۔۔۔۔''

''آپ ٹھہریں میں دادی سے بات کر کے آتی ہوں۔آپ کو ڈراپ کر دوں گی۔''

آمنہ نے کھڑے ہوتے ہوئے اسید سے کہا۔

اور عاشی کو تیار ہونے کے لیے کہتی ہوئی دادی جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

''اسید! مجھے تم سے کوئی بات کرنا تھی۔۔۔۔''

سعید نے اسید کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے آہستگی سے کہا تو اسید نے ہاتھ میں پکڑی کتاب اوندھی کر کے تکیے کے پاس رکھ دی۔

''ہاں کہو۔۔۔۔کیا بات ہے؟ تم سوئے نہیں ابھی تک۔۔۔۔''

وہ دو تین دنوں سے دیکھ رہا تھا کہ سعید کچھ پریشان سا ہے، اس کی فطری شوخی بھی ان دنوں اس میں مفقود تھی، بلکہ رات کھانے پر بھی وحید کے مذاق پر وہ خاموش ہی رہا تھا اس وقت بھی وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

''ہاں کہو نا یار! کیا بات ہے کیا چیز پریشان کر رہی تمہیں۔۔۔۔؟''

''اسید۔۔۔۔!''

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''اسید! اگر میں عاشی سے شادی نہ کروں تو۔۔۔۔''

''کیا کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔۔؟'' اسید کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم اپنی بات کا مطلب سمجھتے ہوں۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں عاشی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔۔۔"

"کیا کوئی اور۔۔۔ کیا کسی اور سے شادی کرنا چاہتے ہوں تم۔۔۔ یہ بات تمہیں پہلے معلوم نہیں تھی۔۔۔؟" اسید کی آواز تھوڑی بلند ہو گئی تھی۔

"نہیں۔۔۔ میں کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔۔۔" سعید نے نظریں جھکا لیں۔

"اور ابھی چند ماہ پہلے تو تمہیں شادی کی بہت جلدی تھی۔۔۔ یہ تم ہی تھے جس نے دادی جان سے کہہ کر عاشی کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے سے منع کیا تھا کہ تم جلدی شادی کرنا چاہتے ہو۔۔۔"

ہاں تب میں شاید خود غرض ہو گیا تھا اسید! میں نے سوچا تھا میرے پاس وقت کم ہے تو میں زندگی کا یہ رنگ یہ خوشی بھی دیکھ لوں۔۔۔ میں۔۔۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔ سعید! خدا کے لیے صاف بات بتاؤ کیوں وقت کم ہے تمہارے پاس کیا ہو رہا ہے تمہیں۔۔۔"

اسید کا سارا غصہ لمحوں میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اس نے بے قرار سا ہو کر سعید کو ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ ایک لمحے میں ہزاروں وسوسے جیسے اس پر حملہ آور ہوئے تھے۔

"کوئی بیماری۔۔۔ کوئی خطرناک بیماری۔۔۔ بلڈ کینسر۔۔۔" احمد کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا بے بسی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں ابھی مرنا نہیں چاہتا اسید۔۔۔! میں نے تو ابھی عاشی سے وہ سب کچھ کہا ہی نہیں جو اپنے دل میں سینت سینت کر رکھتا ہوں۔۔۔"

غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ میں اس کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔

"کیا کہوں۔۔۔؟" سعید نے آہستگی سے کہا۔

"میرے پاس وقت نہیں رہا شاید ایک سال یا پھر دو سال۔۔۔"

"کیا ہوا ہے تمہیں سعید۔۔۔!"

اسید کی آواز گھٹ گئی تھی بہت سارے آنسوؤں نے اس کا حلق سی لیا تھا اس نے یکدم دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

"کچھ نہیں ہوگا تمہیں۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ۔۔۔ میں تمہیں لے جاؤں گا کہیں بھی، کسی جگہ بھی، بہت ترقی کر چکی ہے میڈیسن کی فیلڈ۔۔۔"

"موت کا تو کوئی علاج نہیں ہے اسید۔۔۔! اس نے تو اپنے وقت پر آنا ہے اور میری زندگی بہت مختصر ہے اللہ نے مجھے یہ مختصر سی زندگی ہی عطا کی ہے اسید! ڈاکٹر فہد بہت اچھا ہے میں چاہتا ہوں تم ڈاکٹر فہد سے بات کرو کہ وہ عاشی سے۔۔۔"

"پاگل ہو گئے ہو تم۔۔۔!" اسید نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"بتاتے کیوں نہیں کہ ڈاکٹر نے کیا بتایا تمہیں۔۔۔ اور کیا بیماری ہے تمہیں۔۔۔؟"

"مجھے کوئی بیماری نہیں ہے لیکن ہاتھوں میں زندگی کی لکیریں بہت مختصر ہیں۔۔۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ اسید کے سامنے پھیلا دیے۔

"یہ کیا احمقانہ بات ہے اور تم کب سے ماہر پامسٹ بن گئے کہ ہاتھ کی لکیروں کا احوال جاننے لگو، مجھے اصل بات بتاؤ سب بیماریاں لاعلاج نہیں ہوتی۔۔۔"

"اصل بات یہی ہے اسید بھائی۔۔۔!" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"کسی کو ہاتھ دکھایا تھا تم نے۔۔۔؟"

اسید نے ایک چور نظر اس کی پھیلی ہتھیلیوں پر ڈالی، زندگی کی مختصر سی لکیر نے ایک لمحے کو تو جیسے اس کے دل کو مٹھی میں لے لیا۔

"پہلے تو میں نے خود دیکھا تھا۔۔۔ دادا جان کی لائبریری سے میں نے ایم اے ملک اور نیاز فتح پوری کی کتاب نکال کر یونہی شغلاً پڑھی اور اپنے ہاتھ کی لکیریں دیکھتا رہا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ میری زندگی۔۔۔"

"اور دو کتابوں کا سرسری مطالعہ کر کے تم نے سمجھ لیا کہ تم ماہر پامسٹ ہو گئے ہو؟ احمق! ہاتھ کی کوئی ایک لکیر دیکھ کر تم کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتے، ساتھ بہت سے ہیلپنگ لائن بھی ہوتی ہیں، اتنا تو میں بھی جانتا ہوں اور یوں بھی کوئی ایک لکیر اکیلے کوئی

معنی نہیں دیتی۔۔۔'' اسید نے اطمینان کا سانس لیا۔

''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔۔۔''

''لیکن اسید! میں نے دو تین اور اشخاص کو بھی ہاتھ دکھایا ہے ان میں سے دو خاصے مشہور پامسٹ ہیں انہوں نے مجھے کہا ہے کہ اٹھائیس سال کی عمر میں کوئی اچانک حادثہ شاید موت کا سبب بن جائے۔۔۔''

اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کوئی اچانک بم دھماکہ، کوئی روڈ ایکسیڈنٹ، فار گاڈ سیک۔۔۔''

''سعید! ڈاکٹر ہو کر اور سمجھدار ہو کر یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ پامسٹری ایک علم ہے لیکن ضروری نہیں کہ جن افراد نے ہاتھ دیکھا وہ اس علم کے ماہر نہ ہوں۔ مائی گاڈ تم اتنے دنوں سے اسی فضول بات کو دل میں پالے بیٹھے ہو۔''

''بس پتا نہیں کیوں یہ خیال ذہن سے چمٹ کر ہی رہ گیا ہے۔۔۔''

''بس اب فضول بکواس نہیں، تمہاری تسلی کے لیے میں صبح اپنے ایک پروفیسر صاحب کے پاس لے چلونگا جو میرے خیال میں پاکستان میں واحد شخص ہیں جنہیں پامسٹری کے علم سے صحیح واقفیت ہے اور اب جاؤ، جا کر سو جاؤ فضول کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔''

''لیکن اگر تمہارے پروفیسر صاحب نے بھی یہی کہا تو پھر میں عاشی سے شادی نہیں کروں گا۔۔۔'' اپنی بات کر کے وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

''بیوقوف احمق۔۔۔'' اسید نے زیر لب کہا۔

لیکن دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا تھا۔

''حد ہو گئی حماقت کی۔۔۔'' اس نے کتاب اٹھائی لیکن پھر پڑھنے کو موڈ ہی نہ بن سکا۔

''اللہ اسے بہت لمبی زندگی عطا کرے۔۔۔'' اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

وحید اور راحیل تو خاموش طبع سے ہیں اپنی پڑھائی میں مست رہتے ہیں گھر کی

رونق تو سعید کے دم سے ہی ہے کل بھی دادی جان کہہ رہی تھیں۔ دادی جان نے تو کچھ اور بھی کہا تھا۔

لبوں کو بے اختیار مسکراہٹ نے چھوا۔

''آمنہ تمہیں کیسی لگتی ہے اسید۔۔۔!''

سعید کی شادی کے متعلق باتیں کرتے کرتے یکا یک انہوں نے پوچھا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا تھا دل میں یکدم گھنٹیاں سی بج اٹھی تھیں۔

''اچھی ہے دادی جان۔۔۔!''

''لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔۔۔؟''

''مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہے بہت پیاری اور محبت کرنے والی بچی ہے، ہم سوچ رہے تھے کہ اگر تمہارے لیے اس کے والدین سے بات کریں۔ تمہاری پھپھو کی بھی یہی خواہش ہے۔ عاشی کہہ رہی تھی کہ منگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی ابھی اس کی۔۔۔''

''لیکن دادی جان! میں نے بتایا تو تھا آپ کو کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔۔۔''

''ارے تراسی برس ہو چکی میری عمر، اب کتنے دن اور جیوں گی اور چلو تمہاری خوشیاں بھی دیکھ لیں۔۔۔''

''تمہارے ابا بھی چاہتے ہیں کہ سعید کے ساتھ ہی تمہاری شادی بھی کر دی جائے۔۔۔''

''لیکن دادا جان۔۔۔!''

''لیکن ویکن کو چھوڑو میاں! آمنہ اچھی لڑکی ہے بہترین رفیق سفر ثابت ہوگی تمہارے لیے۔۔۔''

والدین لڑکیوں کو زیادہ دیر تک بٹھا نہیں سکتے اور آمنہ جیسی لڑکیوں کے تو نہ جانے اب تک کتنے رشتے آ چکے ہوں۔ زیادہ مت سوچو میں جانتا ہوں کہ آمنہ سے بہتر لڑکی تمہارے لیے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔۔۔''

دادا جان کہہ تو صحیح رہے تھے لیکن اسکی اپنی سوچیں اور اپنے مفروضے تھے۔

"اگر کوئی تمہاری طرح سوچنے لگے تو کوئی بھی شادی نہ کرے۔۔۔"
داداجان نے اسے خاموش دیکھ کر کہا تھا۔

"تنگ نہ کرو ہمیں اسید! بس کہہ دیا میں کل تمہاری پھپھو سے کہوں گی کہ لے چلے مجھے آمنہ کے گھر بھلے لوگ ہیں۔۔۔" اور اسید خاموش ہو گیا۔

دل کے اندر کہیں چراغاں سا ہو گیا تھا۔ آمنہ کی رفاقت میں شب و روز کتنے انوکھے ہو جائیں گے۔۔۔

"لیکن آمنہ۔۔۔! پھپھو کے ادھر جانے سے پہلے مجھے آمنہ سے بات کرنا چاہیے کہ اس میں آمنہ کے کیا تاثرات ہوں گے اسکے شاید وہ حیران رہ جائے۔۔۔

شاید وہ بہت زیادہ خوش۔۔۔ شاید۔۔۔

میں صبح ہی آمنہ سے بات کروں گا پھپھو تو شاید شام کو جائیں بلکہ ابھی کیوں نہ کرلوں ابھی وہ سوئی تو نہ ہوگی۔"

اس نے تکیے کے پاس پڑا موبائل اٹھایا اور پھر رکھ دیا۔۔۔

اسے پھر سعید کا خیال آ گیا تھا بیوقوف بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ۔۔۔ اگر کوئی خدانخواستہ۔۔۔ اس نے اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹکنا چاہا لیکن وہ تو جیسے دماغ سے چمٹ کر ہی رہ گیا تھا وہ اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ سعید کو ڈانٹ رہا تھا کہ خواہ مخواہ اس نے ایک وہم پال لیا ہے اور اب خود۔۔۔

اور ایسے ہی پڑھے لکھے سمجھدار لوگ بھی ان وہموں میں پڑ جاتے ہیں۔ شاید ایمان کی کمزوری اسے ہی کہتے ہیں۔۔۔ چاہت کے باوجود بھی وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک نہیں پا رہا تھا اگر اس وقت ممکن ہوتا تو وہ اسی وقت پروفیسر صاحب کے پاس جاتا لیکن بہر حال رات تو کسی طرح کاٹنی ہی تھی جانے کب وہ تھک کر لیٹا تھا اور اس کی آنکھ لگی تھی لیکن صبح وہ حسب معمول نماز کے وقت اٹھ بیٹھا تھا، ناشتے میں بھی اس نے صرف چائے کا ایک کپ لیا تھا۔ سعید نے دو تین بار اس کی طرف دیکھا وہ اس کی بے چینی اور اضطراب کو محسوس کر رہا تھا لیکن خود وہ مطمئن نظر آتا تھا۔ اس کا جیسے فیصلہ کرنے کے بعد سارا اضطراب ختم ہو چکا تھا اسے یقین تھا کہ پروفیسر صاحب بھی وہی کچھ کہیں گے جو پہلے حضرات کہہ

چکے تھے لیکن اس کا یقین اس وقت متزلزل ہو گیا جب پروفیسر صاحب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر سعید! پتا نہیں آپ نے کس شخص کو ہاتھ دکھایا کم از کم وہ لکیروں کی زبان نہیں سمجھتا۔ انتیس تیس سال کی عمر میں کوئی تکلیف اور بیماری تو ہے لیکن کوئی سیریس بات نہیں۔۔۔ میرے حساب سے آپ طویل عمر پائیں گے اگرچہ اسکی ضرورت نہیں تاہم اپنے ہاتھوں کا نقش چھوڑ جائیں۔۔۔ میں بعد میں بھی اطمینان سے مطالعہ کرلوں گا لیکن یہ بات طے ہے کہ ہاتھ کی لکیریں طویل عمر کی نشاندہی کر رہی ہیں اور آپ طب کے شعبے میں بہت کامیابیاں حاصل کرلیں گے۔۔۔"

"اوہ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔۔۔"

سعید کو لگا جیسے دل پر رکھا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو اور ایک فضول سی بات کے پیچھے میں نے کتنے سال ضائع کر دیئے، سب دوستوں نے پارٹ ون کلیر کرلیا اور اب پارٹ ٹو کی تیاری کر رہے ہیں جبکہ میں۔۔۔

"مجھ سے بڑا احمق اور کوئی نہیں ہوگا۔۔۔" اس نے اسید کی طرف دیکھا تو اسید نے تائید کی۔

"اس میں کوئی شک نہیں ہے اور اب انہیں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔"

وہ یکدم کھڑا ہو گیا تو اسید نے بھی پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اجازت چاہی۔

"تم نے تو ہاسپٹل جانا ہوگا۔۔۔" اسید نے پوچھا۔

"نہیں ابھی تو ایک بکرا خریدوں گا اور ناراض لوگوں کو مناؤں گا۔۔۔"

"کیا مطلب تم نے عاشی سے کہہ دیا سب۔۔۔" اسید نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

یہ گاڑی دو تین ماہ پہلے ہی سعید نے سیکنڈ ہینڈ خریدی تھی جب کبھی لیٹ نائٹ ہاسپٹل جانا، آنا پڑتا تو مسئلہ بن جاتا تھا۔

''نہیں خیر بتایا تو نہیں ۔۔۔ لیکن ان دو تین دنوں میں اپنے رویے سے اسے ضرور الرٹ کیا ہے ۔۔۔''

''احمق ۔۔۔'' اسید نے ایک پیار بھری نظر سے اسے دیکھا اس کے اپنے دل پر بھی رات کو بوجھ سا آپڑا تھا۔ شک اور یقین کے درمیان ڈولتے رات بہت مشکل سے کٹی تھی۔ گاڑی کو مین روڈ پر لانے کے لیے جوں ہی سعید نے ٹرن لیا۔ اسید نے اسے روکا۔

''ٹھہر و یار! مجھے یہاں ہی اتار دو ۔۔۔''

سعید نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ ادھر اندر گلی میں احمد کا گھر ہے بہت عرصہ ہو گیا میں ادھر نہیں آسکا حالانکہ ایک دو بار صدف نے کہا بھی کہ دادا جان مجھے یاد کر رہے ہیں ۔۔۔''

''آپ کہیں تو میں بھی رک جاتا ہوں ۔۔۔؟''

''نہیں یار! تم جاؤ ناراض لوگوں کو مناؤ یہاں سے آسانی سے ٹیکسی رکشہ مل جاتا ہے۔''

اسید نے ہنستے ہوئے کہا اور گاڑی سے اتر گیا۔

احمد کے دادا جان اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ بہت اداس ہو رہا تھا اور کام بھی تھا تم سے لیکن صدف نے بتایا کہ تم بہت مصروف ہو آج بھی صدف سے کہا تھا کہ اسید کو کہنا مجھ سے ملے ۔۔۔''

''ابھی صدف سے ملاقات نہیں ہوئی میں آفس نہیں گیا ۔۔۔ وہ چلی گئی ہے ۔۔۔''

''ہاں بیٹا! وہ تو آمنہ پک کر لیتی ہے اسے بہت اچھی بچی ہے ۔۔۔''

اسید کے ہونٹوں پر یوں مسکراہٹ بکھری جیسے اس کی تعریف کی گئی ہو۔

احمد کی والدہ بھی ہمیشہ کی طرح بہت خوش ہوئیں بہت محبت سے ملیں۔

''تمہارا اخبار بہت اچھا جا رہا ہے اسید! صدف سے لے کر بہت باقاعدگی سے پڑھتی ہوں سب بہت اچھا لکھ رہے ہیں ۔۔۔''

دادا جان نے تعریف کی، احمد کی والدہ کچھ دیر بعد چائے بنانے کے لیے اٹھ

کھڑی ہوئی حالانکہ اس نے منع بھی کیا تھا لیکن وہ اسے کھلا پلا کر خوش ہوتی تھیں ہمیشہ، اس لیے اسید زیادہ ضد نہیں کرتا تھا۔

دادا جان سے باتیں کرتے ہوئے حسب معمول احمد کا ذکر شروع ہوا تو دادا جان کو کوئی نہ کوئی اس کی بات یاد آتی رہی۔

''دادا جان! آپ کو کوئی کام تھا مجھ سے ۔۔۔؟'' اسید کو یکدم یاد آیا تو وہ پوچھ بیٹھا۔

''ہاں وہ ۔۔۔'' انہوں نے اپنی نم آنکھیں پونچھیں۔

''اسید! مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی میری بات پسند نہ آئے تو صاف بتا دینا مجھے ۔۔۔''

''جی کہیے دادا جان ۔۔۔!''

''بیٹا! جیسا کہ تم جانتے ہو صدف مجھے بہت عزیز ہے اور احمد کی والدہ کی تو خیر وہ بھانجی ہی ہے میں نے بھی کبھی اس میں اور احمد میں فرق نہیں سمجھا تھا۔ بچپن کا بہت سا حصہ اس نے یہاں اس گھر میں گزارا ہے۔ احمد کے حوالے سے تو وہ مجھے اور بھی پیاری لگنے لگی تھی میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ اسے اس گھر میں آنا ہے لیکن اب جبکہ احمد نہیں رہا تو میں چاہتا ہوں کہ اس کا رفیق زندگی بہت اچھا ہو۔

اسید بیٹا! یوں تو اس کے کئی پرپوزل آئے ہیں پہلے تو وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہی نہ تھی اب اپنی ماں کے بار بار سمجھانے پر وہ کسی حد تک قائل ہو گئی ہے لیکن بیٹا! پتا نہیں میرا دل کیوں ٹھہرتا نہیں ہے۔ ایک رشتہ ہے لڑکا بی اے ہے اس کے والد کے عزیزوں میں سے ہے، اپنی الیکٹرانک کی شاپ ہے، اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں، سب خاندان والے تقریباً رضامند ہیں بلکہ اس کی والدہ تو دل میں فائنل بھی کر چکی ہیں لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے صدف وہاں خوش نہیں رہے گی وہ لڑکا اس کے مزاج کا نہیں ہے۔''

''اور صدف ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ کیا کہتی ہے ۔۔۔؟'' اسید نے پوچھا۔

''کچھ نہیں اس نے کیا کہنا ہے پہلے انکار کرتی تھی اب چپ رہتی ہے بیٹا! تم ۔۔۔'' وہ کچھ جھجکے۔

"تم۔۔۔! کیا تم صدف کو اپنا نہیں سکتے۔۔۔" ان کی نظریں جھک گئی تھیں اور پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔

اسید ساکت سا بیٹھا تھا۔

"سوری بیٹا! اگر میری بات اچھی نہ لگی ہو تو معاف کر دینا۔ بوڑھا آدمی ہوں بعض اوقات یوں ہی بلا سوچے سمجھے بول جاتا ہوں بس ایک خیال ذہن میں آیا بلکہ کئی دنوں سے ذہن سے چمٹا ہوا ہے جب سے صدف کے رشتے کی بات ہو رہی ہے گھر میں تب سے۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" اسید نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"میں نے آپ کی بات کا برا نہیں منایا میں بھی تو آپ کے احمد کی طرح ہوں جس طرح آپ دل باتیں احمد سے کرتے تھے مجھ سے بھی کر سکتے ہیں۔۔۔" احمد کے داداجان کی آنکھوں میں لحہ بھر کے لیے چمک سی نمودار ہوئی۔ انہوں نے ایک تشکر سی نظر اس پر ڈالی۔

"بیٹا! یہ عمر بھر کی زندگی کی بات ہے کوئی زبردستی جبر نہیں۔۔۔ بس ایک خیال آیا تھا دل میں تم کو اپنا سمجھ کر کہہ دیا، دل نہ مانے تو کوئی بات نہیں بلا جھجک کہہ دینا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔۔۔"

اسید نے بنا بولے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا خاموشی کی زبان میں تسلی دی تھی۔ لیکن خود اس کا ذہن یکدم الجھ گیا تھا وہ کیسے۔۔۔ کس طرح۔۔۔ داداجان سے کہے کہ وہ۔۔۔ آج تو پھپھو نے آمنہ کے گھر جانا تھا۔

اس نے ایک نظر ان کو دیکھا ان کی آنکھوں میں امید اور آس تھی کیا میں اس بوڑھے آدمی کو مایوس کر سکتا ہوں جس نے اتنی آس اتنی امید اور مان سے ایک درخواست کی ہے۔ کاش وہ کچھ اور مانگ لیتے اور اگر میں ان کی امید نہ توڑوں تو آمنہ۔۔۔ اور میرا دل جس نے صرف اور صرف آمنہ کی چاہ کی ہے کیا میں صدف کو خوش رکھ سکوں گا۔۔۔ اور کیا میں جی سکوں گا۔۔۔

وہ داداجان سے اجازت لے کر اٹھا تو بہت الجھا ہوا تھا پھر بھی دفتر پہنچتے ہی اس

نے عاشی کو فون کیا تھا۔

"عاشی۔۔۔! پھپھو کو کہنا وہ آج آمنہ کے گھر نہ جائیں۔۔۔"

"کیوں اسید بھائی۔۔۔!"

عاشی کی تو ہمیشہ سے ہی خواہش تھی کہ آمنہ اور اسید کی شادی ہو۔

"بس یونہی۔۔۔ ابھی کچھ دن نہیں۔۔۔"

اس نے فون فوراً بند کر دیا ورنہ عاشی خوامخواہ بحث کرنے لگتی۔

"نہیں یہ غلط ہے میں بھلا دل میں آمنہ کی محبت چھپائے صدف کو کیا دے سکوں گا۔۔۔؟"

اس نے سر جھٹک کر اس خیال کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی اور ٹیبل پر پڑی فائل اٹھائی یہ حامد کا گردوں کی چوری کے عنوان پر لکھا گیا آرٹیکل تھا اس نے ایک سرسری سی نظر آرٹیکل پر ڈالی تھی پھر حامد کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔

"حامد صاحب تو آج نہیں آئے۔۔۔" خدا بخش چاچا نے بتایا۔

"اچھا تو فیصل کو بھیج دیں۔"

فیصل اور دلاور صاحب ابھی کچھ دیر پہلے ہی باہر نکل گئے ہیں غالباً دھماکہ ہوا ہے کہیں۔۔۔"

وہ بات کر کے واپس مڑ گئے اسید کچھ دیر یوں ہی خالی ذہن سا بیٹھا رہا حالانکہ ابھی اس نے کل کے ایڈیشن کے لیے آڈیٹوریل لکھنا تھا، لکھنے کو بہت کچھ تھا ہر دوسرے تیسرے دن ہونے والے دھماکے، حکمرانوں کی بے حسی، ان کی وہی پرانی ڈگر اور پرانی پالیسیوں پر چلنا۔۔۔ وہی امریکہ کی پالیسیاں۔۔۔

لکھنے کو تو بہت کچھ تھا لیکن قلم جیسے روٹھا ہوا تھا۔ کئی بار اس نے قلم اٹھایا چند لفظ لکھے پھر کاٹ دیئے۔ یہ سب تو روز ہی لکھتا ہوں کبھی کسی موضوع پر کبھی کسی پر آج کچھ اور لکھوں کچھ مختلف۔۔۔ آج کا اداریہ۔۔۔

ڈاکٹر عافیہ صدیقی۔۔۔

لیکن اس پر تو پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔۔۔

ڈاکٹر عبدالقدیر۔۔۔۔ہاں مجھے آج کے اداریئے میں ان کے متعلق لکھنا چاہیے بلکہ مجھے ہر روز کے اخبار میں کچھ نہ کچھ لکھنا چاہیے ان کے متعلق، بغیر ان پر احسان جتائے صرف اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک اخبار میں چھپا ایک مختصر سا بیان آ گیا۔ یہ وہ اخبار تھا جس نے ڈاکٹر عبدالقدیر کا حامی ہونے کا بہت دعویٰ کیا تھا لیکن پتا نہیں ہمارے دل اتنے چھوٹے کیوں ہیں؟ حامد صحیح کہتا ہے کہ ڈاکٹر قدیر کو تو دل کے پر چھپنا چاہیے، شفق پر تحریر ہونا چاہیے، ہاں ٹھیک ہے میں آج کے اداریئے میں ڈاکٹر عبدالقدیر کے متعلق ہی لکھوں گا جنہیں ہم نے فراموش کر دیا ہے۔۔۔۔ہمیں یاد ہی نہیں رہا کہ ہمیں ایٹمی طاقت بنانے والا۔۔۔۔ہمارے سر قوموں کی بھیڑ میں بلند کرنے والا۔۔۔۔اسلام آباد میں نظر بند ہے وہ کس ذہنی اذیت سے گزر رہا ہے اس نظر بندی کے دوران ہمیں یاد نہیں ہم ایسے ہی احسان فراموش ہیں۔۔۔۔

کیا عوام نے کوئی اجتماع کیا۔ صحافیوں نے یا ایک دو اخباروں میں چھپتا رہا کبھی کبھار۔۔۔۔اس نے پھر قلم اٹھایا۔

''ڈاکٹر عبدالقدیر خان محسن پاکستان آخر کب تک پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کی سزا بھگتتے رہیں گے ہم۔۔۔۔''

اور پھر لفظ جیسے یکدم ہی ذہن کی سلیٹ سے غائب ہو گئے اس نے قلم اٹھائے اٹھائے بائیں ہاتھ سے اپنے سر کو دبایا اور پھر قلم رکھ دیا۔۔۔۔نہیں اس وقت نہیں۔۔۔۔کم از کم اس وقت میں کچھ لکھنے کی پوزیشن میں نہیں۔۔۔۔وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ آمنہ اور صدف کے کمرے کی طرف چلا آیا کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور بالکل سامنے ٹیبل کے پیچھے صدف بیٹھی تھی اور دائیں طرف دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر عروج اور آمنہ بیٹھی تھیں تینوں کے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھے اور وہ باتوں میں مصروف تھیں اس نے ایک گہری نظر آمنہ پر ڈالی تھی آج صبح وہ اسے ایک خوشخبری سنانا چاہتا تھا لیکن اس وقت کیا وہ احمد کے دادا جان کو مایوس کر دے۔ کتنے مان سے انہوں نے کہا تھا۔

''اسید۔۔۔۔!صدف کا ہاتھ تھام لو۔''

آمنہ پر سے نگاہیں ہٹا کر اس نے صدف کو دیکھا۔ خوش شکل، ذہین، باشعور وہ کسی بھی دل کا خواب ہو سکتی تھی لیکن۔۔۔۔'' تب ہی صدف کی نظریں اس پر پڑی تھیں اور صدف سے نظریں ملتے ہی وہ زبردستی مسکرایا اور قدم کمرے میں رکھے۔

''ہیلو خواتین! کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔؟''

''چائے اور گپ شپ۔۔۔۔'' عروج نے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ سنائیں گھر میں سب ٹھیک ہیں۔۔۔۔''

''ہاں سب ٹھیک ہیں۔۔۔۔'' اسید بائیں طرف رکھی صوفہ چیئر پر بیٹھ گیا۔

''کس موضوع پر گپ شپ ہو رہی تھی۔۔۔۔؟''

''وہی میڈیا زیر بحث تھا۔'' آمنہ نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اسید کی طرف دیکھا۔

''اس روز عاشی کی باتوں نے ہلا کر رکھ دیا ہم ابھی اس موضوع پر بات کر رہے تھے کہ ہم میڈیا۔۔۔۔خصوصاً الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے لوگوں کو ایجوکیٹ کر سکتے ہیں لیکن ہم نے تو تہیہ کر لیا ہے کہ ہمیں صرف برائیوں کی نشاندہی کرنی ہے۔۔۔۔پتا ہے اسید! جب میں نے عاشی کی باتوں پر غور کیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ صحیح کہتی ہے ہمارا میڈیا احساس ذمہ داری سے کوسوں دور ہے جو باتیں نیگیٹو ہیں انہیں دہرانا۔۔۔۔90 فیصد برائیوں کو اجاگر کرنا، یہاں یہ برائی ہے وہ برائی ہے، کیا دوسرے ممالک میں یہ سب کرپشن نہیں ہے جو ہم ہر برائی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے ہیں۔

ہمیں میڈیا کے ذریعے اچھائیوں کا پرچار کرنا چاہیے، ہم اپنا چینل ضرور شروع کریں گے ان شاء اللہ اور اس چینل کے ذریعے صحیح اسلامی تشخص سے روشناس کرائیں گے ٹھیک ہے نا اسید!''

''ہاں۔۔۔۔کیا۔۔۔۔؟'' اسید نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا آپ میری بات نہیں سن رہے تھے۔۔۔۔ کہاں تھا آپ کا دھیان۔۔۔۔؟''

''میرا دھیان۔۔۔۔''

اسید نے سوچا تمہیں کیا خبر آمنہ! کہ میں تمہیں سوچ رہا تھا۔۔۔کیا میں تمہارے بغیر کسی اور کے سنگ زندگی کو اس طرح گزار سکوں گا جیسا کہ تمہارے ساتھ۔۔۔اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ ان کے درمیان کوئی بہت زیادہ محبت کے ڈائیلاگ نہیں بولے گئے تھے اس نے کبھی بھی آمنہ سے نہیں کہا تھا کہ I Love You! بس ایک بار دل کی بات کہہ کر وہ مطمئن ہو گیا تھا اور شاید آمنہ بھی۔ پھر بھی کیسا گہرا تعلق اور رشتہ بن گیا تھا اس کے اور آمنہ کے بیچ کہ اس تعلق کو ٹوٹنے کا تصور ہی جسے اس کا دل بھینچ رہا تھا اور پورے وجود میں گداز بھر گیا تھا شاید اس وقت کسی دوست کا کندھا نصیب ہوتا تو وہ رو پڑتا۔

"کیا بات ہے اسید بھائی! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں سب خیریت تو ہے نا۔۔۔؟"

"ہاں سب خیریت ہے بس یونہی۔۔۔" اس نے آمنہ کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔

"یہ دھماکہ جو ہوا ہے ابھی مین مارکیٹ میں کیا خودکش حملہ تھا۔۔۔" صدف اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"نہیں مجھے کوئی خاص تفصیل معلوم نہیں چاچا خدا بخش نے بس دھماکے کا ہی بتایا تھا۔۔۔"

"غالباً کوئی جانی نقصان نہیں ہوا ورنہ ورنہ ضرور بتاتے اور اگر جانی نقصان ہو بھی جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا اب تو انسانی زندگی چیونٹی سے بھی کم قیمت ہو کر رہ گئی ہے دس مر رہے ہیں آٹھ مر رہے ہیں پچاس مر گئے ہیں خبر بتا کر اگلے ہی لمحے رقص و موسیقی کے پروگرام شروع ہو جاتے ہیں۔۔۔" عروج کا لہجہ جلا بھنا تھا۔

"ہر روز زی ٹی وی پر خبر آتی ہے کہ سیکورٹی فورسز نے اتنے عسکریت پسند مار ڈالے۔۔۔کیا یہ لوگ انسان نہیں تھے؟

کیا ان سے وابستہ گھر ان کے لیے خواب نہیں تھے۔۔۔؟

کیا ان سے امیدیں وابستہ نہیں تھیں۔۔۔؟

کیا یہ محبتوں کے حصار میں گھرے ہوئے نہیں ہوں گے۔۔۔؟

اور کیا ان کی محبتوں کی۔۔۔ان کے سہاروں کی۔۔۔کسی کو ضرورت نہیں ہوگی۔۔۔؟

کیا ان کے چلے جانے سے گھر ویران نہیں ہوئے ہوں گے۔۔۔؟

کیا یہ کوڑا کرکٹ تھے بیکار۔۔۔؟"

"ریلیکس عروج۔۔۔" آمنہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ آج تو تم بالکل عاشی کی طرح جذباتی ہو رہی ہو۔

"کیا مجھے جذباتی نہیں ہونا چاہیے آمنہ! بلکہ ساری قوم کو جذباتی ہونا چاہیے بہت ہو گیا ہے آمنہ! بہت زیادہ۔۔۔اب یہ سب ختم ہو جانا چاہیے جانتی ہو نا کہ کتنے لاکھوں گھروں سے قبائلی بے گھر ہوئے بیٹھے ہیں کتنے بے گناہ مارے گئے ہیں۔ حامد کہتا ہے کہ یہ شدت پسند امریکہ کے ایما پر لڑ رہے ہیں۔ بکنے والے کتنے لوگ ہوں گے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بیت اللہ محسود کے اپنے قبیلے کے لوگ اس کے ساتھ نہیں ہیں۔ دلاور نے بھی اس کی تصدیق کی ہے اگر ہماری فوج ان سے لڑنا چھوڑ دے تو مجھے یقین ہے کہ قبائلی خود ان خریدے گئے لوگوں کے خلاف فیصلہ کر لیں گے۔۔۔"

"یہ اتنی بڑی سازش ہے پاکستان کے خلاف، عروج! کہ صرف فوجیں ہٹا لینا اس کا حل نہیں ہے اس سے تو مل بیٹھ کے بہت سمجھ کر بہت حکمت عملی سے ساتھ نمٹنا ہوگا چاہے امریکہ کی سی آئی اے ہو، یہودیوں کی موساد، یا انڈیا کی را، افغانستان کی خاد۔"

"ہمیں بیک وقت ان کے منصوبوں سے جنگ کرنی ہے، خود کو بچانا ہے پہلے ایران امریکہ کے ٹارگٹ پر تھا لیکن اب پہلے پاکستان ہے اور پھر ایران۔۔۔" صدف نے آہستگی سے کہا اور پھر خاموش ہو کر اسید کی طرف دیکھنے لگی جو سیل فون پر مصروف تھا شاید فیصل کی کال تھی۔

"او کے تھینک گاڈ۔۔۔!" اس نے آف کر کے صدف کی طرف دیکھا۔

"کوئی جانی نقصان نہیں ہوا ایک شاپ میں دھماکہ ہوا ہے لیکن وہ بند تھی شاید سگریٹ میں کچھ تھا۔ مجھے تو لگتا ہے اسید! پاکستان میں جتنے بھی دھماکے اور خودکش حملے

ہو رہے ہیں یہ سب کرنے والے ''را'' اور ''موساد'' کے ایجنٹ ہیں جو مسلمانوں کے بھیس میں حملے کر رہے ہیں۔۔۔'' صدف نے تبصرہ کیا۔

''ہاں شاید۔۔۔'' اسید نے اس کی تائید کی۔

''چائے پئیں گے آپ۔۔۔!'' آمنہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''ایسی گفتگو شروع ہوئی کہ خیال ہی نہیں رہا۔۔۔''

''نہیں۔۔۔'' اسید نے ایک بار پھر بغور اسے دیکھا۔

''دادا جان! آپ کو یاد کر رہے تھے بہت، کسی دن وقت ملے تو مل آئیے گا۔۔۔'' صدف کو اچانک یاد آیا۔

''میں گیا تھا آج، بلکہ ابھی ادھر سے ہی آ رہا ہوں۔۔۔''

اسید کھڑا ہو گیا تب ہی اس کا موبائل بج اٹھا۔

''جی کیا۔۔۔ کل سے۔۔۔ لیکن وہ آفس میں تو نہیں آیا اور میرے خیال سے کل وہ نو بجے ہی چلا گیا تھا، میں ابھی اسے فون کرنے لگا ہوں۔ میرا خیال تھا شاید طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔'' اس نے دوسری طرف سے کچھ سنا۔

''اس کا فون آف ہے پلیز! آپ پریشان نہ ہوں میں دیکھتا ہوں۔۔۔''

''کیا ہوا۔۔۔؟'' اس نے فون آف کیا تو تینوں نے بیک وقت پوچھا۔

''حامد کل گھر نہیں گیا، ذرا چاچا کو بلوانا۔۔۔'' صدف نے گھنٹی بجائی۔

چند لمحوں بعد ہی چاچا دروازے میں کھڑے تھے۔

''چاچا! حامد کچھ بتا کر گیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔۔۔؟''

''نہیں، میں ان کے پاس ہی کھڑا تھا جب کوئی فون آیا تھا انہوں نے کہا تھا کہ اسید صاحب کو بتا دینا میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔۔۔''

اسید کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی تھی۔

''کیا وہ کسی خاص موضوع پر کام کر رہا تھا۔ گردوں کی چوری کے حوالے سے تو اس کے آرٹیکل مکمل ہو گئے تھے کہہ رہا تھا کہ اس فرائی ڈے کو پہلا آرٹیکل لگے گا۔''

''ہاں وہ فائل تو میرے ٹیبل پر پڑی ہے۔۔۔''

''کیا آپ کے خیال میں کوئی نہیں چاہتا کہ یہ مضمون چھپیں۔۔۔؟''

''میرا خیال ہے نہیں۔۔۔'' اسید گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کل رات سے لے کر اب تک یہ تیسرا شاک تھا جو لگا تھا حامد پتا نہیں کہاں تھا کہیں۔۔۔''

''اوہ نہیں۔۔۔'' اس کے لبوں سے نکلا۔

''کتنے سارے لوگ تھے ملک دشمن، جن کو اپنا دشمن بنا چکے تھے، کرپٹ بے ضمیر لوگ۔۔۔''

ابھی چند دن پہلے ہی تو اسید نے حامد کو ایک کمپنی کے متعلق بتایا تھا بظاہر یہ کمپنی یہاں سے چمڑے کا سامان باہر بھجواتی تھی لیکن اس گروپ کے سب لوگ ''موساد'' کے ایجنٹ تھے ملکی اور غیر ملکی۔ چھوٹی سی عمارت میں اس نے دفتر قائم کیا تھا اور کام کرنے والے بھی دس گیارہ افراد سے زیادہ نہ تھے، اسید ان کے عزائم سے آگاہ ہونا چاہتا تھا وہ سب یہاں کیا سازش کر رہے تھے اور اس سلسلے میں اس نے حامد سے تفصیلی بات کی ہے وہ خود معلومات اکٹھی کر رہا تھا گو ابھی اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی لیکن امید تھی کہ جلد ہی کچھ انکشاف ہوں گے ممکن ہے حامد اپنا کام مکمل کرنے کے بعد ان کی طرف متوجہ ہو گیا ہو حالانکہ اسے مجھ سے مشورہ کرنا چاہیے تھا لیکن حامد بہت انرجیٹک اور پرجوش تھا وہ اس ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا، کچھ بہت زیادہ۔۔۔ اس کے والد 71 کی جنگ میں مشرقی پاکستان کے محاذ پر شہید ہو گئے تھے اس معاملے میں وہ بہت حساس تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر پاکستان کو ان سازشوں سے بچانے کی کوشش کرتا رہے گا جن کی وجہ سے پہلے پاکستان دو ٹکڑے ہوا تھا۔ سی آئی اے، را، خاد، موساد، سب کی سرگرمیوں پر اس کی گہری نظر ہوتی تھی۔

''اب آپ کیا کریں گے اسید۔۔۔!'' عروج نے پوچھا۔

''دیکھتا ہوں۔۔۔'' اسید فہد کا نمبر ملاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

''حامد! کیسا محسوس کر رہے ہو تم۔۔۔!'' اسید نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو حامد تکلیف کے باوجود مسکرایا۔

”بہتر ہوں۔۔۔“

”یار! تم نے کیا کیا۔۔۔ کم از کم مجھ سے تو مشورہ کر لیتے۔۔۔“ اسید نے سٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں نے سوچا تھا کہ میں فارغ ہوں اس سلسلے میں کچھ تحقیق کر لوں گا۔ تمہارا شک صحیح تھا وہ لوگ موساد سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے چوکیدار عبدالغنی سے دوستی کر لی تھی اور اس نے مجھے فون کیا تھا کہ اس وقت کچھ غیر ملکی آئے ہوئے ہیں اور میٹنگ ہو رہی ہے۔۔۔“

”عبدالغنی نے تمہیں چیٹ کیا۔۔۔؟“ اسید نے پوچھا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا میں جب وہاں پہنچا تو عبدالغنی وہاں نہیں تھا میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ تینوں پیچھے سے آئے اور انہوں مجھے پکڑ لیا۔۔۔“

اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن صرف ہونٹ پھیلا کر رہ گیا۔ ہونٹ سوجے ہوئے اور زخمی تھے تب ہی دستک دے کر سسٹر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں انجکشن کا سامان پڑا تھا۔ اسید اٹھ کر پیچھے دیوار کے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھ گیا تین دن سے حامد یہاں اس ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھا اور آج پہلی بار اس نے اتنی بات کی تھی دو دن تو وہ مکمل بے ہوشی میں تھا۔ ڈاکٹر یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ چار دن سے وہ اس کے لیے بے حد پریشان تھے۔ پولیس کی مدد لی گئی تھی لیکن کہیں سے کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ خود اسید نے کہاں کہاں نہیں اسے ڈھونڈا تھا۔ حامد کی والدہ، دادی، چچا، بہن، بھائی سب ہی بہت پریشان تھے اور اسید کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ کہاں سے اسے ڈھونڈ لائے بار بار اس کا دھیان جعفر اینڈ سسٹر کی طرف جاتا تھا۔

ڈاکٹر فہد کے ساتھ ان چار دنوں میں کتنے ہی چکر اس نے جعفر اینڈ سسٹر کے پاس کاٹے تھے لیکن کہیں سے کئی سراغ نہ مل سکا تھا اس روز بھی رات ایک بجے ڈاکٹر فہد کے ساتھ وہ نہ جانے کہاں کہاں سے چکر لگا کر گھر پہنچے تھے۔ فہد کو اب اس نے وہاں ہی روک لیا تھا۔

”آج ادھر ہی سو جاؤ فہد! اب اس وقت کیا کرو گے گھر جا کر۔۔۔؟“

”ہاں دوست! وہاں کون میرے انتظار میں بیٹھا ہے، اپنا کیا ہے جہاں تھک گئے وہیں ٹھکانہ بنا کر بیٹھ گئے۔۔۔“

لہجے کی افسردگی نے ایک لمحہ کے لیے اسید کو تڑپایا۔ زندگی کبھی کبھی انسان سے کتنے سنگین مذاق کرتی ہے اور فہد کے ساتھ جو ہوا تھا وہ انتہائی سنگین تھا۔ لمحوں میں ہنستے بستے لوگ خاک تلے جا سوئے تھے۔ وہ فہد کے متعلق ان دنوں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا بلکہ اس نے پھوپھی جان سے بات کی تھی کہ فہد کے لیے کوئی بہت ہی اچھی لڑکی دیکھیں لیکن فہد کے ساتھ بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ حامد کی گمشدگی نے پورے گھر میں افسردگی کی لہر پھیلا دی تھی دادی جان نے سعید کے کپڑے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیئے تھے۔

”جانے بچہ کس حال میں ہوگا اللہ اس کی ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔ خیر کی خبر ملے اس کی۔۔۔“

اسید کے حوالے سے حامد، فیصل، دلاور سب ہی اس گھر میں جانے پہچانے جاتے تھے اور سب کے لیے دادا جان اور دادی یکساں محبت رکھتے تھے۔ فہد کوٹ الماری میں لٹکا رہا تھا جب سعید نے بیٹھک میں قدم رکھا۔

”ارے تم لوگ جاگ رہے ہوں ابھی تک۔۔۔“

اسید نے جوتے چارپائی کے نیچے کھسکاتے ہوئے اسکی طرف دیکھا۔ بیٹھک کی چابی تو اس کے پاس ہوتی تھی اگر اسے دیر ہو جاتی تھی تو وہ دروازہ کھول کر اندر آ کر سو جاتا تھا۔۔۔

”ہاں۔۔۔ کچھ پتا چلا۔۔۔؟“

”نہیں کچھ نہیں۔۔۔“ اسید کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”شاید بہت سارے لاپتہ لوگوں کی طرح حامد کا بھی کبھی پتا نہ چلے۔۔۔“

”مایوسی اچھی نہیں، اسید۔۔۔! اللہ بہتر کرے گا۔۔۔“

ڈاکٹر فہد بھی بیڈ پر بیٹھ چکا تھا۔

”کھانا لاؤں آپ کے لیے۔۔۔؟“

”نہیں یار! رہنے دو خواہ مخواہ تکلیف نہ کرو۔۔۔“

ڈاکٹر فہد نے منع کیا تو اسید نے کارنس پر پڑی الیکٹرک کیتل کی طرف دیکھا۔

"ذرا کیتل میں پانی ڈال کر رکھ دو میں چائے بناؤں گا۔ ہاٹ پاٹ میں روٹیاں اور سالن پڑا ہے ہمارے سگھڑ بھائیوں نے سب ٹرے میں لگا کر رکھا ہوا ہے گلاس پلیٹوں سمیت۔۔۔۔ ماشاء اللہ! ایسے سگھڑ اور سلیقہ مند بھائی خدا سب کو دے جس گھر جائیں گے۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ بلکہ جس گھر سے دلہن لائیں گے ان دلہنوں کے تو مقدر سنور جائیں گے۔۔۔۔"

"وہ شاید ماحول کی اداسی کم کرنا چاہتا تھا۔ اسید کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہو کر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

"میں ایک منٹ میں کھانا لاتا ہوں اگر سالن ٹھنڈا ہو گیا ہوا تو گرم کرلوں گا بعد میں چائے بھی پیتے ہیں۔" سعید نے چٹکی بجائی۔

"اور احد بھی بالکل ایسا تھا سعید جیسا۔۔۔۔ ہر لمحہ ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔" ڈاکٹر فہد کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔ جیسے وہ خود سے ہی مخاطب ہوا۔ سعید جاتے جاتے رک گیا شاید اس نے فہد کی بات سن لی تھی اور شاید وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا جب اسید کا موبائل بجنے لگا تھا۔

"اسید صاحب۔۔۔۔!" دوسری طرف دلاور تھا۔

"ابھی چند لمحے پہلے باہر احاطے میں کچھ گرنے کی آواز آئی۔۔۔۔ کوئی بھاری سی چیز میں اور چاچا فوراً ٹارچ لے کر باہر نکلے تو مائی گاڈ کسی نے حامد کو اندر پھینکا تھا۔۔۔۔ وہ زخمی ہے، بے ہوش ہے، نبض بہت آہستہ چل رہی ہے۔"

"ہم آ رہے ہیں۔۔۔۔" اسید نے فون بند کر کے جلدی جلدی ساری بات بتائی اور پھر انہوں نے اخبار کے دفتر پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی آج کل دلاور کے ساتھ چاچا خدا بخش بھی اخبار کے دفتر میں ہی رہتے تھے کہ ان کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

ڈاکٹر فہد کے ساتھ ہونے کی وجہ سے انہیں ہاسپٹل میں زیادہ پرابلمز کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ حامد پر کسی نے بری طرح سے تشدد کیا تھا۔ دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں دو جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں، سر کے پچھلے حصے میں گہرے زخم تھے، خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا، بائیں ہاتھ

بھی بری طرح سے کچلا گیا تھا، لیکن ہڈی محفوظ تھی۔ بازو، چہرہ، جسم کے سارے ہی حصوں پر کوئی نہ کوئی زخم تھا۔ دو دن اور رات وہ سب وہاں ہی رہے تھے ایک پل کے لیے بھی کوئی وہاں سے نہیں ہٹا تھا۔

فیصل، دلاور، فہد، اسید اور حامد کے چچا، چھوٹا بھائی، ، خواتین کو وہ زبردستی گھر بھجوا دیا کرتے تھے۔ آج صبح ہی اسے ہوش آیا تھا اور اس نے نامعلوم افراد کے خلاف ہی اپنا بیان لکھوایا تھا۔۔۔۔

"میں نہیں جانتا وہ کون تھے۔۔۔۔؟ ہم جیسے حقائق لکھنے والوں کے تو سو دشمن اور جن ہوتے ہیں۔۔۔۔"

پولیس اپنی ضابطے کی کارروائی کر کے چلی گئی تھی۔ ابھی ابھی اس کے چچا بھی کچھ دیر کے لیے گھر گئے تھے اور صبح دس بجے کے بعد دلاور فیصل اور سعید بھی چلے گئے تھے۔ فہد راؤنڈ پہ تھا تو اسید نے حامد سے اصل حقیقت جاننے کی کوشش کی تھی۔

اس کا شک صحیح تھا۔ اسے آئی ایس ایف کے کسی ذمہ دار بندے سے بات کرنا چاہیے لیکن کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر یہ کیسے ممکن ہے اور پھر ممکن ہے آئی ایس ایف کی لسٹ میں جعفر اینڈ سن کی سرگرمیاں ہوں۔ بہر حال کچھ نہ کچھ تو کریں گے ہی ہم۔۔۔۔ یوں آسانی کے ساتھ ان شیطانوں کو اپنے ملک کے خلاف کچھ نہیں کرنے دیں گے۔

سسٹر انجکشن لگا کر اور میڈیسن دے کر چلی گئی تو اسید پھر اٹھ کر سٹول پر آ بیٹھا۔

"تو اب کیا خیال ہے حامد! تمہارے چچا کہہ رہے تھے تم کچھ دنوں کے لیے انگلینڈ چلے جاؤ اپنے ماموں کے پاس۔ وہ لوگ جنہوں نے پہلے ایسا کیا ہے وہ پھر بھی کچھ تو بھی۔۔۔۔"

"کچھ دنوں کے لیے نہیں اسید! بلکہ ہمیشہ کے لیے مجھے وہاں بھیجنا چاہتے ہیں ماموں نے ایک دو بار مجھے سپانسر بھی کیا لیکن میں نہیں جانا چاہتا تھا وہاں۔۔۔۔ وہاں دوسرے درجے کا شہری بن کر رہنے کے بجائے میں اپنے ملک میں رہنا پسند کرتا ہوں۔۔۔۔ لعنت ہے ایسی شہریت پر جس میں اپنی عزت نفس قربان کرنا پڑے۔"

"لیکن تب اور بات تھی حامد! اور اب تمہارے چچا نے مجھے کہا ہے کہ تمہیں

سمجھاؤں تمہارے گھر والے بہت خوفزدہ ہیں وہ۔۔۔۔"

"جانتا ہوں۔۔۔۔" حامد نے اس کی بات کاٹ دی۔

"لیکن میں موت سے نہیں ڈرتا۔۔۔۔موت تو اپنے مقرر وقت پر آنی ہے اور وہ انگلینڈ بھی آسکتی ہے۔اگر وقت مقرر ہو گیا ہے تو میں چند سانپوں اور بھیڑیوں کے خوف سے یہ ملک نہیں چھوڑ سکتا اسید! چچا کہتے ہیں ہم سر پھرے ہیں، پاگل ہیں اور ہمارے چند لفظ کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، ساٹھ سال سے کوئی نہ کوئی ہم جیسے سر پھرے قلمی جہاد کرتے آرہے ہیں لیکن کچھ نہیں بگڑا ان کا۔۔۔۔" میں نے چچا سے کہا تھا۔

حامد کی آنکھیں چمکنے لگیں تھیں میں نے ان سے کہا

"پاکستان بنانے والے بھی ہم جیسے سر پھرے ہی تھے اور اب اسے قائم رکھنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے والے ہم جیسے سر پھرے ہی ہوں گے۔۔۔۔"

اسید نے عقیدت سے اسے دیکھا۔

"اوکے۔۔۔۔اس موضوع پر پھر بات ہوگی ابھی تم آرام کرو۔"

"تمہاری آنکھیں بند ہو رہی ہے۔۔۔۔"

"ہاں شاید نیند کا اثر ہے میڈیسن میں۔۔۔۔" حامد نے آنکھیں بند کر لیں اسید کچھ دیر تو وہاں ہی بیٹھا رہا ابھی حامد نے زیادہ تفصیل سے بات نہیں کی تھی کہ وہ لوگ کیا چاہتے تھے کون تھے؟ کیا حامد نے انہیں دیکھا تھا؟ اور کیا وہ انہیں پہچان سکتا ہے؟ یہ ساری باتیں ابھی اسے حامد سے پوچھنا تھیں لیکن حامد کے لیے ریسٹ بھی ضروری تھا۔خدا نے حامد کو زندگی دی تھی تو یہ ساری باتیں بعد میں بھی پوچھی جا سکتی تھیں۔اس نے ایک نظر حامد پر ڈالی وہ سو چکا تھا اگرچہ فہد اور سعید نے خون بھی دیا تھا اسے لیکن ابھی بھی اس کی رنگت پر زردیاں گھلی تھیں۔

"اللہ نے اسے کتنے مخلص اور سچے کارکن عطا کیے تھے۔۔۔۔" آفتاب حسین نے کہا تھا۔

"جب آدمی کسی کام کا آغاز کرتا ہے نیک نیتی کے ساتھ تو خود بخود نہ صرف یہ کہ راستے ہموار ہو جاتے ہیں بلکہ اچھے اور مخلص رفیق کار بھی اس میں شامل ہوتے چلے جاتے

ہیں۔۔۔۔"

اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔چار بج رہے تھے ڈاکٹر فہد یقیناً فارغ ہو چکا ہو گا اور اسے فہد سے یہ سب ڈسکس کرنا تھا اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور ڈاکٹر روم کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

"میں رسائی نارسائی کے کرب اور خوشی سے قطعی واقف نہیں ہوں لیکن لگتا ہے جیسے نارسائی کا کرب دھیرے دھیرے میرے دل میں اپنے پنجے گاڑ رہا تھا میں اتنا جانتا ہوں کہ تم سے پہلے اور کوئی نہیں تمہیں چاہے جانا قبر تک جیسے کسی خوبصورتی کا مزید خوبصورت ہو جانا ہے۔

آمنہ! تمہاری محبت کی طلب اور خلوص کی لپک مجھے رلا دیتی ہے میں کیا کروں، کیسے دیکھوں گا تمہیں نارسائی کا عذاب بھگتتے کاش میں تمہارے اتنا قریب ہو جاتا کہ مٹ جاتا اور تمہاری تمام چاہتوں اور خوبصورتیوں میں ایسا کھو جاتا کہ خود کو بھی نہ ڈھونڈ پاتا۔میں تمہاری مسکراہٹ کی صبح میں اپنے سورج کو تلاشتا اور تمہاری مہک کے سحر میں اپنی درشیاں باندھ دیتا۔کاش۔۔۔۔لیکن۔۔۔۔" اس نے اپنی بوجھل آنکھیں اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھی آمنہ کو دیکھا۔

"کیا بات ہے اسید۔۔۔۔! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔۔۔۔اور آپ نے کیوں بلایا ہے مجھے۔۔۔۔؟"

"آمنہ! میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ کل رات میں نے تو جو فیصلہ کیا ہے وہ تمہارے لیے کتنا تکلیف دہ ہو گا تم شاید۔۔۔۔" اسید نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"ہاں آمنہ! مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔۔۔۔" اس نے آہستگی سے کہا اور نظریں آمنہ کے چہرے سے ہٹا لیں۔

"کئی دن تو حامد کی پریشانی کی نذر ہو گئے تھے وہ بھی سب کچھ بھول گیا تھا اور رات پھر دادی جان نے آمنہ کے گھر جانے کا ذکر چھیڑ دیا تھا اور وہ کتنی راتیں جاگ کر کتنی ہی کشمکش کے بعد فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے احمد کے دادا کا مان رکھنا ہے وہ اس بوڑھے

شخص کو انکار نہیں کر سکتا تھا جو اسے اپنے احمد کی طرح سمجھتا تھا۔ کیا احمد انکار کر سکتا تھا۔ اس فیصلے کی اذیت اس کی رگوں کو کاٹ رہی تھی۔ پھر بھی اس نے عاشی سے کہہ دیا تھا کہ وہ دادی جان کو بتا دے کہ پھپھو کو آمنہ کے بجائے صدف کے گھر بھیجیں اور اس سے عاشی حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

"مگر آمنہ۔۔۔۔ آمنہ تو۔۔۔۔" اور عاشی اپنی بات مکمل نہ کر سکی تھی کہ وہ عاشی کو اپنا فیصلہ سنا کر آفس آ گیا تھا اور اب آمنہ کو اپنے آفس میں بلا کر وہ جیسے اذیت کی انتہا پر تھا کس طرح کہے وہ آمنہ سے۔۔۔۔

"اسید! پلیز میں پریشان ہو رہی ہوں۔۔۔۔"

"آمنہ۔۔۔۔!" بالآخر اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو احمد کے دادا جان نے اس سے کہا تھا۔

"تو اب۔۔۔۔" آمنہ کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی اور اسکے لبوں سے صرف یہی نکل سکا تھا۔

"آمنہ۔۔۔۔!" اس کی آواز بے حد بھاری ہو رہی تھی۔

"کہیں اور مہک سکو تو ضرور مہکنا، کہیں اور مسند نشین ہو جاؤ تو ضرور ہو جانا، میری محبت۔۔۔۔" اس کی آواز جیسے گھٹ گئی تھی اس نے یکدم نظریں ہی نہیں چہرہ بھی جھکا لیا تھا وہ آمنہ کے چہرے پر بکھرتے ہوئے نارسائی کے کرب کو کیسے دیکھتا۔ تب ہی دروازہ زوردار آواز سے کھلا تھا اور صدف اندر داخل ہوئی۔

"تم۔۔۔۔ اسید! تم کیا سمجھتے ہو خود کو۔۔۔۔؟" اس نے آمنہ کی طرف نہیں دیکھا تھا اور اسید کو دیکھ رہی تھی۔

"خدائی فوجدار۔۔۔۔! اگر دادا نے تم سے کوئی بات کی تھی تو تم مجھ سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ خود ہی فیصلہ کر لیا مجھ سے پوچھے بنا۔ تم نے مجھ سے پوچھا کہ میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنا بھی چاہتی ہوں یا نہیں۔۔۔۔ تم مجھ پر احسان کرنے چلے تھے۔۔۔۔ ہمدردی کا بخار چڑھا تھا تمہیں۔۔۔۔ کیا میں اندھی، لولی لنگڑی ہوں، بدصورت ہوں کہ تمہارے علاوہ مجھے کوئی قبول نہیں کرے گا اور تم نے سوچا کہ تم اپنی محبت کی قربانی دے

دو۔۔۔۔"

اسید حیرت سے منہ اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا میں نہیں جانتی کہ تم اور آمنہ۔۔۔۔ مائی گاڈ۔۔۔۔!

اگر عاشی مجھے فون نہ کرتی تو تم نے تو چار زندگیاں تباہ کر دی تھیں۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن آج میں اس لیے آفس نہیں آئی تھی کہ شام کو کچھ لوگ مجھے دیکھنے آ رہے تھے۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اگرچہ میرے لیے احمد کے بعد ابھی بہت مشکل ہے لیکن میں اماں ابا کو بھی اب مزید پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اسید! میں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتی تھی۔۔۔۔"

اسید کے اندر جیسے یکدم چراغاں ہو گیا تھا اس نے کسی قدر سنبھلتے ہوئے پوچھا۔

"کون لوگ ہیں۔۔۔۔؟"

"پتا نہیں میں نے نہیں پوچھا۔۔۔۔" اس نے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

"شاید دادا جان میری طرف سے مایوس ہو گئے ہوں گے۔۔۔۔" اسید نے سوچا حالانکہ میں تو حامد کی وجہ سے پریشان رہا۔

"کیا تمہیں پوچھنا نہیں چاہیے تھا۔۔۔۔؟"

"دادا جان نے اسے اوکے کر دیا ہے اور وہ میرے لیے غلط نہیں کر سکتے، ان کی اجازت کے بعد ہی وہ آ رہے ہیں۔۔۔۔" صدف سنجیدہ تھی۔

"ہائے ہائے صدف جی! غضب ہو جائے گا ابھی فون کر کے منع کریں، دادا جان کو کہیں ان لوگوں کو مت بلائیں۔۔۔۔" سعید لپکتا ہوا اندر آیا۔

"شام کو تو پھوپھو آ رہی ہیں آپ کے گھر۔۔۔۔"

"لیکن وہ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔" اسید کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"کیا آپ نے نہیں کہا تھا انہیں۔۔۔۔ کہ وہ شام کو صدف کے گھر چلی جائیں۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔ لیکن اب۔۔۔۔" اسید نے پریشان ہو کر باری باری صدف اور آمنہ کی طرف دیکھا۔

"اب کچھ نہیں ہوسکتا۔۔۔۔" سعید اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں دوٹوکرے مٹھائی کے آرڈر بھی دے آیا ہوں جو پھوپھو نے دونوں گھروں میں لے کر جانے ہیں۔

"دونوں گھروں میں۔۔۔۔؟" اسید الجھا ہوا سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں ایک آمنہ کے گھر اور ایک صدف کے گھر۔۔۔۔"

"کیا بک رہے ہو۔۔۔۔؟" اب کے اسید کو اس کا یہ مذاق ناگوار گزرا۔

"بک نہیں رہا۔۔۔۔ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔۔۔۔ ہماری پھپھو جان اپنے منہ بولے بیٹے ڈاکٹر فہد کا رشتہ لے کر جا رہی ہیں صدف کے گھر کیوں صدف بی بی! آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟ ماشاء اللہ ہمارے ڈاکٹر فہد لاکھوں میں ایک ہیں۔۔۔۔ سگھڑ۔۔۔۔ سلیقہ مند۔۔۔۔ مخلص۔۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر عشق کریں گے نہ ساس کا جھگڑا اور نند کا بکھیڑا۔۔۔۔"

صدف اب مسکرا رہی تھی۔

"سعید تم بھی بس۔۔۔۔"

"کیوں بھائی! میں نے کیا غلط کہا۔۔۔۔؟"

سعید نے اسید کی طرف دیکھا جو بے حد ریلیکس سا ہو کر اسے سن رہا تھا۔

"ویسے داد دیں مجھے! جب عاشی نے مجھے بتایا بے چاری دھواں دھار رو رہی تھی اور نہ جانے کتنی سہیلیوں میں شور مچا چکی تھی کہ اس کی آئیڈیل افسانہ نگار اسکی بھابھی بن رہی ہیں اس کے افسانے پڑھنے کے لیے اسے پیسے نہیں خرچنے پڑیں گے ادھر اس نے افسانہ لکھا ادھر اس نے چرا کر پڑھ لیا۔۔۔۔"

"تم صدف کو کہاں ملے۔۔۔۔؟" اسید نے پوچھا۔

"جناب مابدولت مع عاشی کے ان کے دولت خانہ پر گئے تھے وہاں عاشی نے ان کے گوش گزار کیا سب اور ہم نے فوراً ہی ڈاکٹر فہد کی سفارش کر دی۔ بیچارے کب سے راتوں کو تارے گنتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ لیکن حال دل کہنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ تو وہاں سے آفس بھی محترمہ ہماری ہی گاڑی میں آئی ہیں، شکر کریں بروقت پہنچ گئے

ورنہ۔۔۔۔ ارے آمنہ جی آپ کہاں جا رہی ہیں۔۔۔۔؟"

اس نے یکدم باہر جاتی ہوئی آمنہ کو دیکھا۔

"جائیے سر! ان کے پیچھے اور روٹھے ہوؤں کو منا لیجیے۔۔۔۔"

اسید بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

"اگر مدد کی ضرورت ہو تو بلا لیجیے گا۔۔۔۔" سعید نے ہانک لگائی اسید نے باہر نکلتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"کیا آپ ہمارے ساتھ چائے کا ایک کپ پینا پسند کریں گے مسٹر اسید۔۔۔۔!"

اسید نے چونک کر اپنے دائیں طرف دیکھا۔

یہ لڑکی ابھی چند لمحے پہلے ہی اس کے دائیں طرف آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ بلیو جینز ریڈ سوٹ پہنے جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ شکل وصورت سے غیر ملکی نظر آنے والی اس لڑکی نے بڑی شائستہ اردو میں بات کی تھی۔ لہجے سے بھی وہ غیر ملکی نہیں لگ رہی تھی۔ اسید ابھی کچھ دیر پہلے یہاں اسٹاپ پر آ کر کھڑا ہوا تھا صبح سعید نے اسے ڈراپ کیا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر فہد کی طرف جا رہا تھا آج ان کا پروگرام شادی کی شاپنگ کرنے کا تھا۔ اس لیے وہ کچھ جلدی ہی دفتر سے نکل آیا تھا۔ گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔۔۔۔ ایک نہیں تین تین شادیوں کی تیاریاں۔۔۔۔ ڈاکٹر فہد کی شادی کی بھی ساری تیاری پھپھو اور عاشی نے ہی کرنی تھی۔ سو متفقہ رائے سے سعید کی شادی عید کے فوراً بعد ہونا طے پائی تا کہ تینوں کی شادیوں کی تیاری کی جا سکے فہد کی بری کا سارا سامان خریدنا تھا۔ اسید کے لیے تو بہرحال کچھ کچھ تیاری دادی اماں نے کر ہی لی تھی۔ فہد کا ہاسپٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ طے پایا تھا کہ آج وہ فارغ ہو کر فہد کی طرف جائے گا اور پھر وہ سعید کو بھی لے لیں گے۔

"تو مسٹر اسید! کیا خیال ہے چلیں۔۔۔۔؟"

اسید نے چونک کر بغور اسے دیکھا۔

اس کا لہجہ نرم تھا اس کی نیلی آنکھوں میں بلا کی سرد مہری تھی وہ اسے دعوت نہیں بلکہ حکم دیتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ سٹاپ کے ذرا فاصلے پر ایک بوڑھا اور بچہ تھا اور ذرا فاصلے پر دو مرد کھڑے تھے اسید کی نظریں ان سے ملیں انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ یعنی دونوں حضرات اس خاتون کے ساتھ تھے اور مطلب یہ تھا کہ انکار کی گنجائش نہیں کیوں کہ ایک شخص نے اسے پسٹل کی جھلک دکھا دی تھی۔

"لیکن میڈیم! میں تو آپ کو نہیں جانتا۔۔۔" اسید نے نظریں ان کے چہرے سے ہٹا لیں تھیں۔

"ہم تو آپ کو جانتے ہیں نا پلیز چلیے! زیادہ وقت نہیں لیں گے آپ کا۔۔۔"

اس نے درخت کے پاس کھڑی سفید کرولا کار کی طرف اشارہ کیا۔ اسید نے خاموشی سے قدم آگے بڑھا دیئے۔

"شاید مجھے بھی حامد کی طرح تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا" اس نے سوچا۔

پچھلے دنوں اس نے جعفر اینڈ سنز کی طرح دو اور نام نہاد کمپنیوں کے متعلق پتا چلایا تھا اور اس سلسلے میں فہد کا دوست جس کا بھائی پولیس میں تھا انہیں اطلاعات فراہم کرتا رہا تھا اور اسید بہت جلد ہی انہیں منظر عام پر لانا چاہ رہا تھا۔

لیکن ابھی بہت سے شواہد کا علم نہیں ہو سکا تھا۔

"یار! ایک اخبار نویس کو ایک اچھا سراغ رساں بھی ہونا چاہیے۔۔۔" رات اس نے فہد سے کہا تھا۔

"کیا تم نہیں ہو۔۔۔؟"

"اس طرح نہیں ہونا چاہیے ۔۔۔ میرے مقابلے میں حامد اچھا ہے۔۔۔ شاید اسلئے کہ اس نے دو سال تک ایک بڑے اخبار کے کرائم رپورٹر کے طور پر کام کیا ہے۔"

"پلیز!" خاتون نے کار کا دروازہ کھولا تھا اور اسے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اس دوران وہ دونوں مرد بھی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ چکے تھے اس کا اندازہ صحیح تھا وہ اس خاتون کے ہی ساتھی تھے۔

"میں اس طرح لے جانے کا مقصد پوچھ سکتا ہوں۔۔۔؟"

اس نے خاتون سے پوچھا۔

"دوستانہ ماحول میں ایک کپ چائے یا کافی اور اچھی سی گفتگو۔۔۔"

لڑکی نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا اور پھر سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگی

کچھ دیر بعد وہ ایک اچھے کافی ہاؤس کے ایک کیبن میں آمنے سامنے بیٹھے تھے دونوں مرد باہر ہال میں بیٹھ گئے تھے۔

"مسٹر اسید! آپ بہت اچھا لکھتے ہیں بلکہ آپ کے اخبار میں سب ہی اچھا لکھ رہے ہیں۔۔۔"

"تھینکس۔۔۔" اسید بے حد الجھا ہوا تھا۔

لڑکی نے ویٹر کو کافی کا کہہ کر پھر اسکی طرف دیکھا۔

"کئی پرانے گھاگ صحافی تو آپ سے خاصے جیلس ہو رہے ہیں۔۔۔"

"معلوم نہیں۔۔۔ ہر ایک کا اپنا ایک مقام ہے اور میں تو ابھی طفل مکتب ہوں۔۔۔"

لڑکی مسکرائی اور پھر یکا یک دونوں کہنیاں میز پر رکھتے ہوئے اس کی طرف جھکی

"آپ کے پاس اپنی گاڑی نہیں ہے چہ چہ۔۔۔

اتنا بڑا صحافی اور اسٹاپ پر ویگن یا بس کے انتظار میں کھڑا ہو، اسید! آپ ایک گاڑی کیوں نہیں خرید لیتے بلکہ میرے ساتھ چلیں ابھی کسی شوروم میں اور اپنے لیے گاڑی پسند کریں۔۔۔ کل صبح وہ آپ کے دروازے پر ہو گی ۔۔۔ بلیک ہنڈا سوک کیسی رہے گی۔۔۔"

اسید کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئیں اور اس نے اپنی الجھن کو جھٹکا اور اپنے فطری اعتماد کے ساتھ کہا۔

"دیکھیئے مس! آپ اپنا مقصد بیان کریں جس کے لیے مجھے یہاں لائی ہیں۔۔۔ تمہید میں وقت ضائع نہ کریں۔۔۔"

"اوکے۔۔۔" لڑکی ہونٹ سکیڑے اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تمہید نہیں۔۔۔۔ واقعی یہ ہماری خواہش ہے کہ آپ ایک اچھے پوش ڈایرے میں رہیں۔۔۔ آپ کے پاس ذاتی گاڑی ہو۔۔۔۔"

"پلیز۔۔۔۔!" اسید نے ہاتھ اٹھایا۔

"اصل بات۔۔۔۔ میرے پاس وقت نہیں ہے مجھے کسی سے ملنے جانا تھا۔۔۔۔"

"وقت تو ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔۔۔۔" اس نے سرد مہر آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"سمپل سی بات ہے مسٹر اسید! کہ ہم چاہتے ہیں کہ تم اخبار میں وہ لکھوں جو ہم چاہتے ہیں۔۔۔۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں۔۔۔۔؟" اسید نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"بتا دیں گے، پہلے آپ وعدہ کریں۔۔۔۔" ویٹر کافی کا سامان ٹیبل پر رکھ دیا گیا تھا۔

لڑکی کافی بنانے لگی۔

"سوری میڈیم! میرا قلم کسی کا غلام نہیں ہے اور مجھے وہی لکھنا ہے جو میرا دل اور ضمیر مجھ کہے گا۔۔۔۔"

"اپنا ہی نقصان کریں گے آپ اور حاصل حصول کچھ نہیں۔۔۔۔ کیا فائدہ پہنچایا ہے آپ کے قلم اور تحریر نے آپ کے ملک کو۔۔۔۔ وہ بیچارہ لڑکا حامد اپنی انگلیاں تڑوا کر بیٹھا ہے اور آپ تو غالباً ایسا ہرگز نہیں چاہیں گے۔۔۔۔" لڑکی کی مسکراہٹ بڑی زہریلی تھی۔

"تو تم لوگوں نے ہی حامد کو۔۔۔۔؟"

"فضول سوال نہیں۔۔۔۔" لڑکی نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی۔

"تم کون ہو۔۔۔۔؟ را کی، موساد کی، یا سی آئی اے کی ایجنٹ۔۔۔۔؟"

"تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے اسید عبدالرحمٰن۔۔۔۔!"

لڑکی کی نظریں اسید کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"یہ زندگی بہت مختصر ہے۔۔۔۔ ترس کر گزار دینا عقلمندی نہیں ہے۔۔۔۔ آج تم اکیلے ہو کل تمہاری شادی ہوگی، بچے ہوں گے، ان کے فیوچر کو بھی تو تمہیں بنانا ہے۔۔۔۔ تم اخبار کے علاوہ اپنا ایک چینل لانچ کرو۔۔۔۔ سب کام بھی کریں گے۔۔۔۔ پیسہ بھی ہم ہی خرچ کریں گے تمہاری ہیڈک نہیں ہوگا کہ ہم کیسے کرتے ہیں۔۔۔۔ تم اس چینل پر ان لوگوں کو بلاؤ گے ان سے انٹرویوز کرو گے جن کو ہم اوکے کریں گے۔۔۔۔"

اس نے کافی کی پیالی اسید کی طرف بڑھائی۔

"سوچنے کے لیے کچھ وقت لے لو اور۔۔۔۔"

"سوری میڈم! مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے انشاء اللہ ایک دن ہم چینل بھی لانچ کریں گے۔۔۔۔ وہ چینل ہماری مرضی کے پروگرام کرے گا۔۔۔۔ ہم اس چینل سے پاکستان کی نوجوان نسل کو، اس کے بچوں کو، ان کا تشخص دیں گے، انہیں آگاہ کریں گے کہ ان کو کس طرح تباہ کرنے کی سازشیں کی جارہی ہیں۔۔۔۔"

اسید کی آواز آہستہ تھی لیکن ایک جوش اور ایک ولولہ تھا اس کی آواز میں۔ لڑکی کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہم جسے چن لیتے ہیں اسید! تو پھر وہ ہمارے ساتھ چلتا ہے۔۔۔۔ یا پھر اسکی منزل قبر ہوتی ہے۔۔۔۔"

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ایک لمحہ کو اسید کا دل کانپ گیا۔

"اور مسٹر اسید! اچھی طرح سوچ کر جواب دینا۔۔۔۔ ہمیں جلدی نہیں ہے بہت۔۔۔۔ ایک زندگی کی آسائش ہے۔۔۔۔ اور دوسری طرف۔۔۔۔" اس کی سرد مہر آنکھوں میں چمک سی نمودار ہوئی۔

"پہلے تمہارے اپنوں کی۔۔۔۔ پھر تمہاری موت۔۔۔۔"

اسید نے ہاتھ میں پکڑی کافی کی پیالی نیچے رکھ دی تھی۔

"ہاں مسٹر حسین احمد اور آفتاب حسین سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"میرا خیال ہے تم اپنا ہوم ورک کمپلیٹ کر کے آئی ہو۔۔۔"

"وہ تو ہے۔۔۔" وہ مسکرائی۔

"لیکن۔۔۔تمہارے ملک میں دس نسلوں تک رشتوں کا جال بچھا ہے۔یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ہمیں تو دور تک کوئی رشتہ داری نظر نہیں آئی تمہاری حسین احمد کے خاندان سے۔۔۔"

"میرا ملک۔۔۔"

"یعنی تم غیر ملکی ہو۔۔۔؟" اسید نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

جو سمجھ لو مے بی۔۔۔ میں کبھی ریٹا، کبھی میری آن رہی ہوں اس وقت تو میں زرینہ ہوں۔۔۔تمہارے ملک کی باضابطہ شہری زرینہ آفریدی۔۔۔"

اسید نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"تو مسٹر اسید۔۔۔!" وہ کھڑی ہو گئی۔

"انتخاب کا حق آپ کے پاس ہے ایک طرف بہترین زندگی۔۔۔دوسری طرف۔۔۔" اس نے ایک معنی خیز نظر اس پر ڈالی۔

"سنا ہے آپ کو اپنے دادا سے بہت پیار ہے۔۔۔یوں بھی وہ اپنی عمر تقریباً گزار چکے ہیں۔۔۔اب تو اگر کسی روز سڑک پر کوئی حادثہ ہو جائے۔۔۔تو اچھا۔۔۔"

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے خاموش بیٹھے ہوئے اسید کی طرف دیکھا۔

"تمہاری کافی تو ٹھنڈی ہو گئی ہے۔۔۔میں اور بھجوا دیتی ہوں۔۔۔ہاں بل پے کر دیا جائے گا۔۔۔" وہ لہراتی ہوئی سی کیبن سے باہر نکل گئی۔

اسید ساکت بیٹھا تھا۔۔۔

"دادا جان۔۔۔!"

اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔

"دادا جان ان دنوں کتنے خوش نظر آتے ہیں۔

وہ چوراسی سال کے ہو چکے تھے لیکن ہمارے لیے ان کا وجود کتنا گھنا سایہ ہے۔

اور پھر دادا کے بعد۔۔۔نہیں۔۔۔"

اس کے لبوں سے پھر نکلا۔

"اور مجھے ایوارڈ ملے گا۔۔۔آج تک اس قوم نے کیا ایوارڈ دیا ہے۔اپنے محسنوں اور محب وطن لیڈروں تک کو نہیں بخشا۔۔۔حتیٰ کہ قائداعظم اور اقبال پر بھی کیچڑ اچھالنے والے اور مجھے کیا ملے گا۔اتنی قربانیاں دے کر۔۔۔تو پھر کیوں نہ اس لڑکی کی آفر قبول کر لوں۔۔۔آخر کئی دوسرے بھی تو ایسا ہی کر رہے ہیں۔۔۔ایک زبردست کالم ملک دشمنوں کے خلاف۔۔۔زبردست تنقید۔۔۔حکومت پر۔۔۔لیڈروں پر۔۔۔اور ساتھ ہی تین چار کالم اور آرٹیکل اس کی نفی کرتے ہوئے اور وہی کچھ کہتے ہوئے جو لیڈروں اور حکومت کی زبان ہے، ملک دشمن چاہتے ہیں ایک زبردست شاندار زندگی۔۔۔خوبصورت گھر۔۔۔گاڑی۔۔۔اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتے بچے۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" یکایک اس نے جھرجھری سی لی۔

آفتاب حسین نے کہا تھا۔

"یہ پل صراط کا سفر ہے اسید! دھاگے سے باریک اور نازک۔۔۔لیکن یاد رکھنا۔۔۔جو لوگ اپنے ایمان اور عقیدے میں سچے اور مضبوط ہوں گے وہ اس پل صراط سے آسانی سے گزر جائیں گے جب آدمی سچ کے راستے پر قدم رکھتا ہے تو وہ راستہ مشکل ہی کیوں نہ ہو اللہ کی مدد خود بخود اس کے شامل حال ہو جاتی ہے اور پھر راستے مشکل نہیں رہتے۔

اسید نے اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کیے۔

"یہ میں کیا سوچ رہا تھا۔۔۔؟" ندامت نے اسے گھیر لیا۔

"کس بات نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔۔۔موت نے۔۔۔؟

جو اپنے مقررہ وقت پر آئے گی۔۔۔نہ ایک لمحہ ادھر اور نہ ادھر۔۔۔حامد کہتا ہے۔۔۔اگر سانس پوری ہو گئی ہیں تو پھر بند قلعوں میں بھی فرشتہ اجل آ پہنچے گا۔۔۔خوف ڈر اور بدنامی کی زندگی کیوں قبول کروں۔

قسم ہے رب جلیل کی۔۔۔وہ لوگ یوم آخرت بہت خوش اور مطمئن کر دیئے

جائیں گے جنہوں نے غم واندوہ کو جھیلا اور اپنی زندگی، اپنا آپ، قوم وملک اور سچائی کے لیے وقف کردیا۔۔۔ یہ زندگی تو بہت چھوٹی اور ناپائیدار ہے۔۔۔ ختم ہوجانے والی۔۔۔ دلوں کے حساب یہاں نہیں آخرت میں ہوں گے۔۔۔ یہاں ہماری چھنی ہوئی خوشیاں اور مسکراہٹیں وہاں کئی گناہ زیادہ کردی جائیں گی۔۔۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو حامد۔۔۔!" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"اسید عبدالرحمٰن بھی اپنا سفر جاری رکھے گا اسی سمت اور اسے اپنی سمت تبدیل نہیں کرنی، کسی بھی قیمت پر نہیں۔۔۔"

موبائل کی بیل وقفے وقفے سے ہورہی تھی اس نے نمبر دیکھا۔۔۔ فہد تھا۔

"کہاں رہ گئے ہو بھئی۔۔۔!"

"آرہا ہوں یار۔۔۔!"

اس نے گرم جھاگ اڑاتی ہوئی کافی کی طرف دیکھا جسے ابھی ابھی ویٹر رکھ کر گیا تھا اور کھڑا ہوگیا۔

بے حد جاندار اور دل کش سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا اور اسکا چہرہ بہت روشن لگنے لگا اور آنکھیں اعتماد ویقین اور ارادے کی چمک سے جگمگا اٹھیں اور وہ بڑے اعتماد ویقین سے سر اٹھائے ادھر ادھر دیکھے بغیر ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔

اور میں نے۔۔۔ یعنی عروج نے اپنی کہانی یہاں ختم کردی ہے کیونکہ اس کا منقطی انجام یہی ہے لیکن یہ پوری کہانی نہیں ایسی کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوتی یہ جاری رہتی ہیں جب تک اس دنیا میں کوئی ایک فرد بھی سچ کا دامن تھامے ایمان اور نفس کی مضبوطی کے ساتھ اس پل صراط پر چلنے کا حوصلہ رکھتا ہے تب تک۔۔۔ اسید کے بعد کوئی اور اس کے بعد اور کوئی۔۔۔ اس جیسا۔ یوں ہی یہ سلسلہ چلتا رہے گا اور یہ کہانی بھی ختم نہیں ہوگی اور خدا کرے یہ کہانی ختم نہ ہو۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے

☆ ☆ ☆

مسافتیں بے نشاں ٹھہریں

یہ کہانی ملائکہ محب اللہ خان کی ہے۔۔۔؟

ملائکہ میری کون ہے۔۔۔؟

اور میں اس کی کہانی کیوں لکھ رہا ہوں۔۔۔؟

تو شاید اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔۔۔؟

وہ میری کون تھی۔۔۔؟

اسکے اور میرے بیچ کیا رشتہ تھا۔۔۔؟

محبت ومحبوب کا، ہمدرد کا۔۔۔ دوست کا یا جانے کیا۔۔۔؟

میں آج تک جان نہیں پایا ہوں۔۔۔ شاید مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی۔۔۔ یا پھر شاید مجھے اس سے ہمدردی تھی۔۔۔ مجھے اس پر ترس آتا تھا۔۔۔ میں محض اسے تباہ ہونے سے بچانا چاہتا تھا۔۔۔ ایک خوبصورت، ذہین اور بے حد ایجوکیٹڈ لڑکی کو۔۔۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا اتنے برس بیت جانے کے بعد بھی میں اسے نہیں بھولا۔

شاید اس کی کہانی کا قرض مجھے اتارنا ہے۔۔۔ یا شاید۔۔۔ میں نے اسے اس لیے نہیں بھلایا کہ وہ کچھ انوکھی سی تھی۔۔۔ اس کے اندر محبت کو پانے کی بڑی چاہ

تھی۔۔۔۔لیکن اس کے اندر کے الجھاؤ اور نفسیاتی گرہیں اتنی شدید تھیں کہ وہ محبت پانے کو لپکتی مگر۔۔۔۔ایک بار اس نے کہا۔

"ڈاکٹر حبیب احسن! تم میری کہانی لکھو۔۔۔۔"

"اچھا لکھوں گا۔۔۔۔" میں ہنس دیا۔

"لکھوں گا، لیکن کیا ایک پاگل سی لڑکی جو۔۔۔۔"

"تم وعدہ کرو میری کہانی لکھو گے۔۔۔۔"

وہ مچل اٹھی اور جب وہ ضد پر اتر آتی تھی تو کسی کی نہیں سنتی تھی مجھے وعدہ کرنا ہی پڑا۔ میں کوئی بڑا رائٹر نہیں ہوں لیکن کبھی کبھار کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں۔۔۔۔کچھ اندر سے باہر آنے کو بے تاب ہو تو میں قلم اٹھا لیتا ہوں۔۔۔۔شاید اسی وعدے کا بوجھ مجھے ملائکہ محبت اللہ کو بھولنے نہیں دیتا۔۔۔۔ان بیتے سات سالوں میں اسے کبھی بھول ہی نہیں پایا ہوں اور ایسا ہے کہ میں نے ان بیتے سالوں میں کچھ لکھا بھی نہیں ہے۔ آج قلم اٹھایا تو جی چاہا کہ ملائکہ کی کہانی لکھوں۔

ملائکہ ایک ایسی لڑکی تھی جسے خود اپنی صلاحیتوں کا ادراک نہیں تھا یا اگر ادراک تھا بھی۔۔۔۔لیکن پھر بھی اسے خود پر اعتماد نہیں تھا اس لیے وہ ساری زندگی دوسروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنی رہی۔۔۔۔اس نے وہی کیا جو دوسروں نے چاہا۔۔۔۔بلکہ دوسرے کون تھے؟ اس کی ماں اور ماموں۔۔۔۔اگر وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی تو شاید کہانی مختلف ہوتی۔۔۔۔شاید اس کے ساتھ وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔۔۔۔پتا نہیں اس سب کے لیے وہ قصوروار تھی یا دوسرے۔۔۔۔یا۔۔۔۔پھر اگر وہ خود قصوروار تھی تو کتنے فیصد۔۔۔۔

میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تھا تو اس نے بلیو جینز پر گھٹنوں سے اونچا کرتا پہن رکھا تھا جس کے گلے پر کڑھائی تھی چھوٹے چھوٹے بلیو اور وائٹ پھول اور وہ رو رہی تھی۔۔۔۔میں نے اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا جو اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے تو میں ٹھٹک کر رک گیا۔۔۔۔میں اپنے کلینک سے نکل کر پارکنگ کی طرف جا رہا تھا اور وہ پارکنگ میں ہی ایک سائیڈ پر اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی رو رہی تھی۔

"یہ کون ہے۔۔۔۔؟ اور یہ اس طرح کیوں رو رہی ہے۔۔۔۔؟ آخر اس کے ساتھ کیا ہوا۔۔۔۔؟" میں نے غیر ارادی طور پر قدم اس کی طرف بڑھا دیے۔

یہ لڑکی۔۔۔۔مجھے لگا۔۔۔۔جیسے میں نے اسے کبھی کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں۔۔۔۔میں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، یکا یک میرے ذہن میں روشنی سی کوندی۔

"ارے یہ تو۔۔۔۔" میں چونکا۔

"یہ تو ملائکہ محبت اللہ خان ہے۔ شوبز کی دنیا کا ایک جانا پہچانا نام۔۔۔۔اسکرین کا چمکتا ستارہ، ماڈلنگ سے اسٹارٹ لے کر ٹی وی اسکرین پر تہلکہ مچانے والی ملائکہ محبت اللہ خان۔۔۔۔"

اور پھر تقریباً چھ سات سال پہلے ہی عین عروج کے دور میں شوبز کو خیر باد کہہ دینے والی۔۔۔۔

اب نہ وہ کسی ٹی وی ڈرامے میں نظر آتی تھی اور نہ ہی کسی ایڈ میں۔ چند سال پہلے کی بات تھی وہ ٹی وی اسکرین پر چھائی ہوئی تھی۔۔۔۔اس کی اداکاری کی دھوم مچی ہوئی تھی رسالے اور اخبارات اس کے انٹرویو چھاپتے تھے۔ اس کی اداکاری پر تبصرہ کرتے، گو میں نے اسے زیادہ نہیں دیکھا۔ کیونکہ میں تو دو سال قبل ہی پاکستان آیا تھا اور ان دو سالوں میں کہیں کسی ڈرامے میں وہ دکھائی نہیں دی تھی۔ لیکن چند سال پہلے پاکستانی ڈرامے غیر ممالک میں بھی بہت شوق سے دیکھے جاتے تھے، میں نے بھی ایک دوست کے کہنے پر اس کا ڈرامہ دیکھا تھا، میرے اس دوست نے پاکستان سے پی ٹی وی کے مشہور ڈراموں کی سی ڈیز منگوائی تھیں۔

ایک بار میں نے ٹی وی پر اس کا انٹرویو بھی دیکھا تھا اور حیران ہو کر اس کی باتیں سنتے ہوئے از حد متاثر ہوا تھا۔ وہ بہت پڑھی لکھی تھی۔ کم از کم میں اس وقت تک نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی پاکستانی اداکارہ اتنی پڑھی لکھی ہو سکتی ہے۔ اس نے اے لیول سینٹ جوزف سے کیا تھا اور پھر گریجویشن جامعہ کراچی سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ کئی ڈپلومے اور کورسز بھی جو اب مجھے یاد نہیں تھے۔ میں دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ تب ہی تو میں نے اتنے سالوں بعد بھی

اسے پہچان لیا تھا وہ بلاشبہ وہی تھی لیکن وہ رو کیوں رہی تھی؟ یہ جاننے کے لیے ہی میں اس کی طرف بڑھا تھا۔ اگر میں امریکہ میں یوں کسی لڑکی کو روتے ہوئے دیکھتا شاید اس کی طرف منہ نہ کرتا۔ وہ اپنی ذاتیات کی مداخلت میں خفا بھی ہو سکتی تھی اور عین ممکن ہے وہ مجھ پر کیس بھی کر دیتی لیکن یہ پاکستان تھا وہ رونے کا سبب نہ بھی بتاتی لیکن وہ کم از کم میرے ساتھ ایسا کوئی سلوک نہ کرتی۔ اسی یقین نے مجھے اس کی طرف بڑھنے کا حوصلہ دیا تھا پھر یکا یک وہ مڑی اور میں نے اسے کھڑکی میں جھکتے دیکھا گاڑی میں کوئی اور بھی تھا شاید۔۔۔۔۔کیا مجھے لوٹ جانا چاہیے ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اس کی آواز سنائی دی وہ چلا رہی تھی۔

"تم بہت گھٹیا عورت ہو تم مجھے کبھی خوش نہ ہونے دینا۔۔۔۔تم خود غرض اور لالچی اور۔۔۔۔"

میں اب اس سے اتنے فاصلے پر تھا کہ اس کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی میں حیران کھڑا تھا۔ ٹی وی پر برٹش لہجے میں انگریزی بولتی وہ لڑکی۔۔۔۔۔نرمی سے ٹھہر ٹھہر کر بات کرتی۔۔۔۔اس لڑکی کا جو امیج میرے ذہن میں بنا ہوا تھا۔ وہ اس کے چلانے سے بری طرح مجروح ہوا تھا۔

"ملکی! میں کہہ رہی ہوں آرام سے گاڑی میں بیٹھو اور تماشا مت بناؤ۔۔۔۔"

اندر بیٹھی ہوئی خاتون نے کہا تھا وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی لیکن میں اسے نظر آ رہا تھا۔

"میں تماشا بناتی ہوں یا تم۔۔۔۔؟" اب وہ پہلے سے زیادہ چیخی تھی۔

"تم بناتی ہو میرا تماشا۔۔۔۔۔ہر جگہ ہر مقام پر۔۔۔۔"

"بے وقوف مت بنو ملکی! ماں ہوں میں تمہاری اور مجھے تمہاری بہتری چاہیے۔"

"تمہیں میری بہتری یا تباہی۔۔۔۔؟" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی تھی۔

"ملکی۔۔۔۔!" عورت نے کھڑکی میں سے ہاتھ باہر نکال کر اس کے بالوں کو مٹھی میں بھر کر جھٹکا دیا تو میں بے اختیار ایک قدم آگے بڑھا، اس نے اپنے بال اس خاتون کی مٹھی سے آزاد کیے اور پلٹ کر مجھے دیکھا۔

"کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں۔۔۔۔؟"

"چل اوئے راہ لگ اپنی۔۔۔۔" گاڑی والی خاتون کا لہجہ ایسا تھا کہ میں کھسیانا ہو گیا۔

"وہ سامنے میرا کلینک ہے میں پارکنگ کی طرف جا رہا تھا کہ آپ کو روتے دیکھا تو۔۔۔۔میں ڈاکٹر ہوں، ڈاکٹر حبیب احسن سائیکاٹرسٹ۔۔۔۔" میں نے وضاحت کی۔

وہ اب میری طرف مڑ چکی تھی اس کے رخسار بھیگے ہوئے تھے اور آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے وہ بہت اپ سیٹ ہو۔۔۔۔تب ہی وہ اتنا چیخ چیخ کو بول رہی تھی حالانکہ مجھے اب بھی اس کے لہجے کی نرمی اور شائستگی یاد ہے اس کا تلفظ بھی بہت اچھا تھا۔

"اٹس اوکے۔۔۔۔"

اس نے آہستگی سے کہا اور تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ میں نے اندر بیٹھی ہوئی خاتون کو دیکھا۔ تیز گلابی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس، گہرا میک اپ کیے وہ شکل سے کوئی نائیکہ لگ رہی تھی۔۔۔۔تو کیا ملائکہ محبت اللہ کا تعلق اسی قبیلے سے ہے؟ ایک لمحہ کو مجھے خیال آیا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ کسی میگزین میں میں نے پڑھا تھا کہ وہ کسی اچھی فیملی سے ہے اور اس کے والد کسی جاگیردار فیملی کے ہیں۔

ان دنوں جب اس نے شوبز کو خیر باد کہا تھا تب اس کے متعلق میگزینز میں، اخباروں میں، فلمی پرچوں میں بہت کچھ چھپتا رہا تھا۔ ایسا ہی ایک پرچہ میرے ہاتھ بھی لگ گیا تھا جس میں اسکے شوبز چھوڑنے کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں کی گئی تھیں کہ اسے کسی سے عشق ہو گیا تھا اور وہ شوبز چھوڑ گئی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس کی شادی جاگیردار باپ کے خاندان میں ہو گئی ہے۔

وہ گاڑی پارکنگ سے نکال کر لے گئی تھی اور میں ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

"تھینک گاڈ!" میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اس نے کچھ نہیں کہا تھا اور شکر ہے کہ یہ پاکستان تھا۔

☆ ☆ ☆

میں ایک ڈاکٹر ہوں ایم بی بی ایس۔ڈاکٹر نہیں بلکہ سائیکاٹرسٹ۔بلکہ میرا ذاتی کلینک بھی تھا جہاں میں شام کو بیٹھتا تھا لیکن میں نے بنا بنایا سیٹ اپ چھوڑ کر یہاں آنے کو ترجیح دی کیوں۔۔۔۔۔؟ٹھہریے پہلے میں آپ کو اپنے متعلق بتاتا ہوں۔

میرا نام حبیب احسن ہے ڈاکٹر حبیب احسن۔۔۔۔ہم دو بھائی ہیں، میرے بابا آرمی میں تھے اور ڈیپوٹیشن پر کچھ عرصہ سعودی عرب میں کام کرنے کے بعد انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد میرے بھائی نے انہیں امریکہ بلالیا۔گو وہ وہاں جانا نہیں چاہتے تھے ان کا ارادہ اپنی زمینوں کو آباد کرنے کا تھا لیکن اسد بھائی کے سامنے مجبور ہوگئے۔اسد بھائی کو امریکہ میں سیٹل ہوئے سات آٹھ سال ہوگئے تھے اس دوران وہ صرف ایک بار پاکستان آئے تھے۔ان کی بیوی امریکن تھی جس نے اسلام قبول کرلیا تھا۔بابا نے چاہا تھا کہ وہ پاکستان سیٹل ہوجائیں اور اسلام آباد میں گھر بنائیں لیکن اسد اور ان کی وائف کو یہاں رہنا پسند نہ تھا اور امی اب ان کے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔سو بابا اور امی امریکہ چلے گئے۔میں نے ایف ایس سی کے بعد نیا نیا کالج میں ایڈمیشن لیا تھا کہ اسد بھائی نے میرے پیپرز بھی بھجوادیے اور میں امریکہ چلا گیا۔

اسد اور ان کی بیوی عائشہ ٹیکساس میں رہتے تھے۔ان کا گھر بہت خوبصورت تھا اور عائشہ بہت اچھی لڑکی تھی۔مجھے وہاں جا کر پہلے گریجویشن کرنا تھا اور گریجویشن کے بعد میرا ٹیسٹ لیا گیا اور مجھے مشورہ ملا کہ مجھے ایم بی بی ایس کی بجائے سائیکولوٹیسٹ پڑھنا ہے اور نفسیاتی امراض کا معالج بننا ہے۔سو میں نے اپنے پروفیسر کی رائے کا احترام کیا۔میرا پورا خاندان وہاں تھا سو مجھے وہاں سیٹل ہونے میں مشکل پیش نہیں آئی تھی۔وہاں میں ایک کامیاب ڈاکٹر تھا۔میرے پاس آنے کے لیے تین تین ماہ پہلے ٹائم لینا پڑتا تھا۔

پھر بھی یہاں آگیا سب کچھ چھوڑ کر۔۔۔۔۔صرف اس لیے کہ یہ بابا کی خواہش تھی۔حالانکہ وہاں کیا نہیں تھا میرے پاس، اپنا ذاتی گھر، جاب، پیسہ اور پھر سب سے بڑھ کر جائمہ حارث۔۔۔۔مسلمان باپ کی کرسچین بیٹی۔۔۔۔۔اس میں مسلمانوں والی کوئی بات نہ تھی۔اس کا باپ بہت پہلے جب وہ چھوٹی سی تھی اس کی ماں کو چھوڑ گیا تھا بہت سارے دوسرے ایشائی مردوں کی طرح۔اس کی ماں اب اپنے ایک بوائے فرینڈ کے

ساتھ رہتی تھی اور جائمہ حارث ایک الگ اپارٹمنٹ میں۔ممکن ہے مجھے ملنے سے پہلے اس کے ساتھ بھی کوئی اس کا اپارٹمنٹ شیئر کرتا ہو، لیکن جب میری اس سے ملاقات ہوئی تھی میں نے اسے اکیلا ہی رہتے دیکھا تھا۔وہ کرسمس پر اپنی ماں کے پاس جاتی تھی ورنہ اکیلی رہتی تھی۔

وہ اپنے نام کے ساتھ حارث لکھتی تھی لیکن وہ کبھی کبھار چرچ بھی چلی جاتی تھی اور کرسمس کی تیاریاں ہفتوں پہلے شروع کردیتی۔میرے اور اس کے درمیان مذہب کبھی زیر بحث نہیں آیا تھا۔میں نے کبھی اسے نہیں کہا تھا کہ میں اس محبت کرتا ہوں اور نہ ہی اس نے۔۔۔۔لیکن ہمیں ایک دوسرے سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ہم دونوں اپنی اپنی جگہ جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔میں جب پاکستان سے گیا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس آجاؤں گا۔تو میں جو وہیں ٹک گیا تھا صرف جائمہ حارث کے لیے۔۔۔۔۔

وہ ایسی ہی تھی اتنی دلکش اتنی پیاری کہ میں گھنٹوں اسے تکتا رہتا تھا۔اس میں ایک خاص دلربائی تھی، ایک سپردگی، ایک وفاداری۔۔۔۔۔میں اس کا اسیر تھا، عاشی بھابھی کی طرح وہ بھی میکسیکن تھی اور میرے مشاہدے کے مطابق میکسیکن لڑکی میں بہت وفا ہوتی ہے وہ ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔

میں واشنگٹن میں تھا۔بابا اور اماں کبھی کبھی میرے پاس رہتے اور کبھی اسد بھائی کے پاس۔میں نے جائمہ سے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گا لیکن میرے ذہن میں تھا کہ سیٹل ہونے اور اچھا سا گھر لینے کے بعد میں جائمہ سے شادی کے لیے کہوں گا۔میں اسے جُو کہہ کر پکارتا تھا۔جو فارسی میں ندی کو کہتے ہیں۔وہ بھی کسی ندی ہی کی طرح ہے۔سبک رو ندی کی طرح۔۔۔۔گھر لینے اور سجانے کے بعد میں نے سوچا تھا لیکن بابا کو اچانک ہارٹ کی تکلیف ہوئی اور انہیں ہاسپٹل لے جانا پڑا۔۔۔۔ڈاکٹر نے بائی پاس تجویز کیا اور بابا گھر آگئے۔

اس روز میں ان کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ اچانک انہوں نے کہا۔

"بیٹو میری ایک بات مانے گا پترا۔۔۔۔!"

اس طرح بیو کہہ کر انہوں نے شاید کبھی بہت بچپن میں مجھے پکارا تھا ان کے لہجے میں پتا نہیں کیا تھا کہ میں تڑپ اٹھا۔

"بابا! آپ حکم کریں۔۔۔۔۔"

"بیٹا! تم کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کرنا۔۔۔۔۔"

ایک لمحے کو مجھے ایسا لگا جیسے میرا دل ساکت ہو گیا ہو۔

"کیا بابا جان! جان گئے تھے کہ میں جائمہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟"

مجھے اپنے دل کی دھڑکن سنائی نہیں دے رہی تھی۔۔۔۔۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں یکا یک تہی داماں ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔ شاید بابا نے میرے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھا تھا کہ ان کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ انہوں نے نظریں میرے چہرے سے ہٹالیں۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کرتا اگر تم نہیں چاہتے تو۔۔۔۔۔ بس درخواست کی تھی تم سے۔۔۔۔۔"

"بابا۔۔۔۔۔!" میں نے تڑپ کر انہیں دیکھا ایک لمحے کے لیے جو پس منظر میں چلی گئی تھی۔ یہ میرا باپ تھا جس نے زندگی میں میری کوئی خواہش رد نہیں کی تھی۔

جس نے باپ کی شفقت کے ساتھ دوستوں کا سا اعتماد بھی دیا تھا۔۔۔۔۔ اس نے آج تک کچھ طلب نہیں کیا تھا۔ بلکہ دیا ہی تھا اگر اس نے ایسی خواہش کا اظہار کیا تھا تو اس کا کوئی سبب ضرور ہوگا۔۔۔۔۔ ورنہ عاشی بھابھی سے بھی انہیں کوئی شکایت نہ تھی۔ عاشی بھابھی نے جنہوں نے اسد بھائی کی خاطر اسلام قبول کر لیا تھا۔ جو ماں اور بابا کا بہت خیال رکھتی تھیں۔۔۔۔۔ جن دنوں وہ اسکے گھر ہوتے وہ خصوصاً جینز ٹراؤزر اور شرٹ پہنتیں، سر پر اسکارف باندھے رکھتیں، وہ ہر جمعہ کو مسجد میں نماز کے لیے بھی جاتی تھیں، میرے دونوں بھتیجے بھی ان کے ساتھ مسجد جاتے، گھر میں ایک قاری انہیں قرآن پڑھانے آتا تھا، وہ اردو نہیں جانتے تھے اپنی ماں کی طرح امریکن لہجے میں انگریزی بولتے تھے۔ خود کو مسلمان اور پاکستانی بتاتے کہ شاید یہ بابا نے ہی انہیں سکھایا تھا۔ عاشی بھابھی ایک مثالی بہو اور بیوی تھیں۔ بابا جب صبح نماز کے لیے اٹھتے تو انہیں بیڈ ٹی بنا کر کمرے میں دے جاتیں۔ میں نے جب گریجویشن کیا تو انہوں نے مجھے گاڑی گفٹ کی۔ میں سمجھتا تھا وہ

پاکستانی بہو کے مقابلے میں بہت اچھی ہیں۔

بابا اور اماں بھی ان کی بہت تعریف کرتے تھے لیکن پھر بھی کہیں کوئی کمی تھی کہ بابا نے ایسا کہا تھا مجھ سے۔۔۔۔۔ لیکن مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"بابا۔۔۔۔۔!" میں نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"درخواست نہیں۔۔۔۔۔ حکم کریں۔۔۔۔۔ آپ کی ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔" یکا یک ان کا چہرہ چمک اٹھا۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے بیو! میں تیری پھپھو کو لکھتا ہوں تیرے لیے لڑکی تلاش کرے۔۔۔۔۔" بابا خوش تھے لیکن میرے اندر تو سناٹے اتر آئے تھے میں اُس سے بھاگنے لگا، کترانے لگا، وہ حیران تھی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں بیب۔۔۔۔۔!"

ایک دن اس نے کلینک میں پکڑ لیا میں نے نظریں چرالیں حالانکہ جب وہ مجھے ہونٹ گول کر کے حو بیب کہتی تھی تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔۔۔" بس مصروف تھا۔

"صرف مصروف تھے یا کچھ اور بات تھی۔۔۔۔۔؟" وہ تو میرے اندر اتر جاتی تھی۔

یہ بابا نے کیا مانگ لیا تھا کہ میری زندگی ہی ویران کر دی۔۔۔۔۔ میں وہاں ہو کر بھی اُس کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے خوف آتا تھا کہ کہیں میں اپنے وعدے سے پھر نہ جاؤں۔ کہیں کسی کمزور لمحے میں ایسا کچھ کر بیٹھوں کہ پھر بابا سے نظریں نہ ملا پاؤں سو میں نے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا، بابا بہت خوش ہوئے تھے۔

"تم جاؤ ہم بھی جلد آئیں گے۔۔۔۔۔" بابا کا بائی پاس ہونا تھا۔

ماں نے صرف اتنا کہا۔

"میرا دل تو دو لخت ہو جائے گا نا احسن صاحب! آدھا یہاں آدھا وہاں۔۔۔۔۔ یہاں رہتے تو حبیب کا خیال وہاں ہوئے تو اسد کی تڑپ۔۔۔۔۔"

"ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں تو تم ہی بھرتی تھیں حالانکہ جتنا سکھ عاشی نے تمہیں دیا

اتنا۔۔۔۔" بابا اماں سے کہہ رہے تھے لیکن میں سوچ رہا تھا اور جو میرا دل سخت ہو گیا تھا وہ
بابا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"پاکستان ہمارا پیارا ملک ہے، ہمارا اپنا وطن، وہاں کا کچھ بھی اجنبی نہیں ہے
حبیب! تم وہاں کچھ نہ بھی کرو تب بھی اتنی جائیداد اور زمین ہے میری وہاں کہ گھر بیٹھے
ساری زندگی کھاتے رہو، صرف اسلام آباد کے بنگلوں کا ہی کرایہ کافی ہے۔"

وہ سمجھ رہے تھے کہ میں اس لیے افسردہ ہوں کہ مجھے اپنے مستقبل کا خوف ہے
میں نے عمر کے اٹھارہ سال پاکستان میں گزارے تھے مجھے بھی بابا کی طرح پاکستان سے
بہت محبت تھی اگر کوئی پاکستان کے متعلق غلط بات بھی کرتا تھا تو میرا جی چاہتا کہ اس کا منہ
نوچ لوں۔ برائی کہاں نہیں ہے اور یہ برائیاں پیدا کون کرتا ہے۔ جو میں وہاں ٹھہرا ہوا تھا تو
صرف اس لیے کہ جُو نے مجھے ان دیکھی زنجیروں میں باندھ رکھا تھا اور اب جب میں نے
یہ زنجیریں توڑ دی تھیں تو پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ اسے اپنے جانے کا بتایا تک نہیں لیکن پتا نہیں
اسے کیسے پتا چل گیا تھا۔

جب میں بورڈنگ کے لیے جا رہا تھا تو میں نے لاؤنج کے شیشے کے پیچھے سے
اسے دیکھا وہ متوحش نظروں سے ادھر دیکھ رہی تھی پھر جیسے اس نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ ہاتھ ہلا
رہی تھی، وہ رو رہی تھی، میں نے اس کے ہونٹوں کو ہلتے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ کچھ کہہ بھی
رہی تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھ گیا اور پھر کتنے ہی دن خود کو سمجھاتا رہا۔ میں نے اس
سے کب کہا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گا ہمیشہ اس کے ساتھ رہوں گا ہم بس دوست
تھے۔

"اگر صرف دوست تھے تو اسے پھر بتائے بغیر کیوں بھاگ آئے۔۔۔۔"
کوئی میرے اندر سے ہی مجھے کچوکے لگاتا لیکن بہر حال میں نے خود کو سنبھال لیا
بابا اور اماں بھی بابا کے بائی پاس کے بعد آ گئے تھے۔

میں نے کلینک اسٹارٹ کر لیا تھا گو میں کوئی خاص کامیاب نہیں تھا۔ دراصل تب
ہمارے ملک میں نفسیاتی عوارض کا علاج کرانے کا کوئی خاص رجحان نہیں تھا۔ ایلوپیتھک
علاج سے ناکام ہو کر خود بخود ہی یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ جادو ہے یا جنات کا اثر

ہو گیا ہے۔ گو ابھی حالات کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوئے تاہم پہلے سے بہترین ہیں اور اب تو
مریضوں کا تانتا لگا رہتا تھا جیسے ہر ایک کو نفسیاتی پرابلم تھا۔

اپنے ہی گھر میں محرم رشتوں سے خوفزدہ بچیاں، تنہائی کا شکار بوڑھے، شوہر کا
تشدد برداشت کرنے والی بیویاں، شادی کر کے گھر بسانے اور مائیں کہلانے کی خواہش
مند عورتیں۔۔۔۔ غرض اس ترقی یافتہ ملک میں نفسیاتی مریضوں کی کمی نہ تھی لیکن یہاں
سارا دن تقریباً فارغ بیٹھا رہتا تھا تب میرے دوست ڈاکٹر مظہر حسین نے مجھے مشورہ دیا۔
"کہ میں فونٹین ہاؤس کو رضاکارانہ طور پر جوائن کر لوں۔۔۔۔ نہیں تو میری
صلاحیتوں کو زنگ لگ جائے گا۔"

مجھے مظہر کا مشورہ پسند آیا تھا وہ خود بھی نفسیاتی مریض تھا اس کے توسط سے ہی
کچھ مریض میرے پاس آئے تھے جن میں دو ابھی میرے زیر علاج تھے۔ ایک مسز ملک کسی
مل اونر کی بیوی، اس کا مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس کرنے کو کوئی کام نہ تھا۔۔۔۔ بچے جوان
تھے اور شوہر کسی اور لڑکی میں دلچسپی لے رہا تھا۔

دوسرا ایک گورنمنٹ آفیسر جو بیوی اور ماں کے درمیان گھن چکر بنا ہوا تھا۔ ماں
کے پاس گیا تو وہ بیوی کے خلاف بولتی اور بیوی کے پاس گیا تو وہ ماں کے
خلاف۔۔۔۔ اس کے ساتھ سیٹنگ کے دوران مجھے عاشی بھابھی کا خیال آیا اور پھر جُو کا
لیکن مجھے بابا سے کیا ہوا وعدہ نبھانا ہے۔ فاؤنٹین ہاؤس جوائن کرنے سے مجھے ایک
مصروفیت مل گئی تھی۔

میں فاؤنٹین ہاؤس جانے کے لیے ہی اپنے کلینک سے نکلا تھا جب میں نے
ملائکہ کو روتے ہوئے دیکھا۔ ملائکہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں جب یہاں سے گیا تھا تب کے
اور اب کے پاکستان میں بہت فرق تھا لیکن صرف اتنا فرق کہ جیسے کوئی معصوم سیدھا سادھا
دیہاتی بچہ شہر میں آ کر ویسا ہی ہو جائے۔ بڑے بڑے پلازے اور مارکیٹیں بن گئی تھیں،
لڑکیاں نوکریاں کر رہی تھیں، خاصی پراعتماد ہو گئی تھیں، کئی گھروں میں ڈش لگ گئی تھی، بہت
کچھ بدلنے کے بعد بھی بہت کچھ ویسا ہی تھا۔ لیکن اب سات سال بعد تو اور بھی سب کچھ
بدل گیا تھا اتنا کچھ کہ کبھی کبھی میں حیران رہ جاتا تھا۔

تقریباً ہر گھر میں کیبل موجود ہے، سڑک پر چھابا لگا کر پکوڑے بیچنے والے سے
لے کر سبزی بیچنے والا بھی کیبل سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ بھلے وہ بچوں کو اچھا لباس یا تعلیم
نہ دے سکے لیکن کیبل کی تفریح ضرور مہیا کر رہا ہے میں جب بھی کبھی لیبرٹی مارکیٹ میں
جا نکلتا۔ لڑکیاں جینز اور ٹی شرٹ میں دوپٹوں سے بے نیاز نظر آتی تھیں۔

شادی بیاہ کی تقاریب میں لڑکیاں ماتھے پر بندیا لگاتی ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار
میری کزن نے اپنے سکول کی کسی پارٹی میں شرکت کے لیے ماتھے پر بندیا لگائی۔ آنٹی نے
دیکھا تو ڈانٹ دیا۔

"فوراً اتار دو اسے تم ہندو نہیں ہو۔۔۔۔"

اور ابھی کل کی بات ہے میں اسلام آباد گیا تو ایک دوست سے سنا کہ اب
پاکستان بار ہاؤسز اور کیسینو بنائے جا رہے ہیں۔

"کیا ہم اور دوسروں میں کوئی فرق نہیں رہا۔۔۔۔؟" میں نے بے اختیار اس
حکمران کو خراج تحسین پیش کیا جس نے بہت پہلے ملک میں شراب بنانے اور بیچنے پر پابندی
عائد کی تھی۔

معاف کیجیے گا یہ میں کن باتوں میں الجھ گیا ہوں میں نے تو آپ کو ملائکہ کے
متعلق بتانا تھا۔ پہلی بار میں نے ملائکہ کو کب دیکھا تھا اور کیسے انوکھے انداز میں۔ آج جب
میں اس کی کہانی لکھ رہا ہوں تو وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آ رہا ہے۔ گاڑی سے ٹیک
لگائے روتی ہوئی، پھر کھڑکی سے سر اندر کیے چیختی ہوئی ملائکہ محبت اللہ خان کو اس وقت بھی
میں کئی روز تک سوچتا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی وہ یوں سر عام کھڑی کیوں رو رہی ہے اور وہ
عورت جو خود کو اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ وہ ہرگز اس کی ماں نہیں لگتی تھی اتنی نفیس اور
ایجوکیٹڈ۔۔۔۔ اور وہ عورت جو ماں تھی اتنی جاہل اور بدتمیز۔۔۔۔

بہت سارے دن میں اس کے متعلق سوچتا رہا۔ رات کو جب میں بستر پر لیٹتا
تو جائمہ کے ساتھ وہ بھی میرے تصور میں آ جاتی۔۔۔۔ آخر کیا تھا اس میں۔۔۔۔؟ ماضی
کی ایک اداکارہ اور جائمہ۔۔۔۔ آخر کیا کمی تھی جائمہ میں۔۔۔۔ لیکن بابا۔۔۔۔ عاشی
بھابھی کی بہت تعریف کرتے تھے اس کے باوجود انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں پاکستانی

لڑکی سے شادی کروں۔۔۔۔ شاید وہ چاہتے ہوں میرا رشتہ پاکستان سے جڑا رہے،
شاید ابھی کسی آس پر انہوں نے پاکستان میں اپنی پراپرٹی فروخت نہیں کی تھی۔ بابا خوش تھے
اور شاید اماں بھی اور میں ان کی خوشی میں خوش تھا اور خود کو بہلاتا رہتا کہ میں نے بالکل صحیح
فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔ میرا ایک مصری دوست عبدالماجد اکثر کہا کرتا تھا۔

"کہ پاکستانی مرد بہت خوش قسمت ہوتے ہیں اس لیے کہ پاکستانی عورت دنیا
کی ساری عورتوں کے مقابلے میں اچھی بیوی ہوتی ہے۔" ہاں شاید میں بھی خوش قسمت
تھا۔

اماں نے میرے لیے لڑکی پسند کر لی تھی میری پھپھو کی نند کی بیٹی مریم۔۔۔۔
سب ہی اس کی تعریف کرتے تھے مگر میں نے اس میں کبھی بھی دلچسپی نہیں لی تھی۔

"ٹھیک ہے اماں آپ کو جو پسند ہو۔۔۔۔"

رشتہ کرنے سے پہلے اماں نے مجھے بتایا تھا تو میں نے کہہ دیا لیکن پھر یوں ہوا
کہ فوری طور پر ادھر ہاں نہ ہو سکی کیونکہ اس کے والد اور بھابھی ملک سے باہر تھے۔ طے یہ
ہوا تھا کہ وہ آجائیں تو مجھے ملنے کے بعد فیصلہ کریں گے۔

بابا میری شادی جلد از جلد کرنا چاہتے تھے۔ شاید وہ جُو کے آنے والے ٹیلی فون
سے خوفزدہ تھے جبکہ اماں کی نظر میں مریم کے بعد کوئی لڑکی جچتی نہ تھی۔ اب جبکہ مریم کے والد
ابھی تک نہ آسکے تھے۔ پھپھو سے پتا چلا تھا کہ اس کے اپنے خاندان میں بھی لڑکے ہیں
اماں نے ادھر سے بددل ہو کر لڑکی کی تلاش کرنے کی مہم پھر شروع کر دی تھی لیکن ابھی تک کوئی
نظر میں نہیں جچتی تھی۔ مجھے بھی کوئی ایسی جلدی نہ تھی میں نے خود کو کلینک اور فاؤنٹین ہاؤس
میں مصروف کر لیا تھا۔ کچھ پرانے دوست بھی مل گئے تھے۔ سو وقت اچھی طرح گزر رہا تھا گو
کبھی کبھی جُو کی یاد اتنی ستاتی کہ جی چاہتا بابا سے درخواست کروں کہ مجھے اپنے وعدے کی
زنجیروں سے آزاد کر دیں لیکن پھر میں خود کو سنبھال لیتا اور اب اس ملائکہ محبت اللہ خان نے
اچانک زندگی میں داخل ہو کر کئی دن تک مجھے ڈسٹرب رکھا اور جب میں اسے تقریباً بھول
چکا تھا کہ ایک دن وہ میرے کلینک میں آ گئی۔ ایک لمحہ کو تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا وہ
بیگی میرے آفس میں آئی تھی۔

"آپ۔۔۔۔!"

"آپ نے پہچان لیا۔۔۔۔"

"جی آپ۔۔۔۔!"

"ہاں میں وہی ہوں جو اس روز رو رہی تھی۔۔۔۔"

اس نے میری بات کاٹ دی تھی۔ میں خاموش رہا میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اب کیا کہوں۔

"میں معذرت خواہ ہوں کہ اس روز آپ سے۔۔۔۔۔"

کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔" اب کے میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میری غلطی تھی اس طرح آپ کے پرسنل معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے تھا۔۔۔"

"جب کوئی میری طرح حرکت کرے۔۔۔۔سر راہ کھڑے ہو کر رونے کی تو۔۔۔۔غلطی تو میری ہے نا۔۔۔۔"

اس نے ذرا سی نظریں اٹھائیں اس کی آنکھوں کا رنگ کیسا تھا؟ شاید براؤن شاید گرے۔۔۔نہیں بلکہ براؤن ہی تھا اور ان میں عجیب سا سنہرا پن تھا۔ اس نے کوئی میک اپ نہیں کیا ہوا تھا یا پھر اگر تھا بھی تو اتنا لائٹ کہ محسوس نہیں ہو رہا تھا اس کی پلکیں بغیر مسکارے کے ہی بیحد خوبصورت تھیں، اس کے ہونٹوں کے گلابی پن کو کسی لپ اسٹک کی حاجت نہ تھی، وہ آج سفید لباس میں تھی۔ سفید شلوار قمیض میں اور بڑا سا ڈوپٹہ۔ سادگی میں بھی عجیب حسن تھا۔

"دراصل میں۔۔۔۔" ایک معمولی سے وقفے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا۔

"آپ جانتے ہیں میں کون ہوں؟"

"میرا خیال ہے آپ ملائکہ ہیں۔ ملائکہ محب اللہ خان!" میں نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

"آپ اتنی بے یقینی سے کیوں کہہ رہے ہیں کہ ملائکہ ہوں۔۔۔کیا چھ سات

سال اتنا زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ لوگ مجھے ملائکہ محب اللہ خان کو بھلا دیں۔۔۔۔جس کی وجہ سے ٹی وی ڈرامہ کامیاب ہوتا تھا" اسکے لہجے میں یکدم تیزی آئی تھی۔

میں نے کسی قدر ندامت سے کہا۔

"ایسا نہیں ہے مس ملائکہ! لوگ آپ کو ہرگز نہ بھولے ہوں گے۔ مجھے بھی دیکھئے کہ میں نے صرف ایک یا دو ڈراموں میں دیکھا پھر بھی پہچان لیا۔ ایکچوئلی میں ملک سے باہر رہا ہوں ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہے مجھے وطن آئے۔"

"اوہ اچھا تو آپ کہاں رہے؟" اس کے ماتھے کے بل ختم ہوئے۔

"امریکہ میں۔۔۔"

"اور یہاں کیوں آگئے ہو۔۔۔۔؟"

"بس وطن کی محبت کھینچ لائی۔۔۔" میں مسکرایا۔

"آپ بتائیے آپ نے کیسے زحمت کی۔۔۔۔"

"ایک تو آپ سے معذرت کرنا تھی۔ دوسرا آپ نے بتایا تھا کہ آپ سائیکاٹرسٹ ہیں۔ میں اپنے علاج کے لیے آئی ہوں ڈاکٹر حبیب! کیا آپ مجھے ٹائم دے سکیں گے؟"

"وائے ناٹ۔۔۔" میں نے سوچا۔ میرا انداز ٹھیک تھا کہ یہ لڑکی نفسیاتی مریض ہے۔

"لیکن آپ جانتی ہیں کہ اس میں سب سے اہم چیز پیشنٹ کا تعاون ہوتا ہے آپ کو اپنے مسئلے کے علاوہ اپنے متعلق سب کچھ بتانا ہوں گا۔ ایمانداری کے ساتھ۔ اس طرح ٹریٹمنٹ میں آسانی رہتی ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔میں سب سوچ کر یہاں آئی ہوں دو سال پہلے میں علاج کے سلسلے میں ایک ڈاکٹر کے پاس گئی تھی لیکن پھر علاج ادھورا ہی چھوڑ دیا۔"

"جی بتائیے کیا مسئلہ ہے آپ کو۔۔۔؟" میں نے پیشہ وارانہ انداز میں پوچھا۔

"کبھی میرا دل چاہتا ہے ڈاکٹر حبیب! کہ میں ساری دنیا کو توڑ پھوڑ کر تباہ کر

دوں، کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں قتل کر دوں، خاص طور پر اپنی پھوپھی کو اور کبھی میرا دل چاہتا ہے میں سمندر میں چھلانگ لگا دوں، خودکشی کر لوں زندگی ختم کر لوں اپنی۔۔۔۔"

اس کے چہرے پر کرب پھیل گیا اور آنکھیں نم ہو گئیں میں نے اس کے درد کو اپنے دل میں اترتا محسوس کیا۔

"آخر آپ کے دل میں اس طرح کا خیال کیوں آتا ہے آپ کو کیا شکایت ہے دنیا سے۔۔۔۔؟"

"مجھے دنیا سے کیا شکایت ہے۔۔۔۔؟" وہ عجیب طرح سے ہنسی۔

"ایک نہیں ڈاکٹر حبیب! مجھے دنیا سے بہت سی شکایتیں ہیں۔۔۔۔"

"مثلاً۔۔۔۔" میں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"اس دنیا نے میری قدر نہیں کی، میرے ٹیلنٹ کو دیکھو کتنی جلدی بھلا دیا ہے سب نے مجھے، ابھی پچھلے دنوں ٹی وی کی سلور جوبلی منائی گئی اور مجھے کسی نے نہیں بلایا، یاد تک نہیں کیا۔ حالانکہ ایرے غیرے سب مدعو تھے۔"

"ہو سکتا ہے مس ملائکہ ان کے پاس آپ کا ایڈریس نہ ہو۔۔۔۔ لیکن میرا خیال ہے جب بھی ٹی وی ڈرامے کا ذکر ہوتا ہے آپ کا نام ضرور آتا ہے۔ لوگ آپ کا ذکر کرتے ہیں۔"

میں نے اس کی تردید کی تو ایک لمحہ کو وہ خاموش ہو گئی لیکن کچھ دیر بعد سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر حبیب! آپ نہیں جانتے۔۔۔۔ آپ بالکل نہیں جانتے۔۔۔۔ یہاں کے لوگوں کو، ان کی سیاست کو، یہ سب چمچے ہیں پروڈیوسروں کے۔۔۔۔"

پھر وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر چپ ہو گئی۔

"چلیے۔۔۔۔" میں بہت ہلکے پھلکے مزاج سے باتیں کر رہا تھا۔

"دنیا کا قصور ہے کہ انہوں نے آپ جیسی باصلاحیت فنکارا کو بھلا دیا لیکن یہ اپنی پھوپھو کو کیوں قتل کرنا چاہتی ہیں آپ۔۔۔۔؟"

"پھوپھی۔۔۔۔؟"

اس نے دونوں مٹھیاں بھینچیں۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا اس پھوپھی نے مجھے میری ماں سے چھین لیا تھا۔ اس وقت جب میں صرف دو تین سال کی تھی۔ میرے باپ نے میری ماں کو طلاق دے دی تھی۔ ماں کے بعد اس پھوپھی نے مجھے پالا پوسا، پڑھایا اور وہ کہتی رہی کہ مجھے اپنی بہو بنائے گی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ کہتی تھی وہ مجبور ہے اس کا بیٹا اس کے لیے راضی نہیں ہے، بھلا مجھ میں کیا کمی ہے۔۔۔۔ ڈاکٹر حبیب! کیا کوئی کمی ہے۔۔۔۔؟"

وہ یکدم کھڑی ہو گئی اور کمرے میں کیٹ واک کرتی ہوئی پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

"لیکن اس نے مجھے رد کر دیا۔ ڈاکٹر حبیب! یونو اس نے مجھے۔۔۔۔ ملائکہ کو رد کر دیا اور پھر میں اپنی ماں کے پاس چلی گئی لیکن پھوپھی نے مجھے روکا نہیں ایک بار بھی نہیں، عرفان نے مجھے رد کر دیا تھا، کیا پھوپھی اپنے خاندان کے کسی لڑکے سے میری شادی نہیں کر سکتی تھیں لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ڈاکٹر حبیب! اس نے۔۔۔۔ اور یہ پھوپھی بہت ظالم ہے مجھے میری ماں سے چھیننے والی، ممتا سے محروم کرنے والی، میں اسے قتل کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔ سچ مچ حبیب۔۔۔۔!"

اس نے ڈاکٹر کا سابقہ خود ہی ہٹا دیا اب آنسو سرمئی جھیلوں کے کنارے سے باہر نکل آئے تھے۔

"اور میں۔۔۔۔" اس نے مٹھیاں کھولیں اور کہنیاں ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے آگے جھکی۔ میں اس کے بالکل مقابل ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھا تھا میں نے یکدم نگاہیں ہٹا لیں۔

"میں سوچتی ہوں کہ میں مر جاؤں۔۔۔۔ میں بھلا اب جی کر کیا کروں گی۔۔۔۔ مجھے گھن آتی ہے اپنے آپ سے اپنے وجود سے جانتے ہو حبیب! کیوں۔۔۔۔؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اس لیے کہ اس کمینے ممتاز نے مجھے اپنی حویلی میں بند کر دیا تھا اور پورا ایک ماہ نظر بند رکھا تھا۔"

میں چونکا یہ کیا کہہ رہی تھی وہ۔۔۔۔

"وہ میرے باپ کے خاندان کا تھا۔اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے میرے باپ
سے ملوا سکتا ہے اس لیے میں اس سے ملنے اس کی حویلی میں گئی تھی اور اس نے مجھے اپنے
کمرے میں بند کردیا تھا۔ وہ کہتا تھا اسکے خاندان کی لڑکیاں یوں گلیوں میں، ٹی وی
اسٹیشنوں پر اور اسٹوڈیو میں نہیں پھرتیں اور یہ صحافی ۔۔۔۔ گدھے ۔۔۔۔ انہوں نے
لکھا میں نے ممتاز ملک سے شادی کر لی ہے اور اب ممتاز ملک نے مجھ پر ٹی وی پر کام
کرنے کی پابندی لگا دی ہے۔ یہ صحافی قوم کہانیاں گھڑنے میں ماہر ہے میں جینا نہیں
چاہتی ۔۔۔۔" وہ زور زور سے چیخ کر رونے لگی میں گھبرا کر میز کے پیچھے سے نکل آیا۔

"ریلیکس مس ملائکہ پلیز ۔۔۔!"

لیکن وہ چیخنے لگی اس نے میرے گریبان کو پکڑ کر کھینچا۔

"تم ڈاکٹر ہو مجھے کچھ ایسی دوا دے دو کہ میں سکون پا لوں ابدی سکون ۔۔۔"

میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے بے اختیار پکڑ کر اپنا گریبان چھڑایا۔

"دیکھئے مس ملائکہ ۔۔۔! یہ زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے کہ اسے یوں ضائع
کردیا جائے ۔۔۔ کبھی کبھی زندگی انسان سے یوں ہی کھیل کھیلتی ہے ۔۔۔"

میں ہولے ہولے بول رہا تھا اس کے بالکل قریب، وہ پوری آنکھیں کھولے
مجھے سن رہی تھی اس کے لباس سے مسحور کن خوشبو آ رہی تھی اس کی قربت سے میں پگھلنے لگا تو
یکدم اس کے ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"بیٹھیے مس ملائکہ! آپ کا مسئلہ کوئی اتنا سنگین نہیں ۔۔۔ آپ کو زندہ رہنے کی
خواہش نہیں ہے میرے پاس ایسے مریض بھی آتے ہیں جنہوں نے ایک نہیں کئی بار خودکشی
کی کوشش کی لیکن بفضل خدا اب ٹھیک ٹھاک خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں ۔۔۔ آپ
بھی بہت جلد اس صورت حال سے نکل آئیں گی۔"

"اچھا ۔۔۔" اس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور اس کے چہرے پر فطرتی
معصومیت تھی میں نے اپنے دل میں اس کے لیے بے حد ہمدردی محسوس کی۔

"آپ ایک ذہین اور خوبصورت لڑکی ہیں اور زندگی یقیناً اپنے ہاتھوں میں آپ
کے لئے پھول لیے منتظر ہے۔ ہوسکتا ہے آنے والے دنوں میں ایک بار پھر ٹی وی کی

رین پر آپ کا راج ہو ۔۔۔"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں بھیگے بھیگے رخساروں اور بھیگی بھیگی پلکوں کے ساتھ
سکراتی ہوئی وہ بہت اچھی لگی۔ وہ بلاشبہ بہت خوبصورت تھی ۔۔۔۔ میں نے دل ہی دل
میں اسے سراہا اور پھر مس فاطمہ کو بلا کر اس کی فائل بنانے کو کہا۔

"شیڈول میں طے ہوا کہ اس ماہ میری اس کے ساتھ چار نشستیں ہوں گی ہر ہفتے
ے کلینک آنا ہوگا پھر اگلے ماہ ہم یہ نشستیں ایک ماہ میں دو کردیں گے اور پھر ہر ماہ
ایک ۔۔۔ لیکن حالات کے مطابق اس میں کمی بیشی بھی ہوسکتی ہے۔"

"اوکے ۔۔۔" وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئی اور کمرہ کتنی ہی دیر اس کی خوشبو سے
مہکتا رہا۔

ایک بار پھر میں اسے سوچ رہا تھا اس نے جو کچھ بتایا تھا اس میں کتنا سچ اور کتنا
جھوٹ تھا یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ ایک اچھے خاندان کی پڑھی لکھی
لڑکی ضائع ہو رہی تھی ۔۔۔ میں نے بہت خلوص سے اس کے متعلق نوٹس بنائے اور کافی
دیر مطالعہ کرتا رہا ۔۔۔ بہت کچھ تشنہ تھا اور آئندہ ہونے والی ملاقاتوں میں شاید میں اسے
اس خود ترسی سے نکال لیتا اور شاید وہ کچھ مزید بھی اپنے متعلق بتاتی ۔۔۔ لیکن آئندہ
ہونے والی تین چار نشستوں میں اس نے مزید کچھ نہیں بتایا تھا البتہ اس کے بیانات میں
کچھ تضاد آ گیا تھا۔

ایک روز اس نے کہا "وہ ممتاز ملک سے محبت کرنے لگی تھی اس لیے اس کے
پیچھے گئی تھی اس کی حویلی میں لیکن وہ حویلی کی پابندیوں میں رہ نہیں سکتی تھی اس لیے واپس
چلی آئی ۔۔۔"

اس کے بیانات بدلتے رہتے تھے میں اسے ٹوکے بغیر خاموشی سے سنتا رہتا تھا
ایک روز میں نے اس سے پوچھا "کہ اس کی پھوپھی اب کہاں ہے ۔۔۔؟"

تو اس نے بتایا "کہ وہ اپنے بیٹے کے پاس کینیڈا چلی گئی ہے۔ اس روز وہ بہت
روئی۔ کیا تھا اگر وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتی لیکن وہ مجھے ساتھ لے کر نہیں گئی وہ مجھے یہیں
دھکے کھانے کے لیے چھوڑ گئی ۔۔۔"

اسے میرے کلینک میں آتے ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے لیکن میں ابھی تک اس کو سمجھ نہیں پا رہا تھا ایک روز وہ ایک بات کہتی تو دوسرے روز خود ہی اسے رد کر دیتی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا وہ سب کچھ سچ نہیں کہہ رہی ہے۔

ایک روز کلینک میں آئی تو بہت بجی سنوری تھی۔ بلیو کلر کی ساڑھی باندھے بچ بچ دمک رہی تھی اس روز شیڈول میں اس کی سٹنگ نہ تھی میں تقریباً فارغ ہی تھا۔

''تم فارغ ہو حبیب۔۔۔!'' وہ بہت جلد آپ سے تم پر آ گئی تھی۔

''تقریباً۔۔۔''

''چلو کہیں لنچ کرتے ہیں، کسی اچھی سی جگہ پر، آج بڑے دنوں بعد میرا جی چاہا ہے کہ میں زندگی کو انجوائے کروں، دیر تلک ڈرائیو کروں، اچھا سا لنچ کروں، گانے سنوں، زندگی بہت خوبصورت ہے نا حبیب۔۔۔! اور موت بہت بھیانک۔۔۔'' اس نے جھرجھری لی۔

میں اس کے ساتھ یوں باہر جاتے ہوئے جھجکا۔ وہ ایک معروف اداکارہ بھی تھی اور اسکینڈل بنتے دیر ہی کتنی لگتی ہے لیکن وہ اداکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ میری مریضہ بھی تھی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں جو چمک اور ہونٹوں پر جس طرح زندگی مسکا رہی تھی میں اس میں زندہ رہنے کی جو امنگ جاگی تھی وہ چھین کر اسے دوبارہ موت کی طرف نہیں دھکیل سکتا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی گاڑی ہم نے پارکنگ میں ہی چھوڑ دی تھی اور وہ میرے ساتھ میری گاڑی میں ہی تھی۔ اس روز وہ بہت خوش تھی۔ اس نے بہت سی باتیں کیں اور میں حیرت سے اسے سنتا رہا۔ وہ بہت خوبصورت باتیں کر رہی تھی۔ اس کا لہجہ بھی ویسا ہی تھا۔ دھیما ٹھہرا ٹھہرا سا جیسا کہ میں نے ایک بار ٹی وی پر سنا تھا۔ اسے باتیں کرنے اور مخاطب کو اسیر کرنے کا ہنر آتا تھا میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔

''میں آج بہت خوش ہوں حبیب! اس طرح تمہارے ساتھ یہاں آ کر لنچ کرنا یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے مجھے۔۔۔'' اس نے کتنی ہی بار دہرایا۔

رات جب میں بستر پر لیٹا تو میری آنکھوں کے سامنے کئی بار اس کا چہرہ لہرایا۔

''کون کہہ سکتا ہے کہ اتنی معصوم اور سادہ دل لڑکی شوبز سے تعلق رکھتی ہے آج وہ

کتنی خوش ہو گئی تھی میرے ایک بار اس کے ساتھ چلے جانے سے۔۔۔ اسے اگر خوشی مل گئی ہے تو میرا کیا گیا ہے۔۔۔''

لیکن یہ صرف ایک بار کی بات نہ تھی اب وہ اکثر اپائنٹمنٹ کے بغیر بھی آ جاتی تھی۔ فارغ ہوتا تو ہم باتیں کرتے رہتے میں اسے اپنے امریکہ میں قیام کے دوران پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات سناتا۔۔۔ اپنے مریضوں کے متعلق بتاتا۔۔۔ وہ بھی یوں ہی باتیں کرتی رہتی، اپنی سہیلیوں کی، اپنے چھوٹے بھائی، ماں کی، پھوپھی کی اور پھوپھو زاد بھائی عرفان کی۔۔۔ جب وہ چھوٹا تھا ایک دو بار اس نے اپنے سوتیلے باپ کا بھی ذکر کیا تھا لیکن اس کے علاوہ اپنی ذات کے متعلق وہ زیادہ نہیں کھلتی تھی۔ ممتاز ملک کے متعلق اس نے دوبارہ بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اپنے سگے باپ کا ذکر کیا تھا۔ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ مریض کی حد سے نکل کر دوستی کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔

''تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔۔۔'' جب وہ معصومیت سے اپنی آنکھیں پٹپٹا کر کہتی تو میں سوچتا، کتنی عجیب بات ہے پاکستانی لڑکیاں بھی اب لڑکوں سے دوستی کرنے لگ گئی ہیں۔۔۔ دراصل میرے ذہن میں تو تیرہ چودہ سال پہلے کا پاکستان تھا۔

ایک روز وہ مجھے اپنے گھر لے گئی دراصل اس روز بھی میں اس کے بے حد اصرار پر لنچ کے لیے اس کے ساتھ جا رہا تھا لیکن مجھے ڈاکٹر مظہر سے کام تھا ایک مریض کی ضروری فائل بنانی تھی جو مجھے ڈاکٹر مظہر نے دی تھی۔ کئی بار ایسا ہوتا تھا کہ وہ مریضوں سے متعلق مجھ سے ڈسکس کر لیتا تھا سو ہم پہلے گلبرگ کی طرف چلے گئے مظہر کا کلینک گلبرگ میں تھا۔

''یہاں قریب ہی میرا گھر ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تو کیا خیال ہے آج لنچ باہر کرنے کے بجائے تمہارے گھر نہ کیا جائے؟''

وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی اور پھر اثبات میں سر ہلایا چھ سات منٹ بعد ہم اس کے گھر کے سامنے تھے۔ گھر اچھا تھا لیکن گھر کے اندر بے ترتیبی سی تھی، ڈرائنگ روم میں کشن نیچے کارپٹ پر پڑے تھے، صوفوں کے کور میلے ہو رہے تھے، ڈیکوریشن پیسز پر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں، ٹی وی لاؤنج میں ایک دس گیارہ سال کا بچہ وڈیو گیم لگائے بیٹھا تھا اس

نے ہمیں بس ایک دفعہ دیکھا تھا اور پھر گیم میں مصروف ہو گیا تھا۔ بچہ بے حد خوبصورت تھا میرا جی چاہا کہ میں رک کر اس سے بات کروں لیکن ملائکہ تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی تو میں بھی اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔

"تم بیٹھو حبیب! میں اماں کو بتاتی ہوں وہ اوپر ہوں گی بیڈ روم میں فلم دیکھ رہی ہوں گی وی سی آر پر، بہت شوق ہے انہیں فلمیں دیکھنے کا۔۔۔۔"

میں نے اس اثناء میں پورے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے لیا تھا۔ کارپٹ پر بھی جگہ جگہ داغ لگے ہوئے تھے چائے کے یا کسی اور چیز کے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ملائکہ کو گھر سے کوئی دلچسپی نہیں۔

میں ابھی ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہا تھا کہ وہ اپنی اماں کے ساتھ آ گئی۔ آج بھی اس روز کی طرح وہ بھڑکیلے رنگوں کے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ ہونٹوں پر تیز سرخ رنگ کی لپ اسٹک تھی۔ اس روز کی طرح آج بھی میں نے سوچا تھا کہ وہ عورت ماں نہیں لگتی پھر بھی میں احتراماً کھڑا ہو گیا۔

"ماں! یہ ڈاکٹر حبیب ہیں میں نے آپ سے ذکر کیا تھا نا؟"

"اچھا اچھا۔۔۔۔"

اس نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی۔

"میں سمجھی رفیق صاحب آئے ہیں۔۔۔۔"

"بیٹھیے ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔!"

اب وہ مجھے دیکھ رہی تھی میں بیٹھ گیا ملائکہ لاؤنج میں جا کر ملازم کو آواز دینے لگی جب کہ اس کی اماں مجھے بغور دیکھنے لگی۔

"اچھا کاروبار چلتا ہے۔۔۔۔"

"جی۔۔۔۔" مجھے اس کے سوال پر حیرت ہوئی۔

"میرا مطلب ہے کچھ مریض وغیرہ آتے رہتے ہیں۔۔۔۔"

"ابھی تو اسٹارٹ کیا ہے زیادہ پیشنٹ نہیں ہیں۔۔۔۔"

اس کے چہرے پر مایوسی کے رنگ بہت واضح تھے۔ تب ہی ملازم لڑکا کوک لے

اب بھی وہ ملائکہ کی ماں نہیں لگ رہی تھی بلکہ وہ سرے سے مجھے ماں ہی نہیں لگتی تھی۔

لیکن وہ ملائکہ کی ہی نہیں اس بے حد خوبصورت بچے کی ماں تھی جب ملائکہ نے بتایا کہ شیری بھائی ہے اس کا، تو مجھے بے حد حیرت ہوئی ملائکہ کی اور شیری کی عمر میں کم از کم بائیس سال کا تو فرق ضرور تھا وہ دس گیارہ سال کا تھا جب کہ ملائکہ مجھے اپنی عمر بتیس سال بتاتی تھی۔

"دراصل۔۔۔۔" وہ میری حیرت پا گئی۔

"اماں کو جب ابا نے طلاق دے دی تھی تو کئی سال اماں ماموں کے گھر رہیں لیکن کوئی بارہ سال پہلے ماموں نے اماں کی شادی کر دی تو شادی کے سال بھر بعد شیری پیدا ہوا۔۔۔۔"

"اور تمہارے سوتیلے والد۔۔۔۔" میں نے پوچھا۔

"دو تین سال پہلے اماں نے ان سے بھی علیحدگی اختیار کر لی ہے دراصل جب پھوپھی کے گھر سے میں اماں کے پاس آ گئی تو میرے سوتیلے والد نے اماں سے کہا کہ وہ مجھے واپس بھجوا دیں تو بس اسی بات پر اماں کا جھگڑا ہو گیا اب میں، شیری اور میری والدہ بس۔۔۔۔"

کھانا ہوٹل سے منگوایا گیا تھا غالباً۔ مٹن کڑاہی اور قورمہ ساتھ میں کھیر تھی مجھے کچھ خاص مزہ نہ آیا اس کی اماں کی باتیں مسلسل میرے اعصاب کو تھکا رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دونوں میں تلخ کلامی ہو جاتی تھی اس کے انداز گفتگو میں شائستگی مفقود تھی اس سے تو اچھا تھا کہ میں کسی ہوٹل میں ہی لنچ لے لیتا اگرچہ ہر بار دعوت ملائکہ ہی دیتی تھیں لیکن بل میں ہی دیا کرتا تھا۔

"شکر ہے آج کچھ ڈھنگ کا کھانا کھایا ہے۔۔۔۔"

میں لاؤنج میں کھڑا شیری سے باتیں کرتے ہوئے ملائکہ کا انتظار کر رہا تھا حسب معمول اس نے اپنی گاڑی میرے کلینک کے باہر پارکنگ میں چھوڑ دی تھی اور میری گاڑی میں یہاں تک آئی تھی۔

یہ اس کی اماں کی آواز تھی۔

"آہستہ بولو نا، حبیب سن لے گا۔۔۔۔"

"سن لے۔۔۔۔خود تو روز ہوٹلوں میں عیش کرتی ہو اور ہم یہاں قاسو کی پکائی سڑی ہوئی ماش کی دال اور آلو گوشت کا شوربہ کھا کھا کر۔۔۔۔"

شیری زور زور سے ہنسنے لگا، ہنستے ہوئے وہ اور پیارا لگ رہا تھا۔

"اماں جھوٹ بولتی ہے کل رات آپا سو گئی تھی تو انکل رفیق کے ساتھ اماں ہوٹل سے کھانا کھا کر آئی تھیں۔"

میں نے اس کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔"اور تم اپنی ماں کے راز کھول رہے ہو۔۔۔۔"

"یہ تو آپ کو بتایا ہے آپ آپا کو نہ بتایئے گا ورنہ دونوں میں لڑائی ہو جائے گی۔"

"اچھا نہیں بتاؤں گا۔۔۔۔"

میں نے وعدہ کیا تو وہ مسکرایا اور واپس اپنی جگہ پر بیٹھ کر پھر سے وڈیو گیم آن کرنے لگا۔اس روز ملائکہ کو اس کی گاڑی کے پاس ڈراپ کرتے ہوئے میں نے سوچ لیا کہ آئندہ کبھی ملائکہ کے گھر نہیں جاؤں گا لیکن چار دن بعد ہی مجھے اس کے گھر جانا پڑا اس روز میں کلینک پہنچا ہی تھا کہ مجھے اس کا فون آیا۔

"حبیب! میں سلیپنگ پلز کھانے والی ہوں۔۔۔۔"

"لیکن کیوں؟ کیا ہوا بھئی۔۔۔۔؟" میں نے گھبراہٹ کے باوجود لہجے کو خوشگوار رکھا۔

"بس۔۔۔۔مجھے اور نہیں جینا یہ بھی کوئی زندگی ہے حبیب۔۔۔۔!" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"تم میرے اچھے دوست ہو حبیب! تمہارے علاوہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں اس لیے تمہیں خدا حافظ کہنے کے لیے فون کیا ہے۔خدا حافظ حبیب! تم بہت اچھے ہو مجھے یاد رکھنا۔۔۔۔"

"سنو ملائکہ۔۔۔۔!" لیکن اس نے فون بند کر دیا میں نے تین چار بار اس کا نمبر ملایا لیکن شاید اس نے ریسور کریڈل سے ہٹا دیا تھا۔دوسرے ہی لمحے میں اپنے کلینک

سے نکلا اور میری گاڑی آندھی طوفان کی طرح اس کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

ملازم لڑکے نے گیٹ کھولا تو میں سیدھا گاڑی اندر لے گیا۔پھر تقریباً بھاگتا ہوا ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا ملازم لڑکا میرے پیچھے تھا۔

"ملائکہ کہاں ہے۔۔۔۔؟"

"اوپر کمرے میں ہوں گی۔۔۔۔"

سیڑھیاں لاؤنج سے ہی اوپر جا رہی تھیں میں بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا اور پھر ایک لمحے رک کر میں سیدھا ایک کمرے کی طرف چلا گیا میرا اندازہ صحیح تھا وہ ہی ملائکہ کا بیڈ روم تھا آسمانی رنگ کی نائٹی پہنے وہ بیڈ پر بیٹھی تھی پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا اور ہتھیلی پر ڈھیر ساری گولیاں۔۔۔۔

"ملائکہ یہ کیا کر رہی ہو۔۔۔۔؟" میں نے ہاتھ مار کر گولیاں گرا دیں۔

"تم حبیب۔۔۔۔! تم۔۔۔۔!"

"ہاں میں۔۔۔۔"

میں نے اپنا چڑھا ہوا سانس درست کیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"یہ کیا حماقت ہے۔۔۔۔؟"

"یہ حماقت نہیں حبیب! یہ کام جو میں آج کرنے والی ہوں مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔۔۔۔"

"پاگل ہو تم۔۔۔۔"

"میں پاگل نہیں ہوں بتاؤ کیا ہے میرے لیے اس دنیا میں؟ کیا ملا ہے مجھے اور میں کس کے لیے جیوں، کوئی تو جواز ہو میرے پاس جینے کا، کوئی آسرا، کوئی محبت کی آس، کچھ تو۔۔۔۔"

"تم مجھے اپنا دوست کہتی ہو ملائکہ! اور میرے ہوتے ہوئے تم یہ بھی کہہ رہی ہو کہ تمہارا کوئی نہیں۔۔۔۔کیا میں کچھ نہیں۔۔۔۔؟"

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی پھر اس نے نظریں جھکا لیں۔

"حبیب تم۔۔۔۔!" اس نے نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبا دیا۔

اس روز میں بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا اور جب اٹھا تو اس سے وعدہ لے چکا تھا کہ وہ آئندہ ایسا کچھ نہیں کرے گی پھر اس کے بعد بھی میں دو تین بار اسکے گھر گیا۔

ایک بار جب شیری سیڑھیوں سے گر گیا تھا اس کی گاڑی ورکشاپ میں تھی اور اس نے مجھے فون کیا تھا اور دوبارہ جب وہ تین ہفتے تک سٹنگ میں نہیں آئی تو میں اس کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا اور جتنی بار بھی میں اس کے گھر گیا اس کی ماں کو یونہی چکیلے اور بھڑکیلے لباس میں دیکھا اور غالباً یہ جو اس کی شخصیت میں الجھاؤ تھا اسکی وجہ اس کی ماں کا رویہ تھا۔

وہ اپنی ماں سے اختلافات بھی کرتی تھی لیکن پھر اس کی بات آخر مان بھی لیتی تھی ماں سے بات کرتے ہوئے اس کا لب ولہجہ یکدم بدل جاتا وہ اسی لہجے میں گفتگو کرتی تھی جس میں اس کی ماں کرتی تھی۔

اگر وہ اپنی ماں سے الگ ہو جائے تو شاید اس کی شخصیت کی گرہیں کھل جائیں کہیں ۔۔۔۔کسی اور ماحول میں ۔۔۔۔لیکن کیسے ۔۔۔۔؟ کون اسے اس ماحول سے باہر نکالے ۔۔۔۔؟

اگر ملائکہ کی شادی ہو جائے کسی اچھے شخص سے جو اسے محبت دے، جو اس کے ساتھ مخلص ہو، وہ جو اس کے اندر نارمل زندگی گزارنے کی امنگ پیدا کرے۔

میرے دل کی زمین پر اچانک ہی خیال اگ رہا تھا ایک لمحہ کے لیے تو اپنے اس خیال پر میں خود بھی حیرت زدہ ہو گیا تھا کیا میں ملائکہ سے شادی کر لوں؟ کیا میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں؟ اور وہ جو میرے دل میں دھرنا مار کر بیٹھی ہے، نہیں مجھے ملائکہ سے محبت نہیں کرنی، مگر میں اتنی پیاری لڑکی کو ضائع ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا، ان دنوں وہ پھر غائب رہنے لگی تھی۔ دو دو ہفتے کلینک آتی نہ فون کرتی، اپنے شیڈول کے مطابق سٹنگ کے لیے بھی نہ آتی تھی۔

"کہاں گم ہو ملائکہ ۔۔۔۔؟"

"کہیں نہیں ۔۔۔۔" وہ گول مول سا جواب دیتی۔

"آج ڈنر کے لیے چلو ۔۔۔۔"

"آج موڈ نہیں ۔۔۔۔"

میں تین بار گھر گیا تو عجیب سے حلیے میں بیٹھی تھی گندے، میلے کپڑے، بکھرے الجھے بال ۔۔۔۔

"یہ کیا بوریت ہے ملائکہ ۔۔۔۔!" وہ بس ہنس دیتی عجیب طرح کی ہنسی۔

"شاید وہ ایک بار پھر مایوس ہو رہی ہے ۔۔۔۔" میں نے سوچا۔

"کہیں وہ پھر خودکشی کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ کتنی مشکلوں سے تو میں اسے زندگی کی طرف لایا تھا ۔۔۔۔"

"تو کیا میں ۔۔۔۔؟"

ان دنوں گھر میں ایک بار پھر اماں اور بابا کے درمیان میری شادی موضوع گفتگو تھی۔ اماں نے کوئی لڑکی دیکھی تھی۔ اچھی تو ہے لیکن مریم جیسی نہیں ہے اماں کا اصرار تھا کہ جہاں اتنا انتظار کیا تھوڑا اور کر لیں اماں کہہ رہی تھیں۔

"کہ بھائی صاحب اگلے ماہ تک آنے والے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے بھانجے کا پرپوزل قبول کر لیں ۔۔۔۔"

"بیگم یہ انتظار چھوڑ دو بس ۔۔۔۔"

"اچھا میں حبیب سے پوچھ لوں پھر بات چلاتی ہوں ۔۔۔۔"

اور جب اماں نے مجھے پوچھا تو میرے لبوں پر ملائکہ کا نام آتے آتے رہ گیا۔

"نہیں اماں سے بات کرنے سے پہلے ملائکہ سے بات کر لوں ۔۔۔۔"

میں نے بالآخر اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس روز میں فاؤنٹین ہاؤس گیا تو مجھے راجہ نواز مل گیا۔ بچپن کا دوست تھا وہ آج کل کسی اخبار سے منسلک تھا اور کسی سروے کے سلسلے میں فاؤنٹین ہاؤس آیا تھا۔

چند دن پہلے مظہر نے مجھے تیرا بتایا۔ روز سوچتا رہا تیری طرف آنے کو، وہ بڑی گرم جوشی سے ملا سروے سے فارغ ہو کر ہم ایک کافی ہاؤس میں آ بیٹھے وہ ہمیشہ کی طرح بے تکلف تھا لگتا نہیں تھا کہ بیچ میں اتنے ماہ وسال بیت گئے ہیں حالانکہ اسے پہچاننے

میں مجھے کچھ دیر لگی تھی۔

''کیسے ہو۔۔۔۔؟''اس نے پوچھا۔

''اکیلا ہوں۔۔۔۔''میں مسکرایا۔

''تم سناؤ۔۔۔۔''

''میں تو دو عدد چیاں میاں کا والد محترم بن چکا ہوں تیسرے کی آمد ہے۔''اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''یعنی تم ابھی تک اپنی نفری بڑھانے والی تھیوری پر یقین رکھتے ہو؟''وہ فیملی پلاننگ کے لیے خلاف لمبی لمبی تقریریں کرتا تھا۔

''بھئی میرا تو خیال ہے مسلمانوں کو نفری بڑھانی چاہیے بے چارے یوں ہی ہر طرف مارے جارہے ہیں۔۔۔۔''

''نہیں۔۔۔۔''وہ ہنس دیا۔

''تمہاری بھابھی نے وارننگ دے دی ہے کہ یہ آخری ہے۔ ویسے یار! تمہیں شادی کرلینی چاہیے۔۔۔۔''

''سوچ رہا ہوں۔۔۔۔''

''کوئی پسند کرلی ہے۔۔۔۔؟''

''بس یہی سمجھ لو۔۔۔۔''

''کیسی ہے وہ؟ جان من! کہاں ملی تھی۔۔۔۔؟''

نوازش بچوں کی طرح آنکھیں مٹکانے لگا۔

''اب الف سے ے تک بک دے۔۔۔۔''اس نے میری پیٹھ پر بے رحمی سے مکا مارا، وہی پرانا انداز اور بالکل بچپن کی طرح۔ میں نے اسے سب کچھ بتادیا۔ وہ بچپن سے ہی میرا راز دار دوست تھا یعنی تمہارا مطلب ہے کہ ملائکہ محب اللہ خان ماضی کی اداکارہ۔

''ہاں یار! وہ بڑی مظلوم لڑکی ہے بتایا تو ہے میں نے تمہیں۔۔۔۔''

''بکواس۔۔۔۔''اس نے میز پر زور سے ہاتھ مارا۔

''بالکل بکواس۔۔۔۔''

''جو کچھ تم نے بتایا ہے ستر فیصد جھوٹ ہے اس میں، ممتاز ملک ملائکہ محب اللہ خان کا دوسرا شوہر ہے اور بچہ شہریار ملائکہ کا بیٹا ہے۔ جسے وہ اپنا بھائی ظاہر کرتی ہے پہلی شادی اس نے شوبز کی دنیا میں آنے سے پہلے کی تھی۔ اپنے ماموں زاد سے اور یہ بچہ پہلی شادی سے ہے۔''

میں ساکت بیٹھا تھا۔

''تم یہ کیسے جانتے ہو۔۔۔۔؟''میری آواز دھیمی تھی۔

''میں تو اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں اور رہی کیسے۔۔۔۔ کی بات تو بیٹا صحافی ہوں تمہیں اس ڈرامائی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہیے۔ تمہارے بابا تمہیں گوریوں سے اس لیے بچا کر نہیں لائے کہ تم کالیوں کے جال میں پھنس جاؤ۔۔۔۔ ملائکہ کی ماں ایک لالچی عورت ہے وہ تو تمہیں بیچ کر کھا جائے گی اور خود ملائکہ اتنی مظلوم نہیں جتنی ظاہر کرتی ہے اپنی پھوپھو کا گھر اس نے ماں کے کہنے پر چھوڑا ہے کیونکہ پھوپھو اس کی ماڈلنگ کے خلاف تھی۔''

میں نے راجہ نوازش کی ساری باتیں سنیں لیکن مجھے اس میں ملائکہ کا کوئی قصور نظر نہیں آتا تھا میں اب بھی سوچ رہا تھا کہ مجھے شادی تو کرنا ہی ہے پھر ملائکہ سے ہی کیوں نہ کرلوں جہاں تک شیری کی بات ہے ایک پیارا لڑکا ہے مجھے تو یوں بھی اچھا لگتا ہے اگرچہ مجھے نوازش کی بات پر یقین نہیں آیا تھا یہ صحافی ویسے بھی کہانیاں بنانے کے ماہر ہوتے ہیں پھر بھی اگر ایسا تھا بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔

''کمال ہے یار! تم اتنے بے وقوف ہوگئے مجھے اندازہ نہیں، آج کل پندرہ دن پہلے تک تو اس کا رفیق ہمدانی سے بہت بڑا زبردست افیئر چل رہا تھا ایک ماہنامے نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ دونوں نے خفیہ شادی کرلی ہے۔ شاید خود رفیق ہمدانی نے ایک صحافی کو بتایا ہے کہ وہ دونوں عنقریب شادی کرنے والے ہیں تم کس دنیا میں رہتے ہوں میرے یار۔۔۔۔!''

اس کی باتوں نے مجھے بوکھلا دیا تاہم میں نے اسے ڈانٹ دیا کہ تم صحافی بے پر

کی اڑاتے ہو۔ پچھلے چھ ماہ سے میرا مسلسل اس سے رابطہ ہے اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ ضرور مجھ سے ذکر کرتی اور پھر اسے خواب آور گولیاں کھانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

''خیر تم جا کر آج اس سے پوچھنا۔۔۔۔'' راجہ نوازش نے بات ختم کر دی تھی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ میں آج اسے پرپوز کر دوں تو زیادہ بہتر ہے اس سے بات کر کے پھر بابا سے بات کرلوں۔

شیری ٹی وی لاؤنج میں تھا لیکن خلاف معمول ٹی وی دیکھنے یا وڈیو گیم کھیلنے کے بجائے وہ صوفے پر دونوں پاؤں رکھے یوں بیٹھا تھا کہ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھا تھا۔

''ہیلو۔۔۔۔'' میں بے تکلفی سے ٹی وی لاؤنج میں چلا گیا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے یار۔۔۔۔؟''

میں نے اس کے بال بکھیرے اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پلکیں بھیگی بھیگی سی تھیں وہ میرے آنے سے پہلے رویا تھا۔

''کیا بات ہے کیا مما سے ڈانٹ پڑ گئی۔۔۔۔؟''

میں نے خوش گوار لہجے میں پوچھا لیکن اس نے میری بات کا جواب نہ دیا اور سر جھکا لیا تب ہی اوپر سے چیختی ہوئی ملائکہ کی آواز آئی۔

''شیری کی خبر گیری کرتی ہو تو کون سا احسان کرتی ہو مجھ پر، تم ہی چاہتی تھی کہ میں تمہارے بھتیجے سے شادی کرلوں۔۔۔۔ اور پھر تم ہی نے طلاق بھی دلوائی تھی اور تم نے ہی کہا تھا کہ میں کسی کو نہ بتاؤں کہ شہریار میرا بیٹا ہے ورنہ ٹی وی والے مجھے چانس نہیں دیں گے، میں نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ میں شہریار کا رشتہ لوگوں سے چھپاؤں وہ میرا بیٹا ہے، لیکن تم نے اسے مجھ سے چھین لیا۔۔۔۔''

میں ساکت کھڑا تھا راجہ نوازش کی ایک بات تو سچ ثابت ہوگئی تھی شہریار ملائکہ کا بیٹا ہے میں نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا اس نے اب اپنا سر تقریباً گھٹنوں میں دے لیا تھا۔ اور ہولے ہولے رو رہا تھا۔

''تو میں ہی اب کہہ رہی ہوں کہ دے آؤ اسے اس کے باپ کو نہیں سنبھال سکتی

ہیں اسے۔۔۔۔'' یہ اس کی ماں کی آواز تھی۔

''کیا سنبھالتی ہیں اسے؟ کھانا کھلاتی ہیں؟ نہلاتی ہیں؟ کیا کرتی ہیں؟ نوکر ہے اس کے کام کے لیے، اخراجات میں دیتی ہوں۔'' ملائکہ کی آواز پہلے سے زیادہ بلند تھی۔

''تم کیا اخراجات دوگی، تمہارے پاس کیا ہے، کیا سمجھتی ہو کہ ممتاز ملک سے لیا ہوا روپیہ اب تک چل رہا ہے، وہ تو ختم ہوگیا، یوں بھی بینک میں تمہارا اکاؤنٹ خالی ہو چکا ہے ملائکہ بی بی۔۔۔۔! اسی لئے تو کہتی تھی کہ اس رفیق ہمدانی کو پھنسا لے جال میں، اونچی اسامی ہے ذرا عمر کا زیادہ ہے تو کیا ہوا؟ مگر تو اس ٹٹ پونجے ڈاکٹر پر مر رہی تھی، بھاگ بھاگ کر اس کے کلینک جاتی تھی وہ بے چارہ یہاں گھنٹوں تمہارے انتظار میں سڑتا رہتا تھا اور تم وہاں۔۔۔۔''

''میں اس پر مرتی نہیں تھی علاج کروا رہی تھی اس سے اور یہ تمہارا رفیق ہمدانی صرف وقت گزار رہا تھا، شادی وادی نہیں کرنی تھی اس نے مجھ سے، صاف کہہ دیا تھا کہ جوان بچوں کے ہوتے ہوئے وہ شادی نہیں کر سکتا۔''

''کم بخت! مجھے تو کہتا تھا کہ ملکی سے شادی کروں گا۔ تیرے اس ڈاکٹر کا کاروبار چلا گیا؟'' اس کی آواز کی تلخی کم ہوگئی وہ غالباً اوپر سیڑھیوں کے قریب ہی لاؤنج میں بیٹھی تھیں کہ آواز صاف آ رہی تھی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

''اماں! تیری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی، کاروبار چلے یا نہ چلے، مگر وہ تیرے رفیق ہمدانی سے کم نہیں ہے، کروڑوں کی جائیداد ہے اس کی۔۔۔۔''

''تو شادی کرلے گا تجھ سے۔۔۔۔؟'' اس کی آواز میں اشتیاق تھا۔

''پتا نہیں۔۔۔۔'' ملائکہ کے لہجے میں بے زاری تھی۔

''دیکھ ملکی! تیرے ہی فائدے کو کہتی ہوں کہ کسی طرح راضی کرلے اس کو۔ ہائے کیا خواب نہیں دیکھے تھے میں نے کہ تو فلمی دنیا پر راج کرے گی، کروڑوں میں کھیلے گی، پر ہائے قسمت! ہائے صادق! تیرا کچھ نہ رہے تو نے میری شہزادی کو برباد کر دیا۔۔۔۔'' اب اس کی آواز میں رقت تھی۔

"مت نام لے اماں اس کا، میرا خیال ہے حبیب بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اسے شیری سے بھی لگاؤ ہے۔۔۔۔"

"ہائے ہائے شیری کا مت بتانا اسے کہ وہ تمہارا بیٹا ہے، میں سینے سے لگا کر رکھوں گی، جگر کا ٹکڑا ہے میرا وہ، یوں ہی غصے میں بک جاتی ہوں جانو! بس تم ہر مہینے اس کا خرچہ دے دیا کرنا مجھے، اتنا امیر ہے تیرا ڈاکٹر تو بیس پچیس ہزار مہینہ کیا مشکل ہوگا۔"

"تو فکر نہ کر زیادہ ہی دے دیا کروں گی۔۔۔۔" اب دونوں نارمل انداز میں باتیں کر رہی تھیں اور آواز بھی اتنی بلند نہ رہی تھی۔ اسی لیے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ شاید وہ مستقبل کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ایک نظر شہریار کی طرف دیکھا اس نے سر بدستور گھٹنوں میں دے رکھا تھا لیکن وہ ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

میں کچھ دیر تاسف اور ہمدردی سے اسے دیکھتا رہا اس سارے معاملے میں اس بچے کا کیا قصور ہے؟ بکھر رہا تھا، میرا دل چاہا اسے سینے سے لگا کر پیار کروں، تسلی دوں، مگر میں خاموشی سے ٹی وی لاؤنج سے باہر نکلا۔ گیٹ پر دودھ کے پیکٹ، ڈبل روٹی اور انڈے کے شاپر ہاتھ میں لیے ملازم لڑکا ملا شاید گیٹ اسی لیے کھلا تھا۔

"ارے صاحب آپ کب آئے۔۔۔۔؟"

"بس ابھی آیا ہوں۔۔۔۔"

"بی بی صاحبہ تو گھر پر نہیں ہیں۔۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔"

شاید اسے یہی ہدایت ملی ہوئی ہوگی۔ بے اختیار مسکراہٹ کو روکتے ہوئے میں گیٹ سے باہر نکل آیا۔ اس کے بعد میں ملائکہ سے کبھی نہیں ملا۔ میں نے وہاں شیری کے پاس کھڑے کھڑے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے ملائکہ سے شادی نہیں کرنی۔

راجہ نوازش صحیح کہتا ہے کہ بابا مجھے اس لیے گوریوں سے بچا کر نہیں لائے کہ میں کالیوں کے جال میں پھنس جاؤں۔ ملائکہ ایسی لڑکی نہیں ہے جیسی لڑکی بابا میرے لیے چاہتے تھے۔ تاہم میرے دل میں ایک ملال سا تھا میں اس لڑکے کے حالات پر افسردہ تھا اور ممکن ہے اگر میں ملائکہ سے پھر ملتا تو میں پگھل جاتا۔ بہر حال میرے دل میں اس کے

لیے ایک نرم گوشہ ضرور تھا مگر ہوا یوں کہ دوسرے روز ہی مجھے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے کراچی جانا پڑ گیا۔

ڈاکٹر ظفر مجھے اس کے لیے کئی دن پہلے سے کہہ رکھا تھا اور پھر وہیں کراچی میں ہی دواؤں کی ایک کمپنی کی طرف سے میں اور ڈاکٹر ظفر ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے ہالینڈ چلے گئے۔ ہالینڈ میں تو ہفتے بھر کا قیام تھا لیکن واپسی پر ڈاکٹر مظہر نے انگلینڈ کا پروگرام بنا لیا جہاں اس کے بھائی بھابھی رہتے تھے۔

"چلو یار! کچھ دن انگلینڈ کی بھی سیر کر لیں۔۔۔۔"

اس طرح یہ ٹور تقریباً مہینے بھر کا ہو گیا۔ جب واپس آیا تو اماں خوشی خوشی میری بری کی تیاریوں میں مصروف تھیں مریم کے گھر والوں نے ہاں کر دی تھی۔

مریم واقعی ایک ایسی لڑکی تھی جس کی رفاقت پر فخر کیا جا سکتا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اچھی تھی۔ بابا اور اماں کا بیٹیوں کی طرح خیال رکھتی تھی۔ بابا اماں خوش تھے۔ تو میں بھی مطمئن تھا۔ ہاں کبھی کبھی جائمہ حارث کا خیال آتا تو دل میں کسک سی اٹھتی تھی اور ساتھ ہی پتا نہیں کیوں ملائکہ کی محبت کا تصور بھی چلا آتا۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہوگی؟ کیا کر رہی ہوگی؟ کیا پتہ اسے کوئی دولت مند اسامی ملی یا نہیں وہ اور اس کا بیٹا شیری جسے وہ اپنا بھائی کہتی تھی۔ میں نے ملائکہ سے محبت نہیں کی تھی مجھے شاید اس سے ہمدردی تھی یا پھر پتا نہیں کیا تھا؟ محبت تو میں نے جائمہ حارث سے کی تھی لیکن عجیب بات ہے مریم سے شادی کے بعد میں نے جائمہ کو اتنا نہیں سوچا جتنا ملائکہ کو۔۔۔۔ یہ نہیں کہ میں اپنی زندگی سے مطمئن نہیں تھا یا مجھے کسی طرح کا کوئی پچھتاوا تھا لیکن پھر بھی مجھے کبھی کبھی ملائکہ محبت اللہ بے تحاشہ یاد آتی، وہ انوکھی سی لڑکی جس کی زندگی کے نہ جانے کتنے رخ تھے۔۔۔۔ بہت مہذب اور شائستہ۔۔۔۔ جاہل اور منہ پھٹ۔۔۔۔ ظالم، مظلوم اور۔۔۔۔ بے بس اور نفسیاتی مریض، وہ جو کچھ بھی تھی بہر حال میں اسے بھولا نہیں تھا۔

سات سال گزرنے کے بعد بھی نہیں اب جب کہ میرے دو پیارے پیارے بچے ہیں، مریم جیسی بیوی ہے، مجھے اعتراف ہے کہ مریم نے زندگی کا ہر سکھ دیا ہے مجھے، اگر میری شادی جائمہ یا ملائکہ سے ہوتی تو میں اتنا پرسکون اور مطمئن نہ ہوتا۔

مریم سے شادی کے بعد میں کراچی منتقل ہوگیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں بابا کی کافی جائیداد تھی اور وہ ایک ہاؤسنگ سکیم شروع کرنا چاہتے تھے۔ کراچی آنے کے بعد کچھ عرصہ تک راجہ نوازش اور ڈاکٹر مظہر سے رابطہ رہا پھر ٹوٹ گیا۔

ان سات سالوں میں دوبار میں چند ماہ کے لیے اسد بھائی کے پاس امریکہ بھی گیا۔ جو نے ایک انڈین سے شادی کر لی تھی لیکن دونوں میں جھگڑا رہتا تھا جو سے میری ملاقات اتفاقیہ ہوئی تھی وہ اسٹور سے وائن خرید رہی تھی۔ اپنے متعلق بتاتے ہوئے اس نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ پاکستان آ کر بھی میں کتنے دن ڈسٹرب رہا۔

خیر میں تو ملائکہ کا ذکر کر رہا تھا کہ ان سات سالوں میں مجھے ملائکہ کے متعلق بالکل کچھ پتا نہیں چلا۔ لوگوں نے واقعی اسے بھلا دیا تھا، کہیں اخبار میں میری نظر سے اس کا نام نہیں گزرا تھا، شاید اگلے چند سالوں میں میں بھی اسے بھول جاتا کہ مجھے اچانک ایک روز طارق روڈ کراچی کی ایک شاپ سے باہر آتا راجہ نوازش مل گیا۔ میرا دھیان اپنے بیٹے ایمل کی طرف تھا کہ برسوں پہلے کی طرح اس نے پیچھے سے میری پیٹھ پر تھپڑ جڑا۔

"ارے کیسے ہو۔۔۔۔؟"

"او یار۔۔۔۔!"

میں تڑپ کر مڑا تو وہ بازو پھیلائے کھڑا تھا اور کچھ ہی دیر بعد ہم ایک ہوٹل میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو بیتے سالوں کی روداد سنا رہے تھے اس نے بتایا کہ ڈاکٹر مظہر اپنے بھائی کے پاس انگلینڈ چلے گئے ہیں اور وہ خود دو تین سال سے کینیڈا میں سیٹل ہے۔

"مگر یار! تم تو ملک سے باہر جانے کے خلاف تھے۔۔۔۔" مجھے حیرت ہوئی۔

"بس یار! کیا بتاؤں خواہشیں، آرزوئیں بھگائے پھرتی ہیں، طلب بڑھتی جاتی ہے۔" ایمل اسی ہوٹل میں بنے بچوں کے حصے کی طرف چلا گیا تھا جہاں جھولے وغیرہ اور بچوں کی دلچسپی کی دوسری چیزیں تھیں۔

"کراچی میں کب تک قیام ہے۔۔۔۔؟"

"بس دو تین روز مزید۔۔۔۔ پھر کچھ دن گاؤں رہ کر واپس کینیڈا۔۔۔ دراصل

بچے اور بیگم تو وہیں ہیں، میں دادا کی وفات پر آیا تھا، خیر تم سناؤ بھابی کیسی ہیں؟ اور کیسی گزر رہی ہے۔۔۔۔؟"

"بہت اچھی۔۔۔۔۔" میں نے بے حد آسودہ لہجے میں بتایا تو وہ مسکرا دیا۔

"ملائکہ تو یاد نہیں آتی۔۔۔۔؟"

"یادوں کا کیا ہے یار۔۔۔۔!" میں بھی مسکرایا۔

"سچ بتا کیا تو اس سے محبت کرنے لگا تھا۔۔۔۔"

"پتا نہیں۔۔۔۔ لیکن شاید میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا یا مجھے اس سے ہمدردی ہوگئی تھی۔۔۔۔ اسے تم محبت نہیں کہہ سکتے۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔ ترس تو مجھے بھی اس پر بہت آیا تھا جب میں نے اسے مینٹل ہاسپٹل میں دیکھا تھا۔۔۔۔" مجھے شاک سا لگا۔

"ہاں ان دنوں وہ مکمل طور پر دیوانگی کا شکار تھی۔ بعد میں اس کی حالت کچھ بہتر ہوگئی تھی۔ آج کل وہ فاؤنٹین ہاؤس میں ہے۔ ڈاکٹر مظہر جب یہاں سے گئے تھے دو سال قبل تو تب وہاں اسے اس کی پھوپھو نے ایڈمٹ کروایا تھا اور وہ ابھی تک وہیں ہے چند دن ہوئے میں نے ایک فلمی ہفت روزے میں پڑھا تھا۔۔۔۔"

"اور شیری۔۔۔۔؟" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔

"میرا مطلب ہے۔۔۔۔ اس کا بیٹا۔۔۔۔"

"وہ پہلے تو اپنے باپ کے پاس تھا لیکن پھر ملائکہ کی پھوپھو اسے لے گئی اور آج کل وہ کینیڈا میں ہے دو تین بار میری ملاقات ہوئی ہے اس سے بہت مطمئن ہے اور خوش ہے۔"

میں نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس سے انس ہوگیا تھا کبھی کبھی زندگی بعض لوگوں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتی ہے حالانکہ وہ اس کے مستحق نہیں ہوتے۔ جیسے ملائکہ محب اللہ خان کے ساتھ زندگی نے کیا حالانکہ وہ اس کی مستحق نہ تھی۔ میں نے اپنے دل میں اس کے لیے گہرے درد کو پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔

اس روز جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو غیر ارادی طور پر میں نے اس کے متعلق

شروع سے آخر تک ہر بات سوچ ڈالی۔ میں نے سوچا کہ میں ملائکہ کی کہانی لکھوں جیسا کہ شروع میں آپ کو میں نے بتایا ہے کہ میں کبھی کبھی کہانیاں لکھتا ہوں، بلکہ لکھتا تھا، کسی بھی نفسیاتی پرابلم پر، زیادہ تر میری کہانیوں کا مرکزی کردار کوئی سچا واقعہ ہی ہوتا تھا۔ کچھ دن پہلے ہی مجھ سے میرے میگزین کے ایڈیٹر ملے تھے اور وہ گلہ کر رہے تھے کہ میں نے تو بالکل ہی لکھنا چھوڑ دیا ہے اور میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں لکھوں گا ایک روز مریم نے بھی کہا تھا کہ مجھے لکھنا چاہیے، میں لکھنے کے ہنر سے آشنا ہوں۔

میں نے ملائکہ سے کہا تھا کہ اس کی کہانی لکھوں گا۔ تو میں نے قلم اٹھایا لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا لکھوں، میں نے کلینک سے ملائکہ کی فائل نکلوالی تھی اسکی کیس ہسٹری میرے سامنے تھی لیکن چار روزہ سٹنگ میں اس نے اپنے متعلق زیادہ نہیں بتایا تھا میں اس کے متعلق اتنا بھی نہیں جانتا تھا جتنا راجہ نوازش اور ڈاکٹر مظہر جانتے تھے۔ میرے پاس تو لکھنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا بس چند ادھوری باتیں ادھوری معلومات۔۔۔۔

اگلے روز نوازش میرے گھر آیا تو میں نے کہا میں ملائکہ سے ملنے جاؤں گا، راجہ! تم چلو گے میرے ساتھ۔۔۔۔۔؟"

راجہ نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی اندر تک اترتی ہوئی۔

"تم اب بھی اس سے محبت کرتے ہو۔۔۔۔۔" اس نے پوچھا۔

اس نے پورے یقین سے کہا تھا مگر میں خاموش ہی رہا۔

"ہاں۔۔۔۔وہ ایسی تھی کہ اس سے محبت ہو جاتی تھی خود بخود ہی، ایک بار میں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا تھا، لیکن پھر میں نے خود کو سنبھال لیا، ان دنوں میں نے اس کا ایک انٹرویو لیا تھا اپنے اخبار کے لیے اور میری اس سے دوستی ہو گئی تھی۔ میں کئی بار اس سے ملا تھا۔۔۔۔"

میں نے اس کی بات پر تبصرہ کیے بغیر اپنا سوال دہرایا۔

"چلوں گا۔۔۔۔۔" اس نے سانس کھینچی اور پھر وہیں سے گاؤں چلا جاؤں گا۔

"او کے۔۔۔۔ میں لاہور کے لیے سیٹ بک کروا لیتا ہوں۔۔۔۔۔" راجہ نوازش نے سر ہلا دیا۔

لیکن ہم جتنی دیر ساتھ رہے وہ کھوجتی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ صحافی تھا نا اندر تک اتر جانے والی نظر رکھنے والا۔ لیکن وہ میرے اندر ملائکہ کے لیے کوئی ایسا جذبہ نہ تلاش کر سکا۔ جسے وہ محبت کا نام دے سکتا اور وہ پاتا بھی کیسے؟ خود مجھے نہیں معلوم کہ میں نے ملائکہ سے محبت کی تھی یا نہیں۔۔۔۔۔

آج جب میں اس کی کہانی لکھ رہا ہوں تب بھی میں نہیں جانتا کہ مجھے اس سے محبت تھی یا محض ہمدردی۔ پہلی ملاقات سے لیکر آج تک میں یہی سمجھتا رہا ہوں کہ میری پہلی محبت جائمہ حارث تھی لیکن پتا نہیں کیوں ان بیتے سات سالوں میں جتنا میں نے جو کو سوچا اتنا ہی ملائکہ کو بھی سوچا۔

ڈاکٹر لطیف ابھی تک فاؤنٹین ہاؤس میں ہی تھے۔ بہت دیر ان کے آفس میں بیٹھ کر باتیں ہوتی رہیں اور وہ اس بات پر افسوس کرتے رہے کہ ڈاکٹر مظہر جیسے رضا کارانہ طور پر کام کرنے والے ڈاکٹر اب میسر نہیں ہیں۔ میں نے وعدہ کیا میں مہینے میں دو بار کراچی سے آیا کروں گا جس پر وہ بے انتہا خوش ہوئے اور میں شرمندہ کہ ہم اتنا کچھ اپنے لیے کرتے ہیں اور دوسروں کے لیے کچھ کرنے کو ہمارے پاس وقت نہیں ہوتا اور اب جو میں نے یہاں مہینے میں دو بار آنے کا کہا ہے تو صرف جذبہ خدمت سے مغلوب ہو کر یا پھر ملائکہ۔۔۔۔۔

"نہیں۔۔۔۔" میں نے اپنے آپ کو سرزنش کی۔ بھلا ملائکہ کے لیے کیوں؟

اور پھر ہم ڈاکٹر لطیف کے ساتھ ہی راؤنڈ کے لیے گئے اور وہ مجھے نظر آ گئی وہ جسے دیکھنے کے لئے میں کراچی سے آیا تھا۔ وہ کچھ عورتوں کے ساتھ بیٹھی تھی اور وہ سب کاغذ کے پھول بنا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ کر ہمارے پاس چلی آئی جب کہ باقی خواتین بدستور اپنے کام میں مصروف رہیں۔

"ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔!"

وہ ڈاکٹر لطیف سے مخاطب تھی۔

"یہ دیکھیں اس موٹی نے مجھے تھپڑ مارا ہے اور میرے بال بھی کھینچے ہیں۔۔۔۔"

میں بہت دھیان سے اسے دیکھ رہا تھا وہ ہونٹ بسور بسور کر بالکل پہلے کے انداز

میں ڈاکٹر لطیف سے شکایت کر رہی تھی میں تب بھی اس کے بچوں جیسے اس انداز پر ہنستا تھا آج بھی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"کیا وہ میری ماں لگتی ہے جو اس نے مجھے مارا۔۔۔۔" اس نے کہا تو سب ہنسنے لگیں۔

"میں نے غلط تو نہیں کہا نا ڈاکٹر صاحب! وہ میری ماں تو نہیں، مارتی تو صرف ماں ہے نا۔۔۔"

وہ ڈاکٹر لطیف کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں پاگلوں والی مخصوص چمک تھی وہ اس وقت بہت قابل رحم تھی۔ میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"جن دنوں یہ مکمل طور پر حواس کھو چکی تھی تو اس کی ماں اسے بہت مارتی تھی۔" راجہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ وہ ڈاکٹر لطیف سے شکایت لگا کر واپس جا چکی تھی اور بڑی مطمئن تھی اپنی جگہ پر بیٹھ کر پھول بنانے لگی تھی۔

"کیا وہ اسکی سگی ماں تھی؟" میں نے راجہ سے پوچھا۔

"ماں۔۔۔"

لیکن وہ اس کی ماں نہیں لگتی تھی عجیب جاہل سی عورت تھی جب ہی میرے ایڈیٹر نے کہا تھا کہ میں اس کے متعلق کہانی لکھوں۔

راجہ اخباری کالم لکھنے کے علاوہ ایک میگزین سے بھی منسلک تھا جس میں مشہور شخصیات کے حالات زندگی چھپا کرتے تھے اور میگزین کا یہ شعبہ راجہ کے پاس تھا۔ کہانی کے انداز میں لکھا گیا سب سچ ہی ہوتا تھا ممکن ہے تھوڑی بہت رنگ آمیزی بھی ہو لیکن راجہ کہتا تھا کہ سب سچ ہے اور ایک کہانی وہ مہینوں کی تحقیق کے بعد لکھتا تھا۔

"تو تم نے وہ کہانی لکھی۔۔۔؟" میں نے متجسس ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن مکمل نہیں کر سکا بس ایک دو صفحات رہتے تھے کہ مجھے کینیڈا جانے کا چانس مل گیا۔۔۔"

"تو وہ کہانی۔۔۔؟"

"پڑی ہے میرے کاغذات میں، واپس جا کر تمہیں بھیج دوں گا مجھے معلوم ہے کہ

تم اس کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتے ہو حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔" وہ مسکرایا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو راجہ! وہ میری پیشنٹ تھی اس لیے اس نے مجھے سب سچ نہیں بتایا تھا اس لیے فطری تجسس ہے۔۔۔۔"

"تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔۔۔" راجہ نے اب کی بار اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

میں جز بز ہو کر ڈاکٹر لطیف کی طرف دیکھنے لگا جو اس دوران اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے تھے جنہوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کہا۔

"آؤ۔۔۔ آپ کو ایک مریض سے ملواتا ہوں جس کی کیس ہسٹری مجھے آپ سے ڈسکس کرنی ہے خاص طور پر آپ کی توجہ چاہیے اس کے لیے۔۔۔"

ہم چلتے چلتے ان کے پاس سے گزرے، کچھ عورتیں بیٹھی رہیں۔ ایک دو نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور پھر کھڑی ہو گئی تھیں اب وہ ڈاکٹر حفیظ کی بجائے راجہ نواز کو دیکھ رہی تھی۔

"تم کون ہو۔۔۔؟"

"یہ ایک صحافی ہے اخبار میں لکھتا ہے۔۔۔"

"اچھا۔۔۔" وہ پھول وہیں پھینک کر تیر کی طرح اس کی طرف لپکی۔

"سنو! تم اخبار میں لکھنا کہ میں پاگل نہیں ہوں، بالکل ٹھیک ہوں، انہوں نے مجھے یوں ہی یہاں بند کر رکھا ہے۔۔۔" اس نے راجہ نواز کی آستین مٹھی میں جکڑ لی۔

"اچھا اچھا لکھوں گا۔۔۔"

"لیکن کیا لکھوں تمہارا نام کیا ہے؟ کس نے بند کیا ہے تمہیں۔۔۔؟"

"میرا نام چھ نمبر ہے۔۔۔" اس نے روانی میں کہا اور پھر راجہ کی آستین چھوڑ دی۔

"لیکن یہ تو نمبر ہے۔ میرا نام۔۔۔۔" وہ پر سوچ نظروں سے ڈاکٹر لطیف کو دیکھنے لگی۔

میں اسے بہت قریب سے دیکھ رہا تھا اس کی رنگت سانولی سی ہو رہی تھی۔ بال روکھے اور مرجھائے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے گرد لکیریں پڑ گئی تھیں دانت پیلے ہو رہے

تھے۔

"ملائکہ۔۔۔" بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔

وہ ایک دم خوش ہوگئی لیکن پھر فوراً ہی اس کی آنکھوں میں الجھن نظر آنے لگی۔

"لیکن تمہیں میرا نام کیسے پتا ہے۔۔۔؟" اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔

ڈاکٹر لطیف نے قریب ہو کر اس کا کندھا تھپکا۔ وہ شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی میں نے اس کی آنکھوں میں پہچان کے سائے ابھرتے اور ڈوبتے دیکھے۔

"کیا یہ اچھی علامت نہیں۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ لیکن فی الحال ذہن پر زور ڈالنا نقصان دہ بھی ہوسکتا ہے۔" ڈاکٹر لطیف نے کہا اور میں خاموش ہوگیا کہ بہرحال وہ بہتر جانتے تھے کہ اس کے ٹھیک ہونے کا پراسس کن مراحل میں ہے۔ میں یہاں کیوں آیا تھا؟ میں اس سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟ میرا اس سے کیا رشتہ تھا؟ سات سال پہلے وہ میرے پاس مریضہ کی حیثیت سے آئی تھی اور سات سال بعد میں یہاں کیوں دوڑا چلا آیا تھا؟ اس ہوش وحواس سے بیگانہ لڑکی سے ملتے ہوئے میں سوچتا رہا۔

راجہ نوازش گاہے بگاہے مجھ پر ایک گہری نظر ڈال لیتا تھا لیکن اس نے کہا کچھ نہیں ہاں جب وہ مجھ سے رخصت ہو کر گاؤں کی طرف جا رہا تھا اور میں ایئرپورٹ کی طرف تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں ملائکہ کے ساتھ ہمدردی میں اتنا آگے نہ بڑھ جانا کہ تمہارا خاندان اس سے متاثر ہو۔۔۔"

پتا نہیں وہ کیا سمجھ رہا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے راجہ! اگر ایسا ہوتا تو سات سال پہلے مجھے اس سے ہمدردی کرنے سے کون روک سکتا تھا اور اگر میں سات سال پہلے اس سے شادی کر لیتا تو پھر شاید وہ اس حالت تک نہ پہنچتی۔۔۔۔"

ایک پچھتاوے کا احساس میرے اندر دور تک پھیلتا ہوا مجھے بے طرح افسردہ

ر گیا اور یہ احساس کئی دن تک مجھ پر حاوی رہا حتیٰ کہ مریم نے بھی محسوس کیا۔

"کیا بات ہے حبیب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔۔۔۔؟"

"نہیں تو۔۔۔۔" میں نے حیرت سے مریم کو دیکھا۔

"میں پریشان تو نہیں ہوں بالکل بھی۔۔۔۔"

"کیا بات ہے۔۔۔۔؟" مریم کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"آپ بہت خاموش اور افسردہ سے ہیں۔۔۔۔ جب سے لاہور سے آئے ہیں بلکہ ابھی کل روفی سے کہہ رہا تھا کہ پاپا شاید بیمار ہیں۔۔۔ کہتے ہیں شور نہ کرو۔۔۔ اسے آپ کیا کہیں گے۔۔۔؟"

"او گاڈ۔۔۔!" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"کیا راجہ صحیح کہہ رہا تھا کہ ملائکہ کی ہمدردی میں اپنی لائف خراب نہ کردوں۔"

"بتائیے نہ حبیب۔۔۔! ہم سب آپ کے ہیں اپنی پریشانی ہمارے ساتھ شیئر کریں۔۔۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں جان۔۔۔!" میں نے خود کو سنبھالا۔

"میں دراصل ڈاکٹر لطیف سے وعدہ کر بیٹھا ہوں کہ مہینے میں ایک یا دو چکر فاؤنٹین ہاؤس کے رضاکارانہ طور پر لگایا کروں گا۔ تو بس اس کے متعلق سوچ رہا تھا کیسے نبھاؤں گا وعدہ۔۔۔؟"

مریم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی۔

"اگر یہ احساس ہمارے خیال سے ہے تو بابا و اماں جان دو ہفتے تک واپس آرہے ہیں اگر پیسے کے زیاں کا خیال ہے تو حبیب! یہ مال و دولت سب یہیں رہ جائے گا ہمارے پاس اتنا ہے کہ ہم ہر ماہ نو دس ہزار کرائے کے لیے خرچ کرسکتے ہیں فی الحال صبح کی فلائٹ سے جا کر شام کو آجایا کریں بابا وغیرہ کے آنے کے بعد رکنا پڑے تو رک بھی جائیں۔"

"نہیں خیر پیسے کا تو مسئلہ نہیں۔۔۔۔" میں شرمندہ سا ہوگیا۔

"میں نے خود ڈاکٹر کو آفر کی تھی بہرحال بابا اور اماں جان آرہے ہیں تو پھر کوئی

پریشانی نہیں۔۔۔۔‘‘ میں مسکرا دیا۔

’’مریم! تم بہت اچھی ہو اور میں بہت خوش قسمت ہوں۔۔۔۔‘‘

’’یہ بات میں بھی کہہ سکتی ہوں۔۔۔۔‘‘ وہ کسی شاخ نازک کی طرح لچکتی ہوئی باہر چلی گئی۔ بلاشبہ وہ ملائکہ اور جائمہ سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کے دل میں پیسے اور دولت کی ہوس نہیں تھی وہ یونہی کھلے دل سے خرچ کرتی تھی۔ ملازموں کے دکھ سکھ میں شریک رہتی اور ملائکہ کو دولت کا لالچ تھا وہ مختلف حیلوں بہانوں سے پیسہ مجھ سے خرچ کروایا کرتی تھی۔ اس نے سوائے پہلی بار کے ایک بار بھی فیس ادا نہیں کی تھی اور پیسے کی حرص تو جو میں بھی بہت تھی پھر بھی پتا نہیں یہ دل۔۔۔۔ اور دل کی شرارتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔

مریم کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے اس لیے اسے ہوس نہیں ہے پیسے کی اور وہ دونوں۔۔۔۔ انہیں ضرورت تھی پیسے کی، اس لیے ان کے دل میں حرص تھی، لالچ تھا۔

میں خود بخود موازنہ کرتا رہتا تھا اور انہیں اس الزام سے بری کر دیتا تھا محبت بھی عجیب ہوتی ہے محبوب کے غلط کو صحیح کہنا اس کی روایت ہے۔

مریم مطمئن ہو گئی تھی میں بچوں کو ساحل سمندر پر لے گیا اور واپسی پر کھانا باہر کھا کر گھر آیا تو ذہن ہلکا پھلکا سا تھا۔ میں نے ڈاکٹر لطیف کو فون کر کے ہر ماہ کی چھ اور ستائیس تاریخ بتا دی تھی اور سوچ رہا تھا کہ ملائکہ کے کیس کی فائل بھی ساتھ لے جاؤں گا اس سطرح پرانی اور نئی کیس ہسٹری اکٹھی کر کے اس کے ذہن کی گتھیاں سلجھانے میں مدد ملے گی۔ بابا جان اور اماں جان امریکہ سے آ گئے تھے اور میرے لاہور جانے میں ابھی کچھ دن تھے کہ کینیڈا سے راجہ نے ملائکہ کی کہانی بھیج دی۔ راجہ نے اپنے مخصوص انداز میں حقیقت کو کہانی کا روپ دیا تھا۔

’’یہ سب سچ ہے حبیب۔۔۔۔!‘‘ اس نے لکھا تھا۔

وہ سب سچ میں نے پڑھا میں نے ملائکہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی کہانی لکھوں گا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اسکی کہانی کہاں سے شروع کروں وہاں سے جہاں پہلی بار وہ مجھے ملی تھی یا پھر وہاں سے جب اس نے ملک حبیب اللہ خان کے گھر آنکھیں کھولی تھیں لیکن پھر اس کے بعد کیا لکھوں گا اس نے تو مجھے اپنے ماضی کے متعلق کچھ

زیادہ نہیں بتایا تھا لیکن اب راجہ نوازش کی لکھی ہوئی کہانی میرے سامنے تھی میں جب کلینک سے اٹھا تو ساری کہانی پڑھ چکا تھا اور میں نے اس میں کوئی ردوبدل نہیں کیا بلکہ ساری کی ساری کہانی آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔

ملائکہ سے زندگی میں غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن پھر بھی یہ سب پڑھنے کے بعد میں نے اس کے لیے اپنے دل میں نفرت محسوس نہیں کی بلکہ وہ جو میرے دل میں ایک نرم گوشہ تھا اس کے لیے اس کا گداز پہلے سے بڑھ گیا ہے شاید اس لیے کہ میں اس سب کے لیے اسے قصوروار نہیں سمجھتا یا شاید اس لیے کہ راجہ نوازش صحیح کہتا ہے کہ میں ملائکہ سے محبت کرتا ہوں اور محبوب کا غلط بھی صحیح لگتا ہے یقیناً آپ کو میری طرح تجسس ہو رہا ہو گا اس لیے میں آپ کو زیادہ دیر امتحان میں نہیں ڈالتا۔ آپ ملائکہ کی کہانی پڑھیے جسے راجہ نوازش نے لکھا ہے شاید آپ کو بھی میری طرح اس سے ہمدردی سی محسوس ہو یا پھر۔۔۔۔

☆ ☆ ☆

ملک حبیب اللہ خان نے بہت خوشگوار موڈ کے ساتھ بیڈروم میں قدم رکھا تو تیز خوشبو نے ان کا استقبال کیا انہوں نے برا سا منہ بنایا۔

ان کے بار بار منع کرنے کے باوجود پتہ نہیں کیوں سلطانہ ایسی ہی تیز خوشبوئیں استعمال کرتی تھی۔ حواس کو پراگندہ کرنے والی۔

دروازے کے پاس ہی کھڑے انہوں نے دائیں طرف نگاہ کی۔ سلطانہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی۔ جھلملاتے ہوئے آتشیں گلابی سوٹ میں، اسے ایسے ہی بھڑکیلے اور چیختے چلاتے رنگ پسند تھے۔ اسی رنگ کی لپ اسٹک میں ہونٹ رنگے اب وہ مسکارا لگا رہی تھی۔

انہوں نے بے حد ناگواری سے اسے دیکھا۔

آتشیں گلابی رنگ کے سوٹ پر سنہرے ستاروں سے بنے جھلملاتے پھول انہیں زہر لگے۔

’’یہ۔۔۔۔ یہ کیا ہے سلطانہ بیگم! یہ کیا ڈریس پہنا ہے آپ نے۔۔۔۔؟‘‘

سلطانہ نے ایک نظر مڑ کر ان پر ڈالی۔

"نہ تو اس لباس میں کیا خرابی ہے خان۔۔۔۔؟"

"جس ڈنر میں ہم جا رہے ہیں وہاں ایسا ڈریس نہیں چل سکتا۔ کوئی سوبر ڈریس پہنیں بلکہ چکن کا وہ گرے سوٹ پہن لیں جو آپا لے کر آئی تھی اور منہ ہاتھ دھو کر ذرا لائٹ سا میک اپ کر لیں۔"

"لو وہ بھی کوئی فنکشنوں میں پہننے والا جوڑا ہے۔ اتنا سادا سوٹ آپ کو برا لگا ہے۔ وہ تھوڑا سا ہنسی، ایسے کپڑے تو فنکشنوں میں ہی اچھے لگتے ہیں، بتیوں میں تو خوب چمکتے ہیں اور میری اماں نے جو یہ سلمہ ستارے والے جوڑے دیے ہیں یہ ضائع تو نہیں کرنے۔ پورے دو ہزار کا یہ سوٹ لیا تھا رنگ محل سے اماں نے۔۔۔۔"

ملک حبیب اللہ ہونٹ بھینچے اسے دیکھتے رہے ایک دم ہی ان پر تھکن طاری ہو گئی جانے وہ کیسا منحوس لمحہ تھا جب انہوں نے سلطانہ عرف شادنی بیگم کو گاتے سنا تھا۔ وہ کوئی مشہور سنگر نہ تھی بلکہ اس روز سے پہلے تک۔وہ اس کا نام تک نہ جانتے تھے یہ فیشن شو ان کا ایک دوست منعقد کروا رہا تھا اور اس کے بے حد اصرار پر وہ چلے آئے تھے ورنہ انہیں ایسے فنکشنوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ کسی اشتہاری کمپنی کی طرف سے اس فیشن شو میں شریک ہوئی تھیں اسی اشتہاری کمپنی کا مہیا کردہ سفید ڈریس پہنے گا رہی تھی۔

میک اپ مین کا مہارت سے کیا گیا میک اپ، بہت سی کلیوں والا سفید کرتا، لمبا سادہ دوپٹا اور پنجابی گانے کے بول براہ راست ان کے دل پر اثر کر رہے تھے۔ آواز میں سوز تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔ اسٹیج کی تیز روشنیوں میں وہ کچھ اور ہی لگ رہی تھی، کوئی آسمانی مخلوق، گلابی رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، وہ تو جیسے ان آنکھوں کے سحر میں جکڑ گئے تھے۔ پاس بیٹھے دوست نے انہیں ادھر متوجہ دیکھ کر بتایا تھا۔

"یہ سلطانہ ہے ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی گانا شروع کیا ہے ابھی اسٹیج پر ہی ایک دوبار پرفارمنس دی ہے۔ امید ہے جلد ہی ٹی وی اور ریڈیو تک رسائی بھی ہو جائے گی۔"

یکایک ان کا دل چاہا وہ اس لڑکی کو اپنا بنا لیں ساری دنیا کی نظروں سے بچا کر اپنے پاس چھپا لیں، ساری میلی اور گندی نظروں سے، انہوں نے پیچھے مڑ کر ناگواری سے ان نوجوانوں کو دیکھا تھا جو سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ان کا برسوں سے خالی دل کسی رفاقت کی

تمنا کرنے لگا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکی کو دنیا کی نظروں سے بچا کر گھر اور چار دیواری کا تحفظ دیں گے۔

"یار زمان شاہ! اگر میں کہوں، میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو کیا یہ ممکن ہے۔۔۔۔؟"

شاہ زماں چونکا۔

"اگر یہ مذاق ہے تو خیر ہے۔۔۔۔ لیکن اگر تم سنجیدہ ہو تو عرض ہے کہ یہ لڑکی تمہارے اسٹینڈر کی نہیں ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے شاہ زمان۔۔۔۔!"

"بہت فرق پڑتا ہے میری دادی کہتی ہیں کہ بیٹی چاہے کہیں بھی دے دو، بہو دیکھ بھال کر اچھے خاندان کی لاؤ کہ اسے پوری نسل کو پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک نظر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی سلطانہ کو دیکھا۔

"اس کے لیے میں نے کسی کی بات نہ مانی۔۔۔۔"

"زمان! اس لڑکی کا پتا کراؤ مجھے ہر قیمت پر اس سے ہی شادی کرنا ہے۔"

"اس کا باپ ایک دفتر میں چپراسی ہے۔" شاہ زمان نے انہیں بتایا۔

"اور بھائی کسی اسٹوڈیو میں ملازم ہے اور ان کا کوئی فیملی بیک گراؤنڈ نہیں ہے۔ دو بہن بھائی ہیں بہت غربت ہے۔"

"غربت کوئی جرم تو نہیں زمان۔۔۔۔!"

"غربت جرم نہیں لیکن میرے بھائی وہ لوگ کسی بھی لحاظ سے تمہارے ہم پلہ نہیں ہیں اس لڑکی کی ماں کسی زمانے میں گڑوی بجایا کرتی تھی۔ سمجھتے ہو نا گڑوی بجانے والی عورتوں کو۔۔۔۔"

"تو۔۔۔۔؟" ملک محب اللہ خان نے بھنویں اچکائیں۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے اس کا باپ محنت کر کے روٹی کماتا ہے باعزت طریقے سے۔۔۔۔"

"لیکن ذات کا بھانڈ ہے۔۔۔۔" شاہ زمان چڑ گیا تھا۔ لیکن محب اللہ خان

جنہوں نے اپنی ساری ایجوکیشن یورپ میں مکمل کی تھی انہیں اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا انہوں نے اپنے عزیز از جان دوست شاہ زمان کی کوئی بھی نصیحت سننے سے انکار کر دیا تھا۔کوئی بھی چیز انہیں فیصلہ بدلنے پر مجبور نہ کر سکتی تھی۔آپا جنہوں نے ماں باپ کے بعد ہر طرح سے ہی ان کا خیال رکھا تھا ان کی بات بھی نہ مانی۔

”غربت کوئی جرم نہیں ہے محبت! لیکن۔۔۔۔؟“

وہ جوان کے منہ سے شادی کی بات سن کر بے حد خوش ہو گئی تھیں کہ وہ کسی طرح شادی کے لیے راضی تو ہوئے سلطانہ کے متعلق تفصیل جان کر خاموش سی ہو گئی تھیں۔

”لیکن ویکن کچھ نہیں آپا! میرے دل نے پہلی نظر میں ہی اسے پسند کر لیا ہے ورنہ آپ جانتی ہیں میرا شادی وغیرہ کا کوئی ارادہ نہیں تھا جو خاندانی طور طریقے وہ نہ جانتی ہو گی وہ آپ اس کو سکھا لیجیے گا۔“ ان کا انداز حتمی تھا۔

لیکن اس ایک سال دس دن میں وہ کچھ بھی نہ سیکھ پائی تھی حالانکہ آپا اپنے گھر کے کام چھوڑ کر دن میں کئی گھنٹے اس کے ساتھ گزارتی تھیں وہ بالکل ان پڑھ تھی۔اس کا بات کرنے کا انداز بالکل گواروں جیسا تھا، لباس کے معاملے میں اس کا ذوق بے حد خراب تھا صرف چند دن بعد ہی محبت اللہ خان کو احساس ہو گیا تھا کہ ان سے زندگی کی سب سے بڑی غلطی سرزد ہو چکی ہے۔صرف دور سے شکل وصورت دیکھ کر انہوں نے اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کر لیا تھا، کس قدر حماقت ہوئی تھی ان سے، لیکن شاید دل کی شرارتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔شاہ زماں نے اس شادی کے لیے اس کے بھائی صادق کو پورا ایک لاکھ روپیہ دیا تھا جس پر وہ خاصا خوش تھا۔

”شانو کے کیریئر کا ابھی آغاز ہوا تھا شاہ جی! یہ شادی نہ ہوتی تو اس نے ایسے لاکھوں کمانے تھے ہمارا تو جی مستقبل تباہ کر رہے آپ۔۔۔۔“

”جانتا ہوں کتنے کمانے تھے، زیادہ بک بک نہ کر شکر نہیں کرتا کہ بہن کا گھر بس رہا ہے۔“

سلطانہ کے باپ نے بیٹے کو گالی دے کر بات پکی کر دی تھی سادگی سے نکاح ہوا تھا۔ولیمے کی تقریب میں مختصر سے لوگ تھے صرف چند فیملی فرینڈز۔محبت اللہ کے بہنوئی

نہیں چاہتے تھے کہ اخباروں میں آئے کہ ملک محبت اللہ خان نے ایک اسٹیج گلوکارہ سے شادی کر لی ہے۔شادی پر اور ولیمے پر اسے پارلر سے تیار کروایا گیا تھا اور وہ حقیقتاً خوبصورت لگ رہی تھی لیکن خوبصورتی صرف قد وقامت اور چہرے کے خدوخال کا نام تو نہیں ہے۔خوبصورتی تو بات چیت، اٹھنے بیٹھنے کے طریقے، گفتگو، ہر شے سے مکمل ہوتی ہے اور محبت اللہ خان شدت سے سوچنے لگے تھے کہ سلطانہ بیگم کا حسن ادھورا ہے، نامکمل ہے، کتنی بار باتوں باتوں میں انہوں نے اسے سمجھایا تھا کہ آپا کی باتوں کو دھیان سے سن کر سمجھنے کی کوشش کرے۔

چیختے چلاتے شوخ رنگ کے کپڑے، شوخ میک اپ، ان کی سوسائٹی میں سوٹ نہیں کرتا۔محبت تو ابتدائی چند دنوں کے بعد ہی گہنا گئی تھی۔اب صرف رشتہ نبھانے والی بات تھی، وہ پچھتانا نہیں چاہتا تھا لیکن پچھتاوے ان کے اندر بیٹھے ڈنک مارتے رہتے تھے پھر بھی حتی الامکان وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے تھے۔

آخری نظر ڈال کر سلطانہ ان کے قریب آئی۔

”تم کو تیار نہیں ہونا محبت اللہ۔۔۔۔؟“

آپ کہہ کر تو اس نے شاید ایک آدھ بار ہی بلایا تھا تنہائی میں تو خیر تھی لیکن سب کے سامنے جب وہ محبت اللہ کو تم اور تو کہہ کر بلاتی تو برا لگتا تھا ایک بار آپا نے کہا تو ”کھی کھی“ کر کے ہنس پڑی۔

”لو۔۔۔۔محبت اللہ میرا شوہر ہے باپ نہیں جو آپ کہہ کر بلاؤں۔“

”میری بھرجائی نے ایک بار صادق کو آپ کہہ کر بلایا تھا تو میرے ابا نے فوراً ٹوک دیا تھا کہ تیرا باپ نہیں ہے خاوند اے تیرا۔۔۔۔“ آپا چپ اور شرمندہ ہو گئی تھیں۔

”نہیں میرا موڈ نہیں رہا جانے کو۔۔۔۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئے اور جھک کر جوتے اتارنے لگے۔

”نہ تو میں ویسے ہی اتنی تیار ہوئی ہوں۔“ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

”اب ذرا گھما شما لاؤ، باہر سے کھانا کھلاؤ اور پھر مجھے بھائی صادق کی طرف لے جاؤ اتنے دن ہو گئے ادھر گئے ہوئے۔۔۔۔“

"ابھی دو دن پہلے تو صادق ادھر آیا تھا۔۔۔" وہ موزے اتارتے ہوئے بولے۔

"لو میں تو نہیں گئی نا۔۔۔"

"میں بہت تھکا ہوا ہوں سلطانہ! اور میرے سر میں بھی درد ہے پلیز۔۔۔" ان کا لہجہ بدستور نرم تھا اس ایک سال دس دن میں کبھی انہوں نے سلطانہ سے اونچی آواز میں بات نہ کی تھی حالانکہ انہیں اس کی بہت سی سرگرمیوں پر اعتراض تھا جس میں صادق کا وقت بے وقت ان کے گھر آنا بھی انہیں برا لگتا تھا۔ وہ انتہائی لالچی آدمی تھا جب بھی آتا سلطانہ سے کسی نہ کسی بہانے کچھ مانگ لیتا اور ڈھیٹ اس قدر تھا کہ ملک محب اللہ خان کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بھی اسے جھجک نہ ہوتی تھی اور اس کے جانے کے بعد سلطانہ انہیں جتانا نہ بھولتی تھی کہ صرف ان کے ساتھ اس کی شادی کر دینے سے ان کے گھر والوں کا کتنا نقصان ہوا تھا۔

"شمو رانی نے میرے ساتھ ہی گانا شروع کیا ایسی بھدی آواز میں میرے سامنے پانی بھرتی نظر آتی تھی لیکن اب ان کی گڈی چڑھ گئی ہے لاکھوں کما رہے ہیں لہذا اگر صادق بھائی اپنی کسی ضرورت کے لیے ان سے کچھ مانگتا ہے تو یہ اس کا حق ہے۔"

وہ تاسف سے اسے دیکھتے۔ کیسی ناشکری عورت تھی وہ شکر ادا نہیں کرتی تھی کہ ایک گھر اور چار دیواری کا تحفظ مل گیا تھا۔

"اچھا۔۔۔ تو پھر میں ہی چلی جاتی ہوں ڈرائیور کے ساتھ اب اتنی تیار شیار ہوئی ہوں تو اماں ابا اور بھائی سے مل لوں گی۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا وہ اس سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"اچھا تو پھر تین چار ہزار روپے بھی دے دیں۔ خرچے کے لیے کچھ میرے پاس ہیں بڑی اچھی فلم لگی ہوئی ہے "تاج محل" سب دیکھنے جائیں گے اور کچھ کھائیں پئیں گے۔"

"آپ سارا سارا دن وی سی آر پر فلمیں دیکھ دیکھ کر نہیں تھکتیں۔۔۔؟"

محب اللہ خان کے لہجے میں بیزاری تھی۔

"نہ تو فلمیں بھی نہ دیکھوں تو کیا کروں، گانے پر تو نے پابندی لگا دی ہے، تھیٹر جانا بھی بند کر دیا ہے۔"

"گھر میں کرنے کو ڈھیروں کام ہوتے ہیں سلطانہ۔۔۔!" انہوں نے آہستہ سے کہا جسے اس نے سنی ان سنی کر دیا۔

"اچھا پیسے تو دو نا بھائی صادق بتا رہا تھا کہ ایک فلم ہے "مولا جٹ ان لندن" میں نے وہ دیکھنی ہے۔"

محب اللہ خان نے خاموشی سے پانچ ہزار نکال کر اسے دے دیئے اور والٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ٹانگیں بیڈ پر رکھ لیں۔

"پلیز جاتے ہوئے کچن میں چائے کا کہہ دیجئے گا۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پیسے گن کر پرس میں رکھے۔ پلنگ کے نیچے سے سرخ رنگ کی ہیل والی جوتی نکالی اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

محب اللہ خان کے سر میں یکایک درد ہونے لگا تھا آنکھیں موند کر تکیے پر سر رکھ دیا کیسے گزرے گی اتنی لمبی زندگی، سلطانہ بیگم کی ہر ادا ہی نرالی تھی اور وہ کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہ تھی آپا بیگم بھی کوشش کر کے ہار گئی تھیں۔

"محب اللہ باورچی کے ہاتھ کا پکا پسند نہیں کرتا۔ ساری زندگی دوسروں کے ہاتھ کا پکا کھایا ہے، گھر کے کھانوں کو ترسا ہوا ہے، پہلے تو میں آ جاتی تھی ہفتے بعد، کچھ نہ کچھ بنا کر رکھ جاتی ہوں۔ اب تم آ گئی ہو تو اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ بنا دیا کرو۔"

"میں۔۔۔۔"

"ہاں تم دلہن۔۔۔!"

"مجھے پکانا نہیں آتا۔۔۔"

اب وہ ایسے بھی دولت مند خاندان کی نہ تھی کہ گھر میں باورچی ہوں۔ آپا کو غصہ آ گیا تھا لیکن وہ ضبط کر گئیں۔

"کیا گھر میں کبھی کچھ نہیں پکایا۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"بس کبھی کبھی عید بکر عید پر گھر پر کچھ پکتا تھا۔اماں کہتی تھیں دس روپے کے چنے یا حلیم منگواؤ تو پورا گھر پیٹ بھر کے کھالیتا ہے، گھر میں تو گھی، نمک، مرچوں کا اتنا خرچ ہو جاتا ہے۔ایک ہانڈی پر بیس پچیس روپے تو خرچ آ جاتا ہے اوپر سے پکانے کی مصیبت الگ۔"

آپا تاسف سے اسے دیکھنے لگیں۔

"بس صبح چائے بنتی تھی گھر پر۔۔۔۔کبھی پاپوں کے ساتھ پی لی اور کبھی بہت عیش ہوئے تو حلوہ پوری آ گیا ناشتے میں۔۔۔۔"

"خیر جو طور طریقے تمہارے میکے میں تھے یہاں تو نہیں چل سکتے۔محب کو کم مرچوں والے کھانے پسند ہیں۔عمر کا زیادہ حصہ اس نے یورپ میں گزارا ہے اس کی پسند کے دو چار کھانے میں تمہیں سکھا دیتی ہوں۔"

لیکن سلطانہ بیگم نے نخوت سے کندھے اچکائے۔باورچی ہے ناں اس کو بتا دیں۔پکا دیا کرے گا۔" جہاں آپا یہ ٹکا سا جواب سن کر ششدر رہ گئی تھیں وہیں محب اللہ خان شرمندہ ہو گئے تھے۔

"واہ محب اللہ خان عمر کے بتیس سال اس لڑکی کے انتظار میں ضائع کر دیئے تم نے، یہ تھی تمہاری آئیڈیل۔۔۔۔"

ان کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔کہاں کہاں سے انہوں نے خود کو بچایا تھا سوزی تو ان کے پیچھے ہی پڑ گئی تھی جانے کہاں سے اس کو پتا چل گیا تھا کہ وہ ایک امیر زادے ہیں اور پاکستان میں بہت بڑی پراپرٹی ہے۔

بے چاری مغربی عورت چار دیواری اور تحفظ کو ترسی ہوئی پیسے کی ہوس سے لبالب بھری۔آپا نے جب خدشہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں وہ وہیں کسی گوری میں تو دل نہیں اٹکا بیٹھے تو وہ دل کھول کر ہنسے تھے۔

"توبہ کریں آپ کا محب اتنا بے وقوف نہیں ہے۔زندگی کے ساتھی کے لیے میری بڑی مختلف چوائس ہے۔"

"اور یہ تھی میری مختلف چوائس۔۔۔۔"

انہوں نے آنکھیں کھول کر سامنے دیوار پر لگی ہوئی بڑی سی تصویر کو دیکھا جس

میں دلہن بنی ہوئی وہ ان کے ساتھ کھڑی تھی۔قیامت کی حد تک حسین لیکن اس کی آنکھوں کی بے باکی تصویر میں بھی واضح تھی اور یہ باکی انہیں اس وقت کیوں دکھائی نہیں دی تھی۔یہ دل، یہ ضدی بچہ، اس نے مہلت ہی کب دی تھی انہیں اسے دیکھنے اور پرکھنے کی۔

ایک سرد آہ بھر کر وہ اٹھ بیٹھے ملازم اس دوران چائے رکھ گیا تھا۔چائے پی کر وہ کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھے۔بارہ بجے تک سلطانہ واپس نہ آئی تھی۔یقیناً نو سے بارہ کا شو دیکھ کر وہ حسب معمول ایک بجے تک واپس آئے گی۔نائٹ بلب جلا کر وہ سونے کے لیے لیٹ گئے اور جانے کب انہیں نیند آ گئی انہیں خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ سلطانہ کب آئی تھی۔

تین چار راتوں کی مسلسل ٹینشن کے بعد آج انہیں نیند آئی تھی اور یہ غالباً خواب آور گولیاں لینے کا اثر تھا کہ جب وہ صبح اٹھے تو فریش تھے۔سلطانہ گہری نیند سو رہی تھی اور بے باک آنکھیں خوابیدہ تھیں۔لمبی پلکیں رخساروں پر سایہ فگن تھیں۔لمحہ بھر وہ اسے دیکھتے رہے اور اگر یہ وہ سارے طور طریقے سیکھ لے جو میرے لیے پسندیدہ ہوں تو زندگی کا یہ سفر اتنا مشکل نہ لگے۔پڑھائی اور بات چیت کے آداب سکھانے کے لیے کوئی اچھی سی ٹیوٹر رکھ لوں جو اسے اٹھنے، بیٹھنے، اوڑھنے، پہننے کا سلیقہ بھی سکھائے تو ممکن ہے بلکہ یقیناً کچھ نہ کچھ بہتر ہو جائے گا۔

اس خیال نے انہیں بڑی تقویت دی چنانچہ وہ ناشتہ کر کے سیدھا آپا کی طرف ہی چلے آئے کہ آپا سے بہتر کوئی اور ان کا درد اور مشکل نہیں سمجھ سکتا تھا آپا نے ان کی تائید کی۔

"ٹھیک ہے میں دیکھتی ہوں۔"

لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہ تھا ایک کی بجائے دو ٹیوٹر لگائی گئیں ایک پڑھنا لکھنا سکھانے کے لیے اور دوسری بیوٹیشن تھی لیکن سب بے فائدہ جا رہا تھا اس نے الف سے آگے پڑھ کر نہ دیا تھا۔

وہ کوئی پندرہ سولہ سالہ لڑکی تھی لیکن دیکھنے میں چوبیس پچیس سال کی لگتی تھی۔وہ بیوٹیشن سے جو سیکھتی ویسا ہی کر کے دکھا دیتی لیکن جب تیار ہوتی تو وہی چیختا چلاتا میک اپ، گہرے رنگ کے کپڑے۔ہاں ساڑھی باندھنا اس نے سیکھ لیا تھا مگر انتخاب وہی

جامنی اور گلابی تھا۔ یہ رنگ اس پر اتنے برے نہیں لگتے تھے لیکن ساتھ گہرا میک اپ انہیں برا بنا دیتا تھا ان ہی دنوں گھر میں اجنبی لوگوں کی آمد شروع ہوگئی عجیب وغریب حلیوں کے مرد اور عورتیں۔۔۔۔۔

"کون ہیں یہ لوگ۔۔۔۔۔؟"

"ہمارے رشتہ دار ہیں۔۔۔۔" سلطانہ کا جواب تھا۔

"یہاں کیا کرنے آتے ہیں۔۔۔۔؟"

"ملنے آتے ہیں۔۔۔۔ ایک تو تم نے گانے پر پابندی لگا دی ہے میرے اندر کا فنکار مار دیا ہے۔ بس دل کی تسلی کے لیے ذرا ہلا گلہ کر لیتے ہیں۔ صادق تو کہتا ہے مجھے گانا شروع کر دینا چاہیے بہت شہرت ملے گی۔"

"فضول مت بولا کریں آپ! ایک بات جب پہلے طے ہوگئی ہے تو۔۔۔۔۔" انہیں غصہ آ گیا۔

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ صادق نے بھی کہا تھا کہ ابھی بات مان لو بعد میں منوا لینا۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔ میں گانا نہیں چھوڑ سکتی خان۔۔۔۔۔!"

اس نے لاڈ سے اپنا سر ان کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئے چہرے پر ناگواری کی شکنیں تھیں اور ضبط کی کوشش میں چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"وہ نذیر علی کہہ رہا تھا میرے گلے میں سر خود بولتے ہیں۔ میرے ماے کا پتر ہے ہم نے ایک گانا اکٹھے گایا تھا سٹیج پر۔ بڑی واہ واہ ہوئی تھی۔ دیکھا تھا کل تم نے نذیر کو وہ اونچا لمبا سا مونچھوں والا۔۔۔۔"

"اگر یہاں میرے ساتھ رہنا ہے سلطانہ! تو یاد رکھیں کہ گانا وانا سب بھول جائیں اور مجھے ان لوگوں کی یہاں آمد بھی پسند نہیں۔۔۔۔" وہ انتہائی سختی سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔

"صادق نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا اسے۔۔۔۔"

"تیرے پاؤں جم گئے ہیں شانو! یہ خان ساتھ نبھانے والا لگتا ہے بس اب تو اپنی منوا تیری اور نذیر کی جوڑی بڑی مقبول ہوگی۔۔۔۔ پیسہ ہی پیسہ۔۔۔۔ بارش ہو جائے

گی پیسے کی۔۔۔۔"

"لیکن خان کے پاس تو خود بڑا پیسہ ہے۔۔۔۔"

"جھلی ہے تو نری۔۔۔۔ وہ پیسہ تیرے پاس تھوڑا ہے مانگ مانگ کر لینا پڑتا ہے تجھے۔۔۔۔ پھر اتنا کمائے گی تو اس میں سے بھائی کا خیال کر لینا۔ یہ پروڈیوسر اتنا کم دیتے ہیں کہ ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے پوری ہوتی ہے۔ تیرے بیاہنے سے بڑا نقصان ہوا۔۔۔۔ دو چار پیسے جو تو کماتی تھی وہ بھی گئے۔۔۔۔"

"لو پچھلے ہفتے تو دس ہزار روپے دیے تھے۔۔۔۔"

"وہ اماں کی بیماری میں لگ گئے۔۔۔۔"

وہ اور پیسے نکال دیتی اور وہ روز یونہی بہانے بنا بنا کر اس سے رقم لیتا رہتا تھا روپے پیسے کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ جتنے مانگتی محب اللہ خان دے دیتے۔ تکلیف تو نذیر علی اور سلطانہ کی بے تکلفی تھی۔ نذیر علی ہر تیسرے چوتھے دن چلا آتا تھا۔ شروع شروع میں تو صادق یا کوئی اور عورت یا مرد ساتھ ہوتا بعد میں اکیلے ہی آنے لگا۔ پرانے ملازمین محب اللہ کو رپورٹ ضرور دیتے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں کون کون آیا ہے۔

کئی بار وہ آفس سے آتے تو وہ ڈریسنگ میں موجود ہوتا۔ سلطانہ اور اس کے قہقہے بیڈ روم تک سنائی دیتے تھے۔ کئی بار انہوں نے اپنی گاڑی میں سلطانہ، نذیر علی اور صادق کو کسی ہوٹل میں جاتے دیکھا۔ آفس سے اچانک کسی کام سے اٹھنے پر انہوں نے ایک بار سگنل پر اپنی گاڑی دیکھی یہ سب ان کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا ایک دن تکلیف حد سے بڑھ گئی تو آپا کے سامنے رو پڑے۔

"مجھے لگتا ہے آپا میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔۔۔۔"

"جب جوتی تکلیف دینے لگے تو اسے بدل دینا چاہیے۔۔۔۔" آپا نے ان کا سر سینے سے لگا لیا۔

"اور۔۔۔۔ وہ کچھ کہتے کہتے جھجکیں۔۔۔۔ مانا ہمارے خاندان میں طلاق معیوب سمجھی جاتی ہے لیکن خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ تم سلطانہ کو فارغ کر دو۔ کل تمہارے بھائی صاحب بھی بتا رہے تھے کہ کسی دوست کے ساتھ ہوٹل گئے

تو کسی شخص کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے قہقہوں کی آوازیں اتنی بلند تھیں کہ لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ تمہارے بھائی صاحب تو دروازے سے ہی پلٹ آئے کہ کہیں پکار لیا تو خوامخواہ بدنامی ہو جائے گی۔۔۔۔''

اور وہ اندر تک عرق ندامت سے بھیگ گئے۔

''بھائی۔۔۔۔!'' انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔

''کبھی کبھی اپنے ہی جسم کے حصے کو کاٹنا پڑتا ہے باقی جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے۔''

اور جب وہ آپا کے گھر سے نکلے تو فیصلہ کر چکے تھے اور اس فیصلے نے انہیں پرسکون کر دیا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے ڈیڑھ سال بعد ان کے دل پر دھرا بوجھ کم ہو گیا ہو۔ گھر آئے تو خلاف توقع ڈرائنگ روم خالی تھا اور سلطانہ بیڈ روم میں لیٹی ہوئی تھی۔

''خیریت۔۔۔۔'' ان کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

''آج تمہارے مامے کا پتر نہیں آیا۔۔۔۔؟'' سلطانہ نے انہیں خوابناک آنکھوں سے دیکھا۔

''آج میری طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔۔''

آواز میں نقاہت شامل ہو گئی جب کہ چہرہ چمک رہا تھا۔

''خدانخواستہ نصیب دشمناں۔۔۔۔ کیا مرض لاحق ہو گیا۔۔۔۔''

''خان! آپ بھی بس۔۔۔۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چہرے پر شرم کے آثار نظر آئے۔

''وہ صبح سے چکر آ رہے تھے۔ نذیر آیا تو میں اس کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف چلی گئی۔ ڈاکٹر نے کہا میں ماں بننے والی ہوں۔۔۔۔''

''کیا۔۔۔۔'' ان کا دل دھک سے رہ گیا۔

''لو جی! تمہیں تو سمجھ نہیں آئی۔ باپ بننے والے ہو تم۔۔۔۔''

سمجھ تو وہ گئے تھے لیکن یہ کیا ہو گیا تھا اس وقت جب وہ اسے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

''نہیں۔۔۔۔'' انہوں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''سچی۔۔۔۔ تم نذیر سے پوچھ لو بے شک۔۔۔۔''

''شٹ اپ۔۔۔۔'' انہوں نے ایک ناگوار سی نظر اس پر ڈالی۔

''یہ نذیر اس کی زندگی کے ہر معاملے میں داخل ہو رہا تھا۔ کیا اسے زیب دیتا تھا کہ وہ نذیر کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جائے۔''

یکدم ان کے سر میں درد کی شدید لہر اٹھی وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے ہوئے بیڈ کے کونے پر ٹک گئے۔

''لو تم تو خوش ہونے کی بجائے الٹا غمزدہ ہو کر بیٹھ گئے۔ خان یہ تو خوشی کی خبر ہے کہ تم باپ بننے والے ہو، میری اماں کو اتنی فکر تھی، سال گزر گیا کوئی خبر ہی نہیں، خدا نہ کرے تو اس روز میں نے وی سی آر پر فلم لگائی ہوئی تھی نا تو اس میں ہیرو کو جب پتا چلتا ہے کہ وہ باپ بننے والا ہے تو وہ خوشی سے پاگل ہو جاتا ہے اور۔۔۔۔''

''خدا کے لیے سلطانہ بیگم! اس وقت کچھ دیر کو خاموش ہو جایئے۔ نہ آپ ہیروئن اور نہ میں ہیرو وہ جو فیصلہ کر کے آپا کے گھر سے اٹھے تھے وہ فیصلہ تو بیچ مندھار میں کشتی کی طرح ڈولنے لگا تھا۔ قدرت یوں ہی انسانی فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔''

وہ اٹھے اور مرے مرے قدموں سے چلتے ہوئے لاؤنج تک آئے اور پھر اپنی اسٹڈی میں چلے گئے۔

''آپا۔۔۔۔!'' کچھ دیر بعد ہی وہ آپا کو فون کر رہے تھے۔

''آپا! اب میں کیا کروں۔۔۔۔؟''

وہ روہانسے ہو رہے تھے کچھ دیر پہلے جس بوجھ سے وہ خود کو آزاد سمجھ رہے تھے وہ دگنا ہو گیا تھا۔

''محب! میری جان! کچھ بھی مت کرو۔۔۔۔ حوصلہ کرو۔۔۔۔ اللہ اپنی حکمتیں خود جانتا ہے۔۔۔۔ میرے باپ کے گلشن میں مدت بعد بہار آنے والی ہے اس گھڑی کے لیے تو میں نے بہت دعائیں کی تھیں محب۔۔۔۔!''

خوشی سے ان کی آواز کانپ رہی تھی وہ اتنی دور سے بھی ان کے چہرے پر کھلتے

رنگوں اور آنکھوں میں دمکتی خوشی کو دیکھ رہے تھے۔

"مگر آپا۔۔۔۔!" انکی سسکی نکل گئی۔

"اس عورت کے ساتھ کیسے۔۔۔۔کیسے۔۔۔۔آپا۔۔۔۔؟"

"محب! میں آرہی ہوں۔۔۔۔"

انہوں نے فون بند کردیا۔ جانتی تھیں کہ اس وقت محب اللہ کو ان کے سہارے کی ضرورت ہے۔ وہ جوان کے گھر سے اٹھتے ہوئے ان کے چہرے پر سکون کے رنگ بکھرے تھے، وہ جو فیصلہ کر کے بہت مطمئن تھے، یکا یک یہ کیا ہو گیا تھا، انہیں اپنی حالت اس وقت کسی ایسے مسافر جیسی لگ رہی تھی جو منزل پر پہنچ کر بھی نامراد رہا ہو۔ وہ لاؤنج میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر کے بعد آپا مٹھائی کی ٹوکریوں سے لدی پھندی آگئیں۔

"آپا۔۔۔۔!" انہیں دیکھ کر وہ بکھر گئے۔

آپا نے ان کا ہاتھ تھام کر ان کا سر سینے سے لگا کر انہیں تسلی دی تھی۔

"کیا تم یہ برداشت کرسکو گے کہ تمہارا بچہ اس چھوٹے سے گھر میں، اس ماحول میں جنم لے، پلے بڑھے اور وہ جو آپا کے آنے سے پہلے سوچ رہے تھے کہ بچہ ہوجائے تو پھر تو طلاق دی جاسکتی ہے ایک دم ڈھے سی گئی۔ ایک کلکلیاں مارتی بچی تصور میں آئی اور پھر سلطانہ بیگم کا گھر۔ اسٹیل کی بڑی سی پلیٹ میں زمین پر بیٹھ کر لڑ لڑ کر کھاتے سلطانہ کے بھتیجے بھتیجیاں۔۔۔۔"

"اوہ نو۔۔۔۔" انہوں نے خود ہی نفی میں سر ہلایا۔

"وہ کبھی کبھی زندگی میں سمجھوتے کا اثر بھی ہوتا ہے یا پھر خود ہی باپ بننے کی انوکھی خوشی۔ کوئی کلی دل کے اندر کھل اٹھی تھی کہ وہ سلطانہ کا بہت خیال رکھنے لگے تھے۔ اس کی ناگوار باتوں کو بھی برداشت کرتے رہے۔ خود اسے ساتھ لے جا کر ایک بڑے ہاسپٹل میں اس کا نام درج کروایا۔ باقاعدگی سے چیک اپ کے لیے لے کر جاتے۔ اس کی خوراک کا خیال رکھتے، سلطانہ تو ان دنوں ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

صادق نے سمجھایا تھا "اب اس گھر میں تمہارے قدم مضبوط ہوگئے ہیں جو چاہو

حاصل کرلو۔ بچہ ہوجائے تو سب سے پہلے گھر اپنے نام کروانا۔ کچھ جائیداد اور بینک بیلنس بھی نکلوالو۔۔۔۔"

"لیکن صادق بھائی! گھر میرا اور میرے بچوں کا ہی ہے۔۔۔۔"

"جھلی ہو تم ان بڑے لوگوں کا کیا پتا کب دل بھر جائے۔۔۔۔"

اور سلطانہ کی سمجھ میں بات آگئی تھی۔ گو اب بھی صادق کبھی کبھی کبھار نذیر علی کے ساتھ ایک دو بندوں کو لے کر آجاتا۔ محفلیں جمتیں، گیت گاتے، ہلا گلا ہوتا۔ محب اللہ خان بہت جز بز ہوتے۔ جب انہیں پتا چلتا کہ ان کی عدم موجودگی میں گھر میں جمگھٹا رہا لیکن جب سلطانہ آنکھوں میں آنسو بھر کے کہتی۔

"کیا کروں باہر بھی نہیں جاسکتی۔ اس حالت میں بیٹھے بیٹھے دل گھبراتا ہے۔ صادق بھائی اور نذیر علی آجاتے ہیں تو دل بہل جاتا ہے۔"

وہ خاموش ہوجاتے کہ بچہ ہوجائے تو شاید خود ہی سلطانہ سنبھل جائے لیکن انکے سارے خواب خواب ہی رہے۔ سلطانہ ایک بچی کی ماں بن گئی۔ بچی بے انتہا خوبصورت تھی۔ محب اللہ خان اور سلطانہ۔ دونوں کا حسن چرالائی تھی۔

آپا نے بہت شوق سے اس کا نام ملائکہ رکھا تھا ملائکہ کے لیے آیا رکھ لی گئی۔ سلطانہ کو اس کی ذرا پرواہ نہیں تھی۔ وہ بچی کی طرف سے بالکل بے نیاز تھی۔ چند ماہ بعد ہی وہ بچی کو آیا کی گود میں ڈال کر خود پہلے جیسی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئی تھی۔ بلکہ اب وہ کچھ زیادہ ہی کھو گئی تھی۔ صادق نے اسے یقین دلایا تھا کہ اب وہ بچی کی ماں بن کر زیادہ مضبوط ہوگئی ہے بلکہ اب وہ کلفٹن کا ایک فلیٹ اپنے نام کروانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

محب اللہ بیٹی کی پیدائش پر واقعی اتنے خوش تھے کہ جب اس نے گفٹ کی فرمائش کی اور کلفٹن والے فلیٹ کو اپنے نام کرنے کو کہا تو انہوں نے اس کی بات مان لی۔ بہرحال اب وہ ان کی بیٹی کی ماں تھی اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔

یہ صادق کا خیال تھا تب ہی تو وہ آزادانہ نذیر کے ساتھ گھومتی بلکہ ایک دو بار محب اللہ خان کی لاعلمی میں اسٹیج پر جا کر نذیر کے ساتھ گانا بھی گایا۔ محب اللہ خان کی کاروباری مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ انہیں سلطانہ کی اس سرگرمی کا پتا نہیں نہ چل سکا۔

ادھر ملائکہ اکثر بیمار رہنے لگی تھی اس کا پیٹ خراب رہتا دودھ ہضم نہ ہوتا۔ آپا جب بھی آتیں تشویش کا اظہار کرتیں۔ محب ڈاکٹروں کے پاس لے جاتے لیکن دو چار دن بعد پھر وہی حال ہو جاتا۔ جو بچی بے انتہا خوبصورت تھی اور صحت مند تھی اب سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ ہر وقت ریں ریں کرتی تھی وہ کاٹ میں پڑی روتی رہتی اور سلطانہ محب اللہ کے جانے کے بعد ہی گھر سے نکل جاتی۔ آپا بیگم نے دو تین بار اسے سمجھایا۔

''کہ وہ خود بچی کا خیال رکھے کرے۔۔۔۔''

''آپا کس بات کی تنخواہ لیتی ہے۔۔۔۔''

اس کے جواب نے آپا کو حیران کیا تھا کہ یہ کیسی ماں ہے؟ لیکن وہ محب اللہ سے کچھ نہ کہہ سکیں البتہ آپا کو خوب ڈانٹ پلائی۔ ان دنوں سلطانہ پر فلموں میں کام کرنے کا بھوت سوار ہو گیا۔ صادق اور نذیر نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اتنی خوبصورت ہے کہ تمام چوٹی کی ہیروئنوں کو پیچھے چھوڑ جائے گی۔ سو وہ نذیر کے ساتھ اسٹوڈیو کے چکر کاٹتی رہی یا پھر صادق کے ساتھ۔

ان ہی دنوں محب اللہ خان کو کاروبار کے سلسلے میں فرانس جانا پڑا اور ان کا قیام وہاں تقریباً تین ماہ رہا۔ واپس آئے تو سلطانہ کے متعلق جو خبریں ملیں اس نے انہیں حواس باختہ کر دیا۔ اسی اثناء میں اسے کسی فلم میں معمولی سا کردار مل گیا تھا اور وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی اور محب اللہ خان کی ہر تنبیہہ سے بے نیاز ہو کر دھڑلے سے نہ صرف اسٹیج پر گانا گا رہی تھی بلکہ ریڈیو پر ایک آدھ چانس بھی مل گیا تھا۔ محب اللہ خان حیرت شاہ زمان کی گفتگو سن رہے تھے جو سب کچھ بتاتے ہوئے بے حد شرمندہ سا ہو رہا تھا۔

''اسی لیے میں نے تمہیں منع کیا تھا محب! تمہیں اسے روکنا چاہیے تھا۔۔۔۔''

''لیکن میں تو ملک سے باہر تھا اور پھر جب یہاں تھا تب بھی پتا نہیں چلا میں تو سمجھ رہا تھا کہ بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ بدل گئی ہے۔۔۔۔''

وہ آفس سے اٹھے تو قدموں میں جان ہی نہ تھی۔ اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے گھر پہنچے سلطانہ ان کی بے وقت آمد پر حیران ہوئی۔

''تم! اس وقت۔۔۔۔''

دو دن سے وہ گھر پر ہی تھی۔ جب سے محب اللہ واپس آئے تھے اور آج صادق نے اسے کہا تھا کہ گیارہ بجے آ جائے ایک بڑے فلم پروڈیوسر سے ملنے جانا ہے۔

''اس کی فلمیں ہٹ ہو گئیں تو بس سمجھو کہ وارے نیارے۔۔۔۔''

محب اللہ نے ایک چبھتی ہوئی نظر اس پر ڈالی۔

''کہیں جا رہی تھیں آپ۔۔۔۔!''

''ہاں! وہ بھائی صادق نے بلایا ہے۔ ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

انہوں نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی گہرے میک اپ اور ہاتھوں کانوں میں فل جیولری کے ساتھ وہ باپ کی مزاج پرسی کو جا رہی تھی۔

''بیٹھ جائیے۔۔۔۔ آپ کے والد تو غالباً اس وقت جاب پر ہوں گے۔۔۔۔''

''جی۔۔۔۔!'' وہ کچھ ٹپٹائی اور بھاری پلو سنبھالتے ہوئے بیٹھ گئی۔

''سلطانہ بیگم! آپ کو یاد ہو گا کہ ملائکہ کی پیدائش سے پہلے میں نے آپ کو کیا سمجھایا تھا۔۔۔۔''

''تو میں نے کیا تمہاری عزت کو بٹہ لگایا ہے۔۔۔۔؟''

''کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی آپ نے۔۔۔۔ میں نے گانے سے منع کیا تھا۔''

''تو کیا بڑے بڑے گھرانوں کے لوگ گا نہیں رہے۔'' وہ چمک کر بولی۔

صادق نے ہمیشہ کہا تھا ''کہ بہادر بن کر، نڈر بن کر بات کرنا، جب بھی محب اللہ نے ایسی کوئی بات کی ظاہر ہے ایک دن پتا تو چلے گا ہی۔''

''لیکن میں نے آپ کو سختی سے منع کیا تھا۔'' محب اللہ خان ضبط کی انتہاؤں پر تھے اور آپ نے کسی فلم میں بھی۔۔۔۔''

''کیا ہوا تم یوں ہی ناراض ہو رہے ہو۔ ارے۔۔۔۔ دیکھنا ایک دن جب میں ہیروئن بن جاؤں گی۔ تو تم بھی فخر کرو گے کہ تم سلطانہ عرف شامی کے شوہر ہو۔''

''شٹ اپ۔۔۔۔'' ان کا ضبط جواب دے گیا۔

''تم اپنا یہ فخر اپنے پاس رکھو اور آج کے بعد جی بھر کر گاؤ، ناچو، فلموں میں کام کرو، جو مرضی کرو، میں نے تمہیں طلاق دی۔''

لمحہ بھر کو سلطانہ ہکا بکا ہوئی دوسرے ہی لمحے ہنس پڑی۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ تم طلاق دو گے تو مجھ سے کوئی شادی نہیں کرے گا؟''

''میرا کوئی خیال نہیں ہے سلطانہ بیگم! آپ میرے گھر کو خالی کر دیں اور جو لینا چاہیں لے جائیں۔ قانونی اور کاغذی کارروائی شریعت کے مطابق ہوتی رہے گی۔''

سلطانہ نے سب کچھ سکون سے سنا اور صادق کو فون کرنے لگی۔ محبّ خان نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر نڈھال قدموں سے چلتے ہوئے اپنی اسٹڈی روم چلے گئے اور وہاں فون پر آپا کو صورت حال سے مطلع کیا۔ وہ بیڈ روم میں جانا نہیں چاہتے تھے تاکہ سلطانہ اپنا سامان وہاں سے اٹھا لے۔

کچھ ہی دیر بعد آپا اور ان کے شوہر آ گئے فون پر ظاہر ہے تفصیلات نہیں بتائی جا سکتی تھی۔ سلطانہ بیڈ روم میں تھی۔ وہ سیدھی اسٹڈی میں چلی گئیں۔

''تم نے ٹھیک کیا ہے محبّ اللہ خان! اور بالکل صحیح وقت پر فیصلہ کیا ہے۔ اپنے خاندان کی عزت سر بازار اچھلتے دیکھنا آسان نہیں اور۔۔۔بچی۔۔۔بچی کا کیا ہوگا؟''

''ہاں بچی۔۔۔''! انہیں اچانک خیال آیا۔

''اس سلسلے میں بات نہیں ہوئی لیکن اگر سلطانہ نے اسے لے جانا چاہا تو میں روک نہ پاؤں گا۔''

''ہماری بچی رل جائے گی محبّ۔۔۔!'' آپا ملول تھیں۔

''ایسے لوگوں سے جو اتنے لالچی اور گھٹیا ہوں کوئی ڈیل کی جا سکتی ہے۔'' بھائی نے مشورہ دیا۔

لیکن کسی ڈیل کی نوبت ہی نہ آئی۔ جب سلطانہ صادق کے آنے کے بعد تین چار کپڑوں سے بھرے صندوق سوزوکی میں رکھوا چکی، لاکر میں رکھے زیور سے بیگ بھرے، دراز وغیرہ میں جتنی نقدی تھی وہ سب بھی نکال لی۔ صادق نے جاتے جاتے محبّ اللہ کا قیمتی پین اٹھا لیا تھا۔ صادق کو بیگ دے کر وہ اسٹڈی کی طرف بڑھی اور دروازے کو پاؤں سے کھولا۔

''سنو۔۔۔محبّ اللہ خان! جا رہی ہوں تمہارے گھر سے اور خوش ہوں کہ تم جیسے

تنگ نظر شخص سے بن چھوٹ گئی، چاہو تو ابھی تینوں طلاقیں دے دو، تم کیا سمجھتے تھے کہ روؤں گی، پیٹوں گی تمہارے پاؤں پڑوں گی کہ اور دو طلاقیں مت دو، میرے پچھلے مر نہیں گئے۔۔۔۔''

محبّ اللہ ہونٹ بھینچے کھڑے تھے۔ آپا آگے بڑھیں۔

''سلطانہ! ابھی بھی وقت ہے سوچ لو۔۔۔۔ ایسے ہی سانچے میں ڈھل جاؤ جیسے محبّ چاہتا ہے۔''

''ہوں۔۔۔۔'' وہ طنز سے ہنسی۔

''سانچے میں ڈھل جاؤں۔۔۔۔''

تب ہی آیا رین رین کرتی ہوئی بچی کو گود میں لیے نرسری سے باہر آئی۔

''بیگم صاحبہ! آج دودھ بھی نہیں پی رہی۔ جتنا دودھ پیتی ہے ساتھ ہی قے کر دیتی ہے۔''

کالی سوکھی سڑی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، میلے کپڑے، ایک لمحہ کے لئے سلطانہ نے اسکی طرف دیکھا۔ تب ہی صادق نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''چلو شانو۔۔۔۔!''

''یہ ملکی۔۔۔۔؟''

''جہیز میں نہیں لائی تھی تم۔۔۔۔ جس کی ہے سنبھال لے گا۔۔۔۔''

''لیکن۔۔۔۔'' سلطانہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''چپ کرو۔۔۔۔ یہ مرتی ہوئی بچی لے کر کیا کرو گی، کون سنبھالے گا، نری مصیبت۔۔۔۔ تمہارا کیریئر نہیں بننے والا شانی! اس کے ہوتے ہوئے۔۔۔۔ اول تو یہ بچے گی نہیں اگر بچ گئی تو یہاں رہ کر زیادہ فائدہ پہنچا سکتی ہے تمہیں۔۔۔۔''

''سنو۔۔۔۔!'' آپا کے میاں نے اسے آواز دی۔

''بچی ہمارے پاس رہے گی۔ تمہارا اس پر کوئی دعویٰ نہیں ہوگا، تمہیں لکھ کر دینا ہوگا۔''

''لکھ دیں گے میاں جی! لیکن ایسے ہی نہیں پہلے طلاق کی کارروائی مکمل

ہو جائے پھر بات کریں۔"

صادق نے سلطانہ کو وہیں چھوڑ کر قدم پیچھے موڑا۔ اسکی آنکھوں میں یکدم چمک سی پیدا ہوئی۔ محبّ اللہ واپس اسٹڈی میں چلے گئے تو آپا نے آیا کی گود سے بچی کو لے لیا۔

"یہ کیسے۔۔۔۔۔؟" محبّ اللہ نے کچھ کہنا چاہا تو آپا نے اسے تسلی دی۔

"پہلے کون سا اسے سلطانہ کی گود میسر تھی جواب کچھ فرق پڑے گا۔ میں پالوں گی اسے بس تم اس کی طرف بے فکر ہو جاؤ اور پہلے تو کسی ڈاکٹر کو بلاؤ گھر پر یا ہاسپٹل چلو بچی کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی مجھے۔ سلطانہ تو تھی ہی ایسی تم نے بھی بچی کی طرف کوئی خیال نہیں دیا۔ غضب خدا کا کیسی پھول جیسی بچی تھی اور کیا حالت ہوگئی۔"

محبّ نے سسکیاں لیتی بچی کی طرف دیکھا اور ان کے دل کو جیسے کچھ ہوا وہ یکدم اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپا! آیئے بچی کو لے کر میں گاڑی نکالتا ہوں۔" ڈاکٹر اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"آپ نے اب تک بچی کا چیک اپ نہیں کروایا۔ یہ ڈیہائیڈریشن کا شکار ہے جسم سے پانی تقریباً ختم ہو چکا ہے حیرت ہے یہ اب تک زندہ کیسے ہے؟"

ملک محبّ اللہ پشیمان سے ہوگئے۔

"اللہ سے دعا کریں ہم اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔" اور پھر اللہ نے دعائیں سن لیں بچی زندگی کی طرف لوٹ آئی لیکن ایک اور مسئلہ اس کے سر پر لگی ہوئی چوٹ تھی اس چوٹ نے دماغ کو بھی متاثر کیا تھا۔ آپا نے استفسار پر بتایا۔

"کہ چند ہفتے قبل وہ کاٹ سے گر گئی تھی۔" وہ صحت یاب تو ہوگئی تھی لیکن اس کے منہ سے رال ٹپکتی تھی اس وجہ سے ڈاکٹرز اس کی دماغی صحت کے متعلق متذبذب تھے۔

آپا کی محنت اور دعائیں رنگ لائیں تھیں چند ہی ماہ میں اس کی رنگت لوٹ آئی تھی اور وہ اتنی صحت مند اور پیاری ہوگئی تھی کہ دیکھنے والے کو بے اختیار اس پر پیار آتا لیکن تین سال کی عمر تک اس نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ محبّ اللہ خان اسے باہر بھی لے گئے ڈاکٹروں نے انہیں اطمینان دلایا کہ وہ بولنے لگے گی۔

"ہاں۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کچھ تاخیر سے بولے، یا ممکن ہے وہ ذہنی طور پر کچھ کمزور ہو، لیکن ابنارملٹی والی کوئی بات نہیں۔" جب محبّ اللہ ملائکہ کو واپس لے کر آئے تو آپا نے ایک دن انہیں گھیر لیا۔

"ایسا کب تک چلے گا محبّ۔۔۔۔۔!"

"کیسا آپا۔۔۔۔؟"

"یہی کہ کب تک تنہا اور اکیلے زندگی گزارو گے شادی کرلو۔۔۔۔"

"کی تو تھی۔۔۔۔۔" وہ افسردہ تھے۔

"ضروری تو نہیں کہ ہر لڑکی سلطانہ جیسی ہو، پھر اپنے غلط فیصلے کی سزا کب تک خود کو دو گے۔۔۔۔ کب تک تنہا رہو گے۔"

"ملائکہ ہے نا آپا! تنہا کب ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"لیکن ملائکہ تو تم مجھے دے چکے ہو۔۔۔۔"

"آپ ہی کی ہے۔ آپ نہ ہوتیں تو یہ شاید زندہ نہ رہتی۔"

"خیر زندگی دینے اور لینے والی ذات اللہ کی ہے۔" آپا نے محبّ اللہ کی طرف دیکھا ان تین سالوں میں جیسے ان کے چہرے اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

"محبّ! خلاف فطرت زندگی گزارنا تو رب کو بھی پسند نہیں ہے۔ ایک بار تم نے خود ہی فیصلہ کیا تھا اب ایک بار مجھ پر اعتماد کر کے دیکھو۔"

"میری سب سے بڑی نند کی بیٹی مائرہ بہت اچھی سلیقے والی ہے، سمجھ دار ہے، پڑھی لکھی ہے، اگر تم مان جاؤ تو میں تمہارے بھائی صاحب سے بات کروں۔"

"ٹھیک ہے آپا۔۔۔۔!" ان کے سامنے تو وہ ہمیشہ بے بس ہو جاتے تھے۔ آپا کے لیے تو ان کی رضامندی ہی بہت اچھی تھی۔ وہ دوسرے دن ہی نند کے گھر جا پہنچیں مائرہ سے بات کی وہ بہت صاف گو لڑکی تھی۔

"مامی! مجھے کوئی اعتراض نہیں آپ کے بھائی یقیناً بہت اچھے انسان ہیں اور ان کی ہمراہی باعث فخر ہے میرے لیے، سلطانہ ان کی زندگی سے جا چکی۔ اس کا ذکر میرے لیے اہم نہیں لیکن ملائکہ موجود ہے۔ معصوم بچی ہے۔ لیکن ایک بات کی میں وضاحت کروں

گی کہ شاید میں اس سے محبت نہ کرسکوں، میں اسکا خیال بھی رکھوں گی، میرا رویہ اس کے ساتھ روایتی قسم کی سوتیلی ماؤں والا تو ہرگز نہیں ہوسکتا، لیکن میں نہیں سمجھتی کہ میں اس سے انصاف کرپاؤں گی۔"

"ملائکہ میری بیٹی ہے مائرہ! اور اسے میرے پاس ہی رہنا ہے۔"

مائرہ ایک اچھی اور محبت کرنیوالی بیوی ثابت ہوئی تھی ہر لحاظ سے مائرہ ان کے معیار پر پوری اتری تھی۔ وہ آپا کے شکرگزار تھے لیکن پتا نہیں کیوں سلطانہ والے واقعہ کے بعد ان کا دل نہیں لگتا تھا یہاں سو وہ آہستہ آہستہ کینیڈا کے لیے کوشش کررہے تھے اور شادی کے صرف چھ ماہ بعد انہیں کینیڈا کی مائیگریشن مل گئی تو انہوں نے کینیڈا کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ آپا افسردہ تھیں۔

"اپنے وطن میں کیا برائی ہے محبت۔۔۔۔۔!"

"بس آپا دل اچاٹ ہوگیا ہے یہاں سے۔" جانے سے دودن پہلے آپا کے پاس آئے تھے ملائکہ کے لیے ڈھیر سارے کھلونے لے کر۔۔۔۔۔

تب ہی پھولے پھولے گلابی فراک میں ملائکہ بھاگتی ہوئی آئی تو انہوں نے دونوں بازو پھیلائے وہ ان کے بازوؤں میں سما گئی۔

"بابا۔۔۔!"

"آپا! آج صدقہ خیرات کردیجیے گا بہت سارا۔ میری بیٹی نے پہلا لفظ بولا ہے۔" وہ خوشی سے بولے۔

"ہاں۔۔۔ آج صبح اس نے اماں بھی کہا۔ یہ ساری کوشش عرفی کی ہے، وہ سارا دن اس کیساتھ لگا رہتا ہے۔"

"میں آپ اور بھائی صاحب کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ آپ نے جو کچھ میری بیٹی کے لیے کیا ہے وہ احسان کبھی۔۔۔۔۔"

"فضول باتیں مت کرو محبت!" آپا نے انہیں ڈانٹ دیا۔

"تمہاری بیٹی میرا اپنا ہی خون ہے۔" انہوں نے محبت سے ملائکہ کو دیکھا جو محبت اللہ کی گود میں بیٹھی ان کے کالر سے کھیل رہی تھی۔ آپا کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"پتا نہیں کب۔۔۔۔ کب۔۔۔۔ پھر دیکھ پائے گی اپنے باپ کو؟"

"آپا میں رابطہ رکھوں گا، آتا رہوں گا، فون پر بات تو ہوتی رہے گی۔"

انہوں نے آپا کی نم ہوتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر تسلی دی لیکن وقت اور حالات انسان کے طابع نہیں ہوتے۔ محب اللہ کینیڈا آگئے تو دس سال تک واپس نہ آئے البتہ بہن سے فون پر بات ہوجاتی تھی۔ بیٹی سے بھی بات چیت ہوتی رہی ان دس سالوں میں وہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے باپ بن چکے تھے۔

دس سال بعد وہ بہنوئی کی وفات پر آئے تو ملائکہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے تیرہ چودہ سال کی ملائکہ نہ صرف یہ کہ بے حد حسین ہوچکی تھی بلکہ ذہین بھی بہت تھی۔ وہ بچی جس کے متعلق ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ شاید وہ اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں ذہنی طور پر کچھ کمزور ہوگی۔ وہ پڑھائی میں سب سے آگے تھی۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بہت شوق سے حصہ لیتی تھی۔ ڈھیروں کپ، ٹرافی، کتابیں جب اس نے محب اللہ خان کو دکھائیں تو اللہ کی اس مہربانی پر محب اللہ خان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"محب! میں چاہتی ہوں کہ ملائکہ کو تم مجھے میرے عرفان کے لیے دے دو۔"

"آپا! یہ آپ ہی کی ہے اس کے متعلق ہر فیصلہ آپ کو ہی کرنا ہے۔" محب اللہ خان ایک ماہ بعد جب واپس جارہے تھے وہ ننھے بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

"آپ پھر کب آئیں گے؟"

"بہت جلد گڑیا۔۔۔۔!"

لیکن وہ اپنا وعدہ نبھا نہ سکے۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا اور مزید دس سال بیت گئے۔ ملائکہ نے گو ماسٹر کرلیا تھا۔ لیکن وہ چھوٹی چھوٹی بات بھی آپا سے پوچھتی تھی۔

"پھپھو! میں یہ ریڈ کپڑے پہن لوں، یہ اسکارف اوڑھ لوں، یہ کتاب خرید لوں۔"

وہ خود سے فیصلہ نہ کرپاتی تھی کئی بار آپا نے سمجھایا۔

"چندا! اپنے اندر اعتماد پیدا کرو، خود فیصلہ کرو، کہ تمہیں کون سی کتاب خریدنی ہے، کون سے رنگ کے کپڑے پہننے ہیں، کیا کرنا ہے۔"

لیکن وہ فیصلہ ہی نہ کر پاتی اور پھپھو کی طرف بھاگتی پوچھنے کے لے۔

بچپن میں عرفان اس کا خوب مذاق اڑاتا تھا۔ امی پانی پی لوں، واش روم چلی جاؤں، یہ اسکول نہیں ہے، گھر ہے بے بی، یہاں تم بغیر پوچھے پانی پینے اور واش روم جا سکتی ہو لیکن اس پر عرفان کی باتوں کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ یوں ہی ذرا ذرا سی باتوں کے لیے آپا کی طرف دیکھتی تھی۔ جب ایک روز آپا کو کسی کام سے باہر جانا پڑا تو اسکول سے آکر وہ رات تک بھوکی بیٹھی رہی آپا آئیں تو حیران رہ گئیں۔

"ملائکہ بیٹا! ملازمہ سے کہا تھا وہ کھانا لگا لیتی اب تک بھوکی بیٹھی ہو۔"

"آپ جو نہیں تھیں تو۔۔۔۔۔"

وہ رو پڑی تھی اور تب آپا نے سنجیدگی سے سوچا تھا کہ ملائکہ میں جو اعتماد کی کمی ہے اس کے لیے انہیں سنجیدگی سے کچھ کرنا چاہیے انہوں نے بچپن میں اس کو بالکل ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھا تھا اگرچہ وہ بالکل نارمل تھی وہ اپنی کلاس کی ذہین ترین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی لیکن اگر کوئی خلاف مرضی بات ہو جاتی تو وہ پاؤں مار مار چیخ چیخ کر روتی کہ رنگ سرخ ہو جاتا تھا، سانس بند ہونے لگتا، تو ایسے میں رال بہنے لگتی۔ انہوں نے جب ڈاکٹروں سے بات کی تو انہوں نے یہی کہا تھا کہ اسے ضد نہ دلائیں اور کوشش کریں کہ اس کی ہر بات مان لی جائے۔ یوں شاید انہوں نے اس کا خیال حد سے زیادہ رکھا تھا۔

ہر وقت اس کے ساتھ ہی رہتی تھیں لیکن انہیں ہمیشہ ساتھ نہیں رہنا اسے اپنی ایک الگ زندگی شروع کرنا تھی، ایک گھر چلانا تھا، بچے پالنے تھے، انہوں نے عرفان اور محب اللہ سے مشورہ کر کے تھرڈ ائیر میں اسے لاہور کے کالج داخل کرا دیا۔ سب کا خیال تھا کہ ہوسٹل میں رہ کر اس کے اندر اعتماد پیدا ہو جائے گا۔

"آپ مجھے لاہور کیوں بھیج رہی ہیں؟" وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔

"وہاں کا معیار تعلیم بہت اچھا ہے کنیئرڈ میں تمہارا ایڈمیشن ہوا ہے۔"

"لیکن وہاں اکیلی نہیں جاؤں گی پھپھو! یہیں پڑھ لوں گی، یہاں بھی سب اچھا ہے سب۔۔۔۔۔"

"ہاں! لیکن میں چاہتی ہوں میری بیٹی بہت اچھے کالج میں پڑھے۔"

"اچھا۔۔۔۔" وہ ان کی بات مان بھی لیتی تھی، قائل بھی ہو جاتی تھی پھر بھی اس نے کہا تھا۔

"لیکن مجھے وہاں ڈر لگے گا پھپھو۔۔۔۔!"

"وہاں اور لڑکیاں بھی ہوں گی اور پھر عرفی تم سے ملنے آتے رہیں گے۔"

یوں اسے لاہور بھیج دیا گیا۔ شروع شروع میں تو وہ بہت گھبرائی۔ تقریباً روز کلاس سے باہر نکل کر پی سی او سے فون کرتی۔ ہفتے بھر بعد آپا اسے ملنے آئیں تو وہ ان کے گلے لگ کر خوب روئی۔ وہ سیاہ شلوار پر سرخ ڈاٹس والی شرٹ پہنے ہوئے تھی، ملگجے کپڑوں میں ملبوس وہ ان کے گلے میں باہیں ڈالے خوش خوش بیٹھی تھی۔

"ملائکہ! آپ نے کتنے دن سے کپڑے چینج نہیں کیے۔"

"جب سے کراچی سے آئی ہوں۔" اس نے لاپرواہی سے بتایا۔

"اب آپ بتائیں نہ کون سے پہنوں؟" تو انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"ملائکہ! تم بچی نہیں ہو اب اتنے دن سے تم کالج بھی ان ہی کپڑوں میں جا رہی ہو۔"

"نہیں کالج تو دوسرے پہن کر جاتی ہوں یہ تو ہاسٹل میں آکر پہنتی ہوں۔"

ایک لمحے کو ان کا جی چاہا کہ اسے واپس کراچی لے جائیں معصومیت سے اپنی طرف تکتی ملائکہ پر انہیں بے طرح سے پیار آ رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے اپنے دل پر جبر کیا کہ اس کا یہاں رہنا ہی بہتر تھا اور شاید ان کا فیصلہ صحیح تھا۔ کچھ ہی عرصہ میں اس کے فونز میں کمی آگئی، اب وہ فون کر کے چھوٹی چھوٹی باتیں ان سے نہ پوچھتی تھیں، اس لیے گریجویشن کے بعد آپا نے اسے واپس بلوا لیا۔

"اب ماسٹرز یہاں سے کر لو۔"

"مگر میری فرینڈز لاہور میں ہی ایڈمیشن لیں گی۔" وہ کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔

"ملائکہ! تمہیں اب یہیں پڑھنا ہے۔"

"اچھا۔۔۔۔" اس نے پھپھو کی بات پر زیادہ حجت نہیں کی تھی۔ لیکن وہ کئی دن

اپ سیٹ سی رہی۔

دراصل اپنی روم میٹ مونا سے اس کی بہت دوستی ہوگئی تھی اور مونا نے گویا پھپھو کی جگہ سنبھال لی تھی۔ فیصل آباد سے آنے والی مونا اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اور فطرتاً بہت خیال رکھنے والی تھی۔

اس نے کچھ دن تو خاموشی سے ملائکہ کو دیکھا وہ نہ اپنے بیڈ کی چادر درست کرتی تھی، نہ کمبل کو تہہ کر کے رکھتی، تین چار دن تک میلے کپڑے پہنے رکھتی، اپنا کپ دھونا بھی اسے عذاب لگتا تھا، اکثر یاد ہی نہ رہتا کہ کپ اور پلیٹ دھو کر رکھنا ہے لیکن پھر اس سے ملائکہ کی یہ لاپروائی برداشت نہ ہوئی وہ ہولے ہولے اسے ٹوکنے لگی۔

"ملائکہ! یہ اپنا تولیہ اسٹینڈ پر ڈال دو، کتابیں بیڈ سے اٹھا کر ٹیبل پر رکھ دو یا کپڑے چینج کرلو وغیرہ۔" ملائکہ خاموشی سے سر ہلا کر اس کی بات مان لیتی اس بات نے مونا کو متاثر کیا۔

یقیناً والدین کی اکلوتی بیٹی ہے، کام کی عادت نہیں ہے اور پھر اس کی بے تحاشہ خوبصورتی اور معصومیت، کئی کام اس نے خود ہی اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ جلد ہی دونوں میں بہت گہری دوستی ہوگئی تھی اس نے مونا کو بتایا تھا۔

"کہ وہ اپنی پھپھو کے پاس رہتی ہے۔ اس کے بابا، آنٹی یعنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائی باہر رہتے ہیں۔"

"اور تمہاری ماں؟ کیا ان کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔"

"ہاں شاید۔۔۔۔ میرے بہت بچپن میں ایک بار پھپھو نے بتایا تھا کہ میں سال سوا سال کی تھی جب وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔"

"اس کی ماں کیسی تھی؟ کون تھی؟ اور اسے کیا ہوا تھا؟ اس نے کبھی پوچھا نہیں تھا نہ اس کا ذکر کیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس بار وہ کراچی گئی تو پھپھو سے ضرور اپنی ماں کے متعلق پوچھے گی۔ مونا نے پوچھا تھا۔

"کیا تمہاری مما بھی تمہاری ہی طرح خوبصورت تھیں۔"

اور اس نے مونا سے کہا تھا" کہ پھپھو سے پوچھ کر بتائے گی۔" اور جب چھٹیوں

میں وہ کراچی گئی اور اس نے پھپھو سے یہ بات پوچھی تو پھپھو کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی تھیں پھر آہستگی سے کہا تھا۔

"نہیں مری جان! وہ تمہاری جیسی خوبصورت نہ تھی لیکن ایک عام نظر رکھنے والے بندے کی نظر میں شاید خوبصورت ہی ہو، تم سے بھی زیادہ۔۔۔۔ مگر مجھے وہ ہمیشہ بہت بدصورت دکھی۔"

وہ حیران سی انہیں دیکھ رہی تھی اور ان کی بات کے معنی اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر ناکام ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

"پھپھو! مما کیا میری پیدائش پر فوت ہوگئی تھیں۔"

"نہیں۔۔۔۔" تو پھوپھو نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم سے کس نے کہا کہ وہ فوت ہوگئی ہیں۔"

"تو کیا آنٹی ہی میری مما ہیں۔۔۔۔۔" اس نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔۔۔۔" پھپھو سنجیدہ تھیں۔

"ملکی! اب تم اتنی بڑی ہو چکی ہو کہ ہر بات سمجھ سکتی ہو، کیلکولیٹ کر سکتی ہو، تمہاری مما نے تمہارے پپا سے طلاق لے لی تھی اور تمہیں چھوڑ گئی تھی۔" وہ منہ کھولے حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

"مگر کیوں۔۔۔۔؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

"زمین آسمان کا فرق تھا، سو نبھ نہ سکی۔۔۔۔" انہوں نے بات ختم کردی۔

"اچھا۔۔۔۔ لیکن اب وہ کہاں ہیں؟"

"معلوم نہیں۔ ایک بار عرفی کے ابا جان نے بتایا تھا کہ انہوں نے لاہور میں دیکھا تھا اسے۔ شاید وہ لوگ یہاں سے لاہور چلے گئے تھے۔ لیکن جب تک وہ یہاں رہے، تب بھی کبھی تمہیں دیکھنے یا ملنے نہیں آئی، حالانکہ تمہارے بابا نے کہا تھا مجھ سے اگر کبھی سلطانہ ملائکہ سے ملنے آئی تو اسے ملنے دینا کہ یہ اس کا حق ہے۔"

"تم ملنا چاہتی ہو اس سے۔۔۔۔؟" کچھ توقف کے بعد پھپھو نے پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟ مجھے ان سے ملنا چاہیے یا نہیں، لیکن اسے تمہارا خیال

ہوتا تو کبھی تو رابطہ کرتی، کبھی تو پوچھتی تمہارا، اتنے برس گزر گئے، پتا نہیں کہاں ہے کس جگہ ہے اب کہاں ڈھونڈو گی اسے۔۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔آپ صحیح کہتی ہیں انہیں ملنا ہوتا، میرا خیال ہوتا، تو کبھی تو ملنے آتیں۔'' ملائکہ کو پھپھو کی بات صحیح لگی تھی اور وہ سچ ہی کہہ رہی تھی کہ کہاں ڈھونڈے گی وہ انہیں۔ پھر پھپھو نے ماں سے کم پیار تو نہیں دیا تھا اسے بلکہ زیادہ ہی دیا تھا۔

''میری ماں تو آپ ہیں۔۔۔۔''

اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ان کا چہرہ چمک اٹھا۔

دو سال تک مونا اس کی نگران بنی رہی، اب مونا سے الگ ہو کر وہ اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ لیکن پھپھو چاہتی تھیں کہ وہ ان کی نظروں کے سامنے رہے۔ یہ دو سال بھی محض اس کی بہتری کی خاطر انہوں نے اسے دور بھیجا تھا۔ ورنہ ہر لمحہ انہیں اس کی فکر رہتی تھی۔

کچھ دن تک وہ مونا کو مس کرتی رہی لیکن ہولے ہولے پھر پھپھو کے زیر اثر ہو گئی۔

''پھپھو یہ ڈریس پہن لوں، اس کے ساتھ یہ جوتی کیسی لگے گی، وہ پھر ان سے مشورے کرنے لگی تھی۔ تاہم لاہور کی رہائش سے اتنا فرق ضرور پڑا تھا کہ کئی کام وہ خود کرنے لگی تھی۔ اس کی بات چیت میں اعتماد بڑھ گیا تھا، وہ پھپھو کی عدم موجودگی میں بھی خود کو محفوظ محسوس کرتی تھی اور ان سے پوچھے بغیر بھی کام کر لیتی تھی۔

انہی دنوں عرفان کو محب اللہ خان نے کینیڈا بلوا لیا وہ یہاں اپنی جاب سے مطمئن نہ تھا اور چاہتا تھا کہ شادی سے پہلے ایک پر امید مستقبل اس کے سامنے ہو۔ محب اللہ خان سے بات ہوئی تو انہوں نے اسے وہاں بلوا لیا۔

عرفان چلا گیا اور پھپھو کی تمام توجہ کا مرکز صرف وہی رہ گئی اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا، اس کی پسند کے مطابق کھانے پکوانا، اس کی شاپنگ کرنا، سب انہوں نے اپنے ذمے لے لیا تھا، حالانکہ عرفان نے جاتے جاتے کہا تھا۔

''ملکی بیگم! اب کچھ میری اماں کی بھی خدمت کر لو، بہت خ[illegible] کروالی ہے، ان سے۔۔۔۔''

''ہاں۔۔۔تو میری اماں ہیں نا۔۔۔۔'' وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھ گئی تھی اور پھپھو نہال ہو گئیں تھیں۔ ان دنوں جب وہ ماسٹر کرنے کے بعد بور ہو رہی تھی۔ پھپھو نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ککنگ کی کلاسز اٹینڈ کر لے، ڈرائیونگ سیکھ لے، میک اپ کا کورس کر لے۔

''ہاں یہ صحیح ہے۔''

اسے پھپھو کا مشورہ پسند آیا تھا اور اس نے فوراً ہی ایک انسٹیٹیوٹ میں ایڈمیشن لے لیا، جہاں سارے کورس تھے، وہاں اس کی دوستی عفیرا سے ہو گئی تھی۔ عفیرا مما کی بوتیک چلاتی تھی، والد وفات پا چکے تھے، کبھی کبھار وہ فیشن شو بھی منعقد کرواتی تھی، عفیرا نے اسے بتایا تھا کہ آج کل وہ کسی گارمنٹ فیکٹری کی طرف سے فیشن شو کی تیاری کر رہی ہیں۔ عفیرا نے اسے اس فیشن شو میں حصہ لینے پر اکسایا۔

''یار! میں نے مما سے تمہاری اتنی تعریف کی ہے کہ وہ تو بن دیکھے ہی تم پر عاشق ہو گئی ہیں۔''

''مگر میں نے پہلے تو کبھی کسی فیشن شو میں شرکت نہیں کی۔۔۔۔''

''تو اب کر لو نا یار! میں بھی اس میں حصہ لے رہی ہوں۔۔۔۔ سچ بہت مزا آتا ہے میں نے پہلے بھی حصہ لیا ہے۔''

''اچھا میں پھپھو سے پوچھوں گی۔''

''جلدی پوچھ کے آنا پلیز۔۔۔۔۔۔''

''وہ تھوڑی سی بھلکڑ تھی اسلئے اسے یاد ہی نہیں رہا پھپھو سے پوچھنا۔ اگلے روز انہیں اچانک فیصل آباد جانا پڑ گیا جہاں ان کی چھوٹی نند رہتی تھیں۔

''عرفی کی پھپھو کی طبیعت خراب ہے ملائکہ! اور مجھے فیصل آباد جانا ہے تم ذرا اپنے دو چار جوڑے رکھ لو بیگ میں یہاں تنہا کیسے رہو گی؟''

وہ وارڈ روب کھولے کچھ دیر کھڑی رہی اور پھر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کون سے کپڑے اور کیا کیا بیگ میں رکھے۔

''میرا جانا کیا ضروری ہے؟'' وہ واپس بیڈ پر لیٹ کر میگزین دیکھنے لگی۔

پھپھو آئیں تو انہیں حیرت ہوئی۔

"تم تیار نہیں ہوئیں بیٹا۔۔۔!"

"پھپھو اگر میں گھر ہی رہوں تو۔۔۔۔"

"ہاں ہاں بے شک رہ لو۔۔۔"

وہ تو میں اس خیال سے کہہ رہی تھی کہ اکیلے گھبراؤ گی ایسی تو تھی وہ۔۔۔۔"

"رقیہ ہے نا۔۔۔ملازم سب پرانے ہیں۔ میں رقیہ سے کہہ دیتی ہوں وہ تمہارے کمرے میں سوئے گی۔ دو دن کی بات ہے۔۔۔۔"

ٹھیک ہے پھپھو آپ بے فکر ہو کر جائیں۔" اور پھپھو کے جانے کے بعد عفیرا آدھمکی۔

"تم نے پوچھا۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔"

"تو اب پوچھ لو۔۔۔۔"

"مگر وہ تو فیصل آباد چلی گئی ہیں دو دن تک آئیں گی۔۔۔۔" مگر ماما نے تو آج فائنل کرنا ہے میں تو تمہیں لینے آئی تھی اور یوں بھی تمہاری پھپھو تو ہر بات مانتی ہیں تمہاری، منع نہیں کریں گی۔۔۔۔"

اور وہ عفیرا کے ساتھ اس کی ماما کے پاس چلی آئی انہوں نے اسے پسند کیا۔

پھپھو کو فیصل آباد میں زیادہ دن لگ گئے کیونکہ انکی نند کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ عفیرا کے ساتھ انسٹیٹیوٹ سے اس کی مما کے بوتیک میں چلی جاتی تھی اسے مزا آتا۔ وہ تقریباً روز ہی اس سے فون کر کے خیر خیریت پوچھتی تھیں اور اسے پریشان نہ پا کر بہت اطمینان محسوس کرتی تھیں انہوں نے عرفان کو بھی بتایا۔

"کہ ملائکہ کو کراچی ہی چھوڑ آئی ہیں۔۔۔۔"

"ارے مام! وہ بونگی لڑکی کہیں مارے خوف کے اس کا انتقال نہ ہو جائے اور کہیں دنوں سے بھوکی ہی نہ بیٹھی رہے۔۔۔۔"

"مذاق نہیں عفی! ملکی بہت سمجھدار ہے اور اب وہ ننھی بچی نہیں ہے ماسٹرز کر چکی

ہے۔"

"چلیں آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں، بعد میں تجربہ بھی ہو جائے گا۔" وہ خوش دلی سے ہنسا تھا۔

گو وہ ملائکہ کی طرف سے مطمئن تھیں پھر بھی وہ دسویں کے بعد سب کے روکنے کے باوجود واپس آگئیں ملائکہ بہت خوش اور مطمئن تھی اس نے ان کے آتے ہی اپنے فیشن شو میں شرکت کے متعلق انہیں بتایا۔ تو وہ ایک لمحے کو چپ ہو گئیں۔ دو دن بعد اس فیشن شو کا انعقاد ہونا تھا۔ اب وہ کیا کہتیں اور یوں بھی اپنی زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ کیا تھا۔ وہ اسے بددل نہیں کرنا چاہتی تھیں سو انہوں نے ٹھیک ہے کہہ کر بات ختم کر دی۔

"آپ چلیں گی نا میرے ساتھ۔ میں دو گیسٹ لے کر جا سکتی ہوں۔"

"ہاں۔۔۔۔۔"

اور اس وقت بہت تھکی ہوئی تھیں اس لیے مختصر بات کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اتنے دن کی تھکن رنگ لائی تھی اور انہیں ٹمپریچر ہو گیا تھا اس لیے وہ ملائکہ کے ساتھ اس کے شو میں شرکت کے لیے نہ جا سکی تھیں۔ ملائکہ تو بہت پرجوش تھی اسے پھپھو کے نہ جانے کا بہت افسوس تھا۔ شو بہت کامیاب رہا تھا اور بقول عفیرا کے وہ تو پورے شو پر چھا گئی تھی۔ اس کی خوبصورتی، چہرے کی فطری معصومیت اور پھر ڈائیلاگ ڈلیوری۔۔۔۔ سب ہی کمال کی تھی۔ ڈائیلاگ تو ایک دو ہی تھے پر چہرے کے ایکسپریشن کمال کے تھے۔

عفیرا کی مام ہر سال نئے انداز میں ہی فیشن شو منعقد کرواتی تھیں۔ اس بار پس پردہ میوزک کے ساتھ کہیں کہیں ایک آدھ ڈائیلاگ بھی انہوں نے شامل کیا تھا۔ جس نے شو کو منفرد بنا دیا تھا۔ وہ عفیرا کے ساتھ مسرور سی کھڑی تھی کچھ دیر پہلے مما نے بے انتہا تعریف کی تھی۔ میکسی نما ڈریس میں وہ پری لگ رہی تھی۔ وہ سب کی توجہ کا مرکز تھی، آتے جاتے لوگ رک کر اسے دیکھتے اور مسکراتے تھے، کئی نوجوان لڑکوں، لڑکیوں نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلائے تھے۔ جواباً اس نے بھی ہاتھ ہلا دیا۔

"میرا خیال ہے اب میں جاؤں۔۔۔۔"

اس نے عفیرا سے اجازت چاہی۔

''پلیز! تھوڑا رکو نا مما کو آ جانے دو۔۔۔۔۔ وہ دراصل فوراً ہی فنکاروں کو ان کی پے منٹ کر دیتی ہیں یہ ان کا اصول ہے۔''

''پھپھو پریشان ہوں گی۔۔۔۔۔''

''اچھا تم رکو میں مما کو دیکھتی ہوں۔۔۔۔۔''

عفیرا چلی گئی تو اچانک ہی وہ دونوں اس کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ عورت نے گہرا میک اپ اور بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا لیکن اس کی بے حد سفید رنگت پر یہ رنگ برا نہیں لگ رہا تھا۔

''ہم تمہیں بہت دیر سے ڈھونڈ رہے تھے تم۔۔۔۔۔ تمہارا نام ملائکہ محب اللہ خان ہے۔۔۔۔۔'' اس شخص نے پوچھا۔

''یہ تمہارا اصلی نام ہے۔۔۔۔۔؟''

ہاں اس نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

عفیرا کی مما نے اس کا تعارف اسٹیج پر اسی نام سے کروایا تھا۔

''تمہارا باپ کیا کرتا ہے۔۔۔۔۔؟''

عورت بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ خوبصورت تھی لیکن اس کا لہجہ گنوار تھا۔

''پپا تو باہر ہوتے ہیں کینیڈا۔۔۔۔۔۔''

''اور تم۔۔۔۔۔۔'' وہ بہت بے تابی سے سوال کر رہی تھی۔

''میں پھپھو کے ساتھ رہتی ہوں۔۔۔۔۔''

''تمہارے باپ نے تمہیں یہاں کیوں چھوڑ دیا بہن کے پاس۔۔۔۔۔''

''دیکھیے! آپ یہ سب مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' ملائکہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''میری ممی زندہ نہیں۔۔۔۔۔ میری پھپھو نے مجھے پالا ہے۔''

''تیرے باپ نے شادی کر لی ہوگی دوسری۔۔۔۔۔ ہے نا۔۔۔۔۔'' وہ ہنسی

اور مرد کی طرف دیکھا۔

''یہ اپنی ملکی ہی ہے صادق! تو صحیح کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔''

''تمہاری والدہ کا نام کیا ہے؟'' مرد کی نظریں اس پر تھیں۔

''سلطانہ۔۔۔۔۔'' بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا۔ پہلی بار پھپھو سے یہ نام سنا تھا اور جانے ذہن کے کس کونے میں محفوظ ہو گیا تھا۔

''ہائے! میری بچی! میں ہوں تیری بدنصیب ماں۔۔۔۔۔'' عورت نے ایک دم بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

''اور یہ تیرا ماموں ہے۔۔۔۔۔'' عورت سے الگ ہو کر وہ حیران سی اسے دیکھنے لگی۔ یہ عورت اس کی ماں تھی؟ لیکن اس کے دل میں کوئی جذبہ نہیں ابھرا تھا۔ یہ عورت اسے چھوڑ گئی تھی اس وقت جب وہ بالکل ننھی سی تھی۔ حالانکہ اس وقت اسے ماں کی گود کی ضرورت تھی لیکن وہ کیوں چھوڑ گئی تھی۔ اسے پھپھو نے کوئی تفصیل نہیں بتائی تھی۔

''آپ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تھیں۔۔۔۔۔''

''وہ تو تیرے ماموں۔۔۔۔۔۔!''

''شانی۔۔۔۔۔!'' مرد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میں بتاتا ہوں اسے ساری بات۔۔۔۔۔''

''بیٹا! تمہاری ماں کو تمہاری پھپھو نے بسنے نہیں دیا۔ تمہارے باپ نے اپنی پسند سے شادی کی تھی بالآخر اس نے تمہاری ماں کو گھر سے نکال دیا۔ طلاق دلوائی اور تمہیں چھین لیا۔۔۔۔۔''

''نہیں۔۔۔۔۔'' اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

''آپ نے پھر کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔۔۔۔۔''

''نہیں ہم کئی بار آئے لیکن چوکیدار نے ہمیں اندر نہیں گھسنے دیا۔۔۔۔۔ کیسا کیسا تڑپتی تھی یہ تمہارے لیے۔۔۔۔۔ راتوں کو جاگ کر روتی اور تجھے پکارتی تھی۔۔۔۔۔ ارے میں نے تو تیرے باپ کے قدموں پر گر کر اس سے کہا کہ بس تم سے ملنے کہ اجازت دے دے۔ لیکن اس نے دھتکار دیا۔۔۔۔۔''

"نہیں ۔۔۔۔ بابا اور پھپھو اتنے ظالم نہیں ہو سکتے ہیں۔ پھپھو تو اتنی نرم دل ہیں ۔۔۔۔" وہ متذبذب سی کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی تب ہی عفیرا آ گئی اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔

"یار! مام تو بہت مصروف ہیں، تم چلی جاؤ تمہارا ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔ کل آؤں گی میں تمہاری طرف۔ پھر انسٹیٹیوٹ میں دو دن بعد ملاقات ہو گی ۔۔۔۔"

"اور ہاں ۔۔۔۔ ان سے ملو، سلیمان واسطی صاحب ہیں۔ تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔ ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے مالک ہیں۔"

"مس! میں آپ سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ کو ماڈلنگ سے کوئی دلچسپی ہے ۔۔۔۔؟"

"جی نہیں ۔۔۔۔" اس نے حیرت بھری معصومیت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اوہ ۔۔۔۔" وہ مسکرایا۔

"دراصل آپ کی پرفارمنس بہت زبردست تھی اور آپ کی فیس بیوٹی کے تو کیا ہی کہنے۔ میں چاہ رہا تھا کہ آپ کو ماڈلنگ کی آفر کروں کیونکہ ہماری کمپنی کے ایڈ بہت مقبول ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا ٹی وی پر فیری لان کا اشتہار ۔۔۔۔" فیری لان کا اشتہار تو اسے بہت پسند تھا۔

"ہاں ہاں ۔۔۔۔ بہت خوبصورت ہے۔" اس کی آنکھوں میں اشتیاق اتر آیا۔

"تو پھر آپ مجھے کل میرے آفس ملیے ۔۔۔۔"

اس نے وزٹنگ کارڈ نکال کر اسکی طرف بڑھایا تو اس نے جھجکتے ہوئے پکڑ لیا۔

"تو میں امید کرتا ہوں کہ میرے اگلے ایڈ کی ماڈل آپ ہوں گی ۔۔۔۔؟"

"نہیں وہ پتا نہیں ۔۔۔۔ پھپھو اجازت دیں گی یا نہیں ۔۔۔۔ انہیں شاید میرا اس فیشن شو میں بھی شرکت کرنا پسند نہیں ۔۔۔۔"

"ارے گولی مارو پھپھو کو ۔۔۔۔" سلطانہ نے کہا۔

"ایسا گولڈن چانس ہے میں ہوں اس کی ماں ۔۔۔۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"اور میں اسے اجازت دے رہی ہوں ۔۔۔۔" سلیمان واسطی کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔

"آپ غالباً شانی ہیں اسٹیج اداکارہ ۔۔۔۔؟"

"فلموں میں بھی کام کیا ہے میں نے ۔۔۔۔ ہاں شاید میرا اتنا علم نہیں ہے۔ بہر حال مس ملائکہ میں آپ کا انتظار کروں گا۔" وہ واپس مڑ گیا عفیرا بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی ایک بار پھر وہ ان دونوں کے ساتھ تنہا کھڑی تھی۔

"دیکھ چندا! یہ چانس مس نہ کرنا ۔۔۔۔" عورت نے اسے گلے لگا لیا۔

"تیری پھپھو نے آئیں بائیں شائیں کی تو کہہ دینا کہ تم اپنی مرضی کی مالک ہو اور یہ ہوٹل ہے نا اسٹیشن کے پاس علی بابا ہوٹل وہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں ہم سے کل ملنے ضرور آنا۔ میں تو تیرے لیے جھلی ہو گئی تھی ۔۔۔۔"

وہ خاموشی سے پارکنگ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ذہن الجھا ہوا تھا۔ یہ عورت اس کی ماں تھی لیکن ماں لگتی نہیں تھی اور بابا کے ساتھ اس کا تو کوئی جوڑ تھا ہی نہیں۔ پھر بابا نے کیسے اس سے شادی کر لی تھی۔ پھپھو صحیح کہتی ہیں۔

"کہ مزاج نہیں ملا بابا کے ساتھ وہ تو بہت سوبر ہیں ۔۔۔۔"

وہ بہت تھکی ہوئی تھی اس لیے پھپھو سے زیادہ بات کیے بغیر ہی سو گئی تھی لیکن ناشتے پر اس نے ساری تفصیل بتا دی۔

"سلطانہ ملی تھیں تمہیں ۔۔۔۔؟"

"ہاں ۔۔۔۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا وہ چھوٹے چھوٹے لقمے توڑ کر منہ میں ڈال رہی تھی۔

"وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ نے انہیں طلاق دلوائی ہے اور مجھے چھین لیا ان سے ۔۔۔۔"

"ایسا نہیں ہے بیٹا ۔۔۔۔!" انہوں نے بمشکل ضبط کیا۔

"وہ جھوٹ بول رہی ہے تمہارے بابا نے اسے اجازت دے دی تھی کہ تمہیں لے جائے اور طلاق بھی میں نے نہیں دلوائی تھی میں بھلا کیوں بھائی کا گھر اجاڑتی؟" ان کا

رنگ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں نمی تھی۔

"خیر۔۔۔۔ میں نے ان کی باتوں کا یقین نہیں کیا تھا بلکہ مجھے تو حیرت ہوئی کہ بابا نے ان سے شادی کیسے کر لی۔ بابا کے اور ان کے اسٹیٹس میں بہت فرق لگ رہا تھا مجھے۔۔۔۔"

"ہاں قسمت۔۔۔۔۔" انہوں نے ملائکہ کی پوری بات سن کر اطمینان بھری سانس لی۔

اس روز بہت خوش تھی اس لیے دن بھر چہکتی رہی، ٹی وی دیکھتی رہی، شام کو عفیرا شو کی مووی لے کر آئی تو پھپھو کے ساتھ بیٹھ کر اسے دیکھا اور بہت خوش ہوئی تھی۔

"اچھی لگ رہی ہوں نا۔۔۔۔؟" اس نے پھپھو سے تصدیق چاہی۔

"ہاں بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔۔۔۔"

"وہاں سب نے میری بہت تعریف کی اور وہ۔۔۔۔۔" اسے اچانک یاد آیا۔

"ایک شخص نے مجھے ماڈلنگ کی بھی آفر کی۔۔۔۔"

"نہیں بیٹا۔۔۔۔" ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ہماری فیملی میں لڑکیاں ماڈلنگ نہیں کرتیں۔ میں نے تمہیں شو میں شرکت کرنے پر کچھ نہیں کہا کہ چلو ایک بار شوق پورا کر لیا ہے۔ اب کہنے کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ ماڈلنگ ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ تم منع کر دو۔"

"فضا میں تیرتی ہوئی وہ حسین ماڈل۔۔۔۔۔"

دل میں گدگدی سی ہوئی "کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں بھی۔۔۔۔۔"

"اس میں کیا حرج ہے پھپھو! واسطی صاحب کہہ رہے تھے کہ اچھے خاندانوں کی لڑکیاں بھی اس فیلڈ میں آ رہی ہیں۔"

"آتی ہوں گی لیکن ہمارے خاندان کی نہیں۔ تمہارے بابا بہت ناراض ہوں گے اور عرفی بھی پسند نہیں کرے گا۔"

"اچھا۔۔۔۔" وہ مایوس ہو گئی۔ وہ پھپھو کی خواہش جانتی تھی کہ پھپھو اسے اپنی بہو بنانا چاہتی تھی گو عرفان نے اس حیثیت سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنی پڑھائی اور جاب میں مصروف ہو گیا تھا۔

کھانے کی ٹیبل پر، ناشتے پر، ٹی وی لاؤنج میں، گفتگو ہوتی رہتی تھی لیکن عرفان نے کبھی کوئی چھچھوڑی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی کوئی ڈائیلاگ بولے تھے لیکن پھر بھی وہ اس کے لیے اپنے دل میں ایک خاص جذبہ محسوس کرتی تھی۔ پھپھو سے تو کئی بار بچپن میں وہ ضد کر لیتی تھی لیکن عرفان کی بات مان لیتی تھی۔

"عرفان بھی پسند نہیں کرے گا۔ پھپھو ٹھیک کہتی ہیں۔" اس نے خود کو مطمئن کر لیا اور ناول لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے کہانیاں اور ناول پڑھنا بہت پسند تھا۔ پھپھو خاصی ڈسٹرب تھیں انہوں نے فوراً محب اللہ سے بات کی تو انہوں نے پوری بات سنی۔

"اگر وہ یہاں ملنے آئے تو ملنے دیجئے گا وہ بہر حال اس کی ماں ہے۔"

"اور ملائکہ نے اس کے ساتھ جانے کی بات کی تو۔۔۔۔"

"ملائکہ ایسی ناسمجھ نہیں ہے آپ کو اپنی تربیت اور محبت پر یقین نہیں ہے کیا۔" انہوں نے انہیں تسلی دی۔

"لیکن ماں ہے وہ۔۔۔۔ اس نے جنم دیا ہے اسے۔۔۔۔۔ ماں کی محبت کی ہوک تو ہوتی ہے نا محب! اور پھر سلطانہ پر مجھے اعتبار نہیں وہ کہیں ملکی کو ورغلا نہ لے۔"

"لیکن آپا۔۔۔۔! ہم اس کے حق کو چیلنج تو نہیں کر سکتے نا۔۔۔۔" لیکن اس کو تسلی دینے کے باوجود وہ سارا دن مضطرب رہی وہ مسلسل دعا مانگتی رہیں کہ سلطانہ پھر دوبارہ ملائکہ سے ملنے کی کوشش نہ کرے لیکن سلطانہ نے پتا نہیں شام تک کا وقت کیسے گزارا تھا۔

"سونے کی چڑیا ہے تیری بیٹی شانو۔۔۔۔۔! اب ہاتھ سے نہ نکلنے دینا تو۔۔۔ تو ہیروئن نہیں بن سکی، پر یہ بن جائے گی۔" صادق نے اسے سمجھایا۔

"میرے ہاتھ میں کب ہے۔۔۔۔؟"

"لے لے ہاتھ میں، بیٹی ہے تیری اور پھر بڑی بھولی بھالی سی ہے۔ دیکھا تھا کیسی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر آئی تھی۔ میں نے کہا تھا نا تجھ سے کہ تیری بیٹی بچ گئی تو یہاں رہ کر زیادہ فائدہ پہنچا سکتی ہے تجھے۔۔۔۔ تو نے دیکھا تھا، سنا تھا، میڈم نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا تھا کہ کتنی پڑھی لکھی ہے آج کل انڈسٹری میں پڑھی لکھی ہیروئن کی مانگ ہے۔"

"ہاں صادق!" سلطانہ کو بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ خود سلطانہ ان دنوں خاصی تنگی میں زندگی گزار رہی تھی۔ محب اللہ سے طلاق لے کر کچھ دن تو خوب عیش کیے۔ نذیر سے شادی کر لی، اسٹیج پر گانے بھی گائے، جو کامیاب نہ ہوئے۔ عام طبقے نے پسند کیے لیکن ان ہی دنوں تھائی رائڈ کا آپریشن کروانا پڑا۔ تھائی راڈ کی تکلیف کافی عرصہ سے تھی اب آپریشن ناگزیر تھا اور آپریشن نے اس کی آواز کو بہت متاثر کیا تھا۔ گو ڈاکٹر نے کہا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ آواز کچھ عرصہ بعد ٹھیک ہو جائے۔" لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ عین اس وقت جب اس کی اور نذیر کی جوڑی اسٹیج پر دوگانوں میں مقبول ہو رہی تھی۔ یہ مسئلہ ہو گیا تھا۔ تب نذیر اور صادق کے مشورے پر اس نے فلموں میں ہیروئن بننے کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔ دو تین فلموں میں ایکسٹرا کردار بھی ملا لیکن وہ ہیروئن نہ بن سکی تھی اور محض اسٹیج کی تیسرے درجے کی گلوکارہ بن کر رہ گئی۔ نذیر بھی ادھر ادھر منہ مارتا رہتا تھا جس مقصد کے لیے اس نے سلطانہ سے شادی کی تھی وہ مقصد پورا نہیں ہوا تھا تو سلطانہ کا عشق بھی ہوا ہو گیا تھا اور سلطانہ صادق کیساتھ مختلف اسٹوڈیو کے دھکے کھاتی رہتی تھی۔ ان کے درمیان جھگڑے کی بڑی وجہ صادق تھا۔ نذیر کہتا تھا۔

"کہ تم جو کماتی ہو وہ صادق کو کھلا دیتی ہو جبکہ تمہاری کمائی پر میرا پہلا حق ہے۔"

"اور تم جو کمائی باہر اڑا آتے ہو۔۔۔۔؟" سلطانہ بھی دوبدو جواب دیتی۔

"میری وجہ سے نہیں صادق کے لالچ کی وجہ سے۔۔۔۔" وہ بھی سب کچھ کھول کر رکھ دیتا تھا۔ زندگی بس یوں ہی گزر رہی تھی۔ کلفٹن والا فلیٹ فروخت کر کے صادق نے چند دن میں رقم برابر کر دی۔ نذیر سے شادی تو بعد میں ہوئی تھی۔ وہ سلطانہ کو لے کر لاہور آ گیا تھا کہ "یہاں اکیلی رہ کر کیا کرو گی پھر سارے اسٹوڈیو تو لاہور میں ہیں یہاں رہ کر ہیروئن نہیں بن سکے گی۔"

تین چار دن قبل وہ اپنے تھیٹر کے ساتھ کراچی آئی تھی۔ تیسرے درجے کے ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ صادق بھی اس تھیٹر میں کوئی معمولی کام کر رہا تھا۔ جبکہ نذیر لاہور میں ہی تھا دو چار روز میں وہ کسی میلے میں جانے والا تھا۔

"دیکھ سب کچھ صادق کے حوالے نہ کر دینا۔" جاتے جاتے اس نے تاکید کی

تھی۔

اور یہاں قسمت کی دیوی کیسے مہربان ہو گئی تھی اس پر۔ جس ملائکہ کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ مر کھپ چکی ہو گی وہ کتنی خوبصورت ہو گئی تھی۔

"کیسی شہزادی لگ رہی تھی۔ ہے ناں صادق۔۔۔۔۔!"

"ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔۔!" وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"کہ کیسے قابو کیا جائے۔۔۔۔۔؟"

"جانتی ہے یہ ماڈل لڑکیاں ایک ایڈ کے کتنے پیسے لیتی ہیں، لاکھوں روپے۔ ایک عام سی ماڈل بھی پچاس ہزار سے کم تو کیا لیتی ہو گی۔" ہائے میں مر گئی۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بس کر لے کسی طرح اپنے ہاتھ میں چڑیا کو۔ تیری بیٹی ہے وہ کون ہوتی ہے اس پر قبضہ کر کے بیٹھنے والی۔۔۔۔" اور پھر وہ دل ہی دل میں مسکرایا۔

"اکلوتی بیٹی ہے ساری جائیداد کی۔ مالک ہے عیش ہو جائیں گے شانی۔۔۔!"

"ارے کیا پتا اب تک کتنی اولادیں اور پیدا کر چکا ہو گا۔ زیادہ لمبے خواب نہ دیکھ تو۔۔۔۔"

"پھر بھی کچھ تو اس کو ملے گا نا۔۔۔۔"

وہ دونوں سیدھے ہوٹل سے سلیمان واسطی کے پاس گئے تھے۔ لیکن ملائکہ وہاں نہیں آئی تھی۔

"چل اس کی پھپھو کے گھر چلتے ہیں اس سے ملنے۔۔۔۔"

"وہ ملنے دے گی کیا۔۔۔۔؟"

"روک کے تو دیکھے بیٹی ہے تیری۔۔۔۔" صادق نے حوصلہ دیا۔

"لیکن۔۔۔۔ اشٹام پر لکھ کر دیا تھا سلطانہ ڈر رہی تھی۔'

"تو چل۔۔۔۔"

جب وہ دونوں "قصر عرفان" میں پہنچے تو ان کے خدشے بے بنیاد نکلے۔

"میں اپنی بیٹی سے ملنے آئی ہوں۔۔۔۔" کسی قدر گھبرائے ہوئے لہجے میں

سلطانہ نے آپا سے کہا تو وہ خاموشی سے ڈرائنگ روم سے نکل گئیں۔

ملائکہ سو رہی تھی انہوں نے اسے جگایا۔

''تمہاری امی آئی ہیں ملنے۔۔۔۔۔''

''کیوں۔۔۔۔؟'' اس نے مندی مندی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''پتا نہیں کیوں۔۔۔۔؟'' پھپھو بے حد سنجیدہ تھیں۔

''تو مل لوں۔۔۔۔۔''

''ہاں۔۔۔۔'' انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بابا اور عرفان ناراض تو نہیں ہوں گے ۔۔۔۔؟'' وہ آنکھوں میں بچپنا اور معصومیت لیے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے بابا تو شاید کچھ نہ کہیں ہاں عرفان کا پتا نہیں مجھے کیا کہے گا۔۔۔؟''

''تو نہ ملوں۔۔۔۔؟'' وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''اب آئی ہے تو مل لو ماں ہے تمہاری۔۔۔۔'' بادل نخواستہ انہیں کہنا پڑا اسے ڈرائنگ روم میں بھیج کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وہ اس عورت کا سایہ تک اس پر نہیں پڑنے دینا چاہتیں تھیں۔ بہر حال وہ اس کے ماں ہونے کے حق کو چیلنج نہیں کر سکتی تھیں۔ سلطانہ بڑی بے تابی سے اس سے ملی۔

''میں رات بھر سو نہ سکی۔۔۔۔'' دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لیے وہ والہانہ انداز میں اسے دیکھ رہی تھی صادق نے تعریفی انداز میں اس کی طرف دیکھا اس وقت وہ غضب کی اداکاری کر رہی تھی۔ کبھی اس کے ہاتھ چومتی، کبھی پیشانی، کبھی آنکھوں میں آنسو لاتی۔

''ایسی اداکاری کسی فلم میں کرتی تو آج ہیروئن ہوتی۔'' صادق نے دل ہی دل میں سوچا۔ ملائکہ متاثر لگ رہی تھی۔

''اچھا پلیز اب مت روئیں۔۔۔ آپ کی غلطی تھی نہ چھوڑ کر جاتیں مجھے۔۔۔''

''بتایا تو تھا تجھے۔۔۔۔ تیری اس پھاپھا کٹی پھپھو نے چھین لیا تجھے، پھر میں نے بھی سینے پر پتھر رکھ لیا کہ تیرے مامے کے گھر میں تو بس دو وقت کی سوکھی روٹی ہی تھی یہاں

تو عیش میں پلتی تیرا حق تھا یہاں کی ہر چیز پر۔۔۔۔'' وہ کوئی گھنٹہ بھر بیٹھی رہی رات کو اسے تھیٹر میں جانا تھا۔

''دیکھ جتنے دن میں یہاں ہوں مجھے ملنے آیا کرنا میں اپنی پیاس بجھا لوں گی ہائے برسوں کی تشنگی ہے ملائکہ۔۔۔۔!'' اچھا اس نے سر ہلا دیا۔

''ضرور آنا میں روز تو ادھر نہیں آؤں گی۔ کیا پتا کسی روز تیری پھوپھی چونڈے سے پکڑ کر باہر نکال دیں۔''

''اور ہاں۔۔۔۔۔''

جاتے جاتے صادق نے کہا۔

''پھوپھو نے اجازت نہیں دی ماڈلنگ کی۔۔۔۔''

''ارے کیسے اجازت نہیں دے گی۔۔۔۔'' سلطانہ چمک کر بولی۔

''تو بالغ ہے، اپنی مرضی کی مالک ہے، ایسا گولڈن چانس پھر نہیں ملے گا، تجھے ملکی! میری بات مان لے واسطی صاحب سے مل لے ابھی تو فوٹو سیشن ہوگا پھر کیا پتا تو سلیکٹ بھی ہو گی یا نہیں۔۔۔۔''

''میرے ساتھ آنا میں تجھے کل خود لے چلوں گی۔۔۔۔''

وہ کچھ بولی نہیں ۔۔۔ ناخن دانتوں سے کتراتے ہوئے چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی۔

''آپ کیسے آئے؟ گاڑی ہے آپ کے پاس۔۔۔۔؟''

''ارے میرے پاس گاڑی کہاں سے آئی۔۔۔۔'' سلطانہ کے لہجے کی تلخی اس سے چھپی نہ رہ سکی۔

''میں ڈرائیور سے کہتی ہوں وہ چھوڑ آتا ہے آپ کو۔۔۔۔''

''رہنے دے تیری پھپھو کو برا لگے گا۔۔۔۔''

''نہیں لگے گا ماں! آپ بے فکر رہیں۔۔۔''

اور اس روز وہ دیر تلک سلطانہ کے متعلق سوچتی رہی۔ یہ عورت اس کی ماں تھی اگر بابا میں اور اس میں علیحدگی نہ ہوتی تو آج یہ عورت بھی ان کے ساتھ رہتی ہوتی۔ کینیڈا

میں یا یہاں بابا کے اس بڑے سارے گھر میں اسے سلطانہ پر بہت ترس آیا جو اولاد کے ساتھ ساتھ ہر آسائش سے محروم تھی۔ اس کے جسم پر موجود لباس پر گو موتی جڑے ہوئے تھے لیکن وہ انتہائی کم قیمت تھا ایسا لباس تو رقیہ بی بی کو بھی پسند نہ آتا تھا۔ اس کا دل اس عورت کے لیے گداز ہوتا رہا جو اس کی ماں تھی۔ پھوپھی نے اماں کے متعلق اس سے کوئی بات نہ کی تھی اگلے روز انسٹیٹیوٹ میں اس نے عفیرا سے پوچھا۔

''عفی! تمہارے پاس بہت پیسہ ہو اور تم آسائش کی زندگی گزار رہی ہو جب کہ تمہاری ماں کہیں الگ اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہی ہو تو۔۔۔۔۔''

''میں اس کی ہر ممکن مدد کروں گی۔۔۔۔۔'' عفیرا نے بلا جھجک کہا۔

''تم نہیں جانتیں کہ ماں کے کتنے حقوق ہوتے ہیں۔۔۔۔ ہم تو ساری زندگی اس کی خدمت کرتے رہیں تو اس کا حق ادا نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔''

دراصل اس نے عفیرا کو ساری بات بتادی۔

''تو تمہیں اپنی امی کی مدد کرنی چاہیے ملائکہ۔۔۔۔!'' بلکہ ہاں اسے یاد آیا۔

''یہ مما نے دیا تھا چیک ہے بیس ہزار کا۔۔۔۔۔''

اس نے پرس سے لفافہ نکالا۔

''یہ کس بات کا۔۔۔۔۔؟''

''بھئی اس فیشن شو میں شرکت کا معاوضہ۔۔۔۔۔''

''اچھا۔۔۔۔۔''

اسے حیرت ہوئی اس نے تو یوں ہی عفیرا کی دوست کی حیثیت سے اس میں شرکت کی تھی اور اسے بالکل نہیں پتا تھا کہ اس طرح رقم ملے گی۔

''تم بہت بھولی ہو ملائکہ! بڑے فنکاروں کو تو مما اس سے زیادہ معاوضہ ادا کرتی ہیں کوئی مفت تو تھوڑا ہی شرکت کرتے ہیں یہ لوگ۔۔۔۔۔''

''پھر یہ بیس ہزار میں انہیں دے دیتی ہوں۔۔۔۔۔''

''ضرور۔۔۔۔'' عفیرا نے تاکید کی۔

یوں تو بابا اس کے اکاؤنٹ میں ہر ماہ کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے ہیں لیکن اسے کبھی

ضرورت نہیں پڑی تھی رقم نکلوانے کی۔ پھپھو اس کی ہر ضرورت پوری کر دیتی تھیں۔

''فی الحال یہ دے دیتی ہوں۔'' انسٹیٹیوٹ سے وہ سیدھا علی بابا ہوٹل آئی تھی۔

''ادھر کسی سے ملنا ہے بی بی۔۔۔۔!'' ڈرائیور نے پوچھا۔

تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ صادق اسے ہال میں چائے پیتا نظر آ گیا۔

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔ تیری ماں اوپر ہے کمرے میں، تیرے غم میں پڑی ہے رات سے کچھ کھایا نہیں۔''

وہ اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں آئی۔ جہاں سلطانہ ابھی تک سو رہی تھی۔ رات بارہ بجے کے شو کے بعد جو تھک کر لیٹی تھی تو ابھی تک خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔

''شانی! اٹھ کر دیکھ کون آیا ہے۔۔۔۔۔؟'' صادق نے کندھوں سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا اور پھر ایک ملاقات کئی ملاقاتوں کا پیش خیمہ بن گئی۔ تقریباً وہ روز ہی اس سے ملنے چلی آتی۔ اس بیس ہزار کے علاوہ ایک بہت بڑی رقم اس نے ماں کو دی تھی اور اس کے بے حد اسرار پر واسطی سے ملی تھی۔ بلکہ فوٹو سیشن کے بعد ماڈلنگ کرنے کی حامی بھی بھر لی تھی۔ ڈرائیور نے اس کے ہر روز ہوٹل جانے کے بارے میں پھپھو کو بتا دیا تھا تو اس نے صاف کہہ دیا تھا'' کہ وہ اپنی ماں سے ملنے جاتی ہے۔''

''وہ یہاں پر بھی تو تم سے مل سکتی ہے۔'' پھپھو نے کہا۔

''ہاں۔۔۔ لیکن وہ روز روز یہاں نہیں آسکتیں۔'' اس نے بے نیازی سے کہا تو وہ حیران سی اسے دیکھتی رہ گئیں۔ یہ چند ہی دنوں میں اس میں کیسی تبدیلی آئی تھی۔ صادق اور سلطانہ نے اس کا ٹھیک ٹھاک برین واش کر دیا ان کے تھیٹر کے لوگ واپس لاہور چلے گئے لیکن وہ وہیں رک گئے ادھر نذیر کے فون پر فون آرہے تھے۔

''کیا کوئی خزانہ مل گیا ہے؟ واپس آجا اب مجھے میلے جانا ہے تو بھی ساتھ چلنا۔۔۔''

''تو چلا جا میں نہیں جانے کی۔۔۔۔۔'' صادق کی بھی نوکری کا مسئلہ تھا بالآخر وہ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

"میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔۔۔۔۔؟" ملائکہ نے پوچھا۔

ان دنوں وہ پھپھو سے بہت کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔

"ارے نہیں چندا۔۔۔۔۔!" صادق نے فوراً کہا۔

"تو بس یہیں رہ ہم اتنے ظالم نہیں ہیں۔ تیری پھپھو نے ماں بن کر پالا ہے تجھے، شانی کا کیا ہے پہلے بھی تو تیرے بغیر ہی رہتی تھی۔ بس تو ہم سے رابطہ رکھنا۔"

"اچھا۔۔۔۔۔" ملائکہ کو اس سمے وہ بہت عظیم لگے۔

"تو نے صادق ایسا کیوں کیا۔" اس کے جانے کے بعد اس نے پوچھا۔

"اس کے یہاں رہنے میں فائدہ ہے پاغلے۔ ذرا اس کا اشتہار آنے دے۔ واسطی صاحب کو بڑا یقین تھا کہ راتوں رات مشہور ہو جائے گی۔"

"پھر کیا ہم اسے لے چلیں گے۔۔۔۔" سلطانہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"کہاں رکھے گی اسے؟ اس دو کمرے کی کھولی میں یہیں رہنے دے اسے۔"

صادق کے ذہن میں جانے کیا تھا وہ ہمیشہ دور کی کوڑی لاتا تھا۔ سلطانہ اس کی معترف تھی لہذا چپ ہو گئی۔

ملائکہ اس کے جانے کے بعد بہت اداس تھی اسے پھپھو ایک دم بری لگنے لگی تھی اسے ماں کی بتائی ہوئی ہر ہر بات کا یقین تھا" کہ غربت کی وجہ سے اس کی ماں پر ظلم ہوا اور اس ظلم میں پھپھو کا ہاتھ تھا۔ ورنہ بابا تو ایسے نہ تھے۔" اس کے کورس مکمل ہو چکے تھے ڈرائیونگ لائسنس بھی مل گیا تھا۔ اس نے بابا کو بتایا تو انہوں نے پھپھو سے کہا۔

"وہ اسے گاڑی لے دیں۔۔۔۔۔" سلطانہ لاہور جا چکی تھی ملائکہ زیادہ تر گھر پر ہی رہنے لگی تھی۔ اشتہار کی شوٹنگ سلطانہ کی موجودگی میں ہو چکی تھی چنانچہ پھپھو مطمئن ہو چکی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ جلد از جلد شادی کر کے عرفان کے ساتھ اسے کینیڈا بھیج دیں انہیں سلطانہ کے ساتھ میل جول ہرگز پسند نہ آیا تھا اور اس سلسلے میں انہوں نے کئی بار عرفان سے بات بھی کی تھی۔

"بس امی جان! چند ماہ کی بات ہے آپ بس شادی کی تیاری کریں۔"

انہوں نے شوروم سے اس کی پسند کی گاڑی نکلوائی تھی۔ عجیب خوشی اور سنسنی اس

کے وجود میں دوڑتی رہی۔ سلیمان واسطی نے سچ کہا تھا اس نے ایک رات میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ کئی لوگوں نے اس کے ساتھ کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنی اشتہاری فلم کے لیے اسے لینا چاہتے تھے۔ لیکن سلیمان واسطی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ صرف اس کی کمپنی کے کام کرے گی۔ وہ اس روز سیدھا اس کے گھر چلا آیا۔ نیا کنٹریکٹ سائن کروانے اور پچھلے اشتہار کی رقم کا چیک دینے۔

وہ چیک لیے حیران سی بیٹھی تھی۔ جب پھپھو ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو نوکرانی نے بتایا تھا" کہ بی بی سے ملنے کوئی صاحب آئے ہیں۔" اور انہوں نے سوچا کہیں کم بخت صادق نہ ہو اس لیے جلدی جلدی نماز ختم کر کے چلی آئیں۔

"یہ میری پھپھو ہیں۔۔۔۔۔" ملائکہ نے متعارف کرایا۔

"تشریف رکھیے انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔

"بیگم صاحبہ! ملائکہ نے میرے ایک اشتہار میں کام کیا۔ میں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا مالک ہوں اور میں انہیں اپنی ایک اور اشتہاری فلم کے لیے بک کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ہکا بکا سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا مطلب۔۔۔۔۔؟"

"ملائکہ! یہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟" ملائکہ نے نظریں جھکا لیں۔

"دیکھیے صاحب۔۔۔۔۔!" انہوں نے بمشکل اپنے غصے کو قابو میں رکھ کر دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہم خاندانی لوگ ہیں اور ہمارے یہاں لڑکیاں ایسے شعبوں میں نہیں جاتیں اور نہ ہی اسے پسند کیا جاتا ہے۔ اگر اس نے نادانی میں بغیر اجازت ایسا کام کیا ہے تو آئندہ کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔" سلیمان واسطی تو خود حیران تھا۔

"کہ جو عورت خود کو ملائکہ کی ماں کہتی ہے، ایک اس کا لب و لہجہ اور انداز گفتگو اور کہاں یہ خاتون۔۔۔۔۔"

"لیکن آج کل تو بہت اچھے گھرانوں کی بچیاں۔۔۔۔۔"

اس نے کہنا چاہا تو پھپھو نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"پلیز آپ جاسکتے ہیں۔۔۔۔۔"

"مگر پھپھو۔۔۔۔۔!"

"تم چپ رہو ملائکہ۔۔۔۔۔!" انہوں نے زندگی میں پہلی بار اسے جھڑکا۔

"تم! اتنی خودمختار کیسے ہوگئیں کہ تم نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔ جانتی ہو کیا عزت ہوتی ہے معاشرے میں ان ماڈل لڑکیوں کی۔۔۔۔۔ تمہارے بابا سنیں گے تو کیا کہیں گے اور آج کے بعد تم اکیلی باہر نہیں جاؤ گی۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔۔۔۔۔"

وہ خاموشی سے اٹھ کر آئی لیکن اس کے اندر ضد سر اٹھا رہی تھی ایک اتنی بڑی رقم کا چیک تھا اس کے ہاتھ میں، پھر گلیمر کی اپنی کشش تھی شاید یہ ضد دم توڑ دیتی اگر سلطانہ اور صادق کے فون نہ آتے انہوں نے اسے اکسایا تھا۔

"کہ مزید کام کرے۔ ایک دن یقیناً صف اول کی ماڈلز میں اس کا شمار ہوگا۔"

"مگر پھپھو بہت ناراض ہیں ماں۔۔۔۔۔!"

"لعنت بھیجو اس پر۔۔۔۔۔ تم کوئی اس کی غلام ہو فوراً نیا کنٹریکٹ سائن کرو، بلکہ ابھی فون کر کے واسطی سے کہو کہیں کسی اور کو نہ دے دے لیکن دیکھو پیسے کا معاملہ پہلے طے کرلینا اس نے پہلے ٹرخایا ہے تمہیں، صادق آجائے گا بس تو فون کردینا جانو! واسطی کے ساتھ معاملات کو طے کرلے گا۔"

مگر کئی دن تک اسکی ہمت نہ پڑی پھپھو نے اس سے بات چیت تقریباً بند کر رکھی تھی۔ اس روز لاؤنج میں وہ فون سن رہی تھی اور ٹی وی پر اس کا اشتہار چل رہا تھا۔ فون پٹخ کر اس نے ٹی وی کا سوچ آف کردیا اور باہر چلی گئیں۔ کتنا دل چاہتا تھا اسکا کہ اس کا اشتہار دیکھیں اس کی پرفارمنس کی تعریف کریں لیکن ان کا غصہ تو کم ہونے کو نہیں آرہا تھا خود اس کو اپنا اشتہار اتنا پسند لگتا تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ ٹی وی پر ہی چلتا رہے اور وہ دیکھتی رہے۔ صادق اور سلطانہ ہر روز اسے فون کرتے لیکن اس وقت جب پھپھو سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی ہوتیں اور وہ عموماً عشا کی نماز اپنے کمرے میں ہی پڑھتی تھیں۔

"ایسا کر ملکی۔۔۔۔۔! میں اور صادق آجاتے ہیں تو آجا ہمارے پاس۔ دیکھ لیں گے۔ بڑی آئی پھپھو۔۔۔۔۔ کیسے اجازت نہیں دیتی وہ تجھے۔۔۔۔۔ ارے یہ تیری زندگی

ہے اس پر تیرا اپنا حق ہے نہ کہ اس کا۔۔۔۔۔ وہ نہیں چاہتی کہ تو پیسوں میں کھیلے، شہرت حاصل کرے۔"

وہ اس کے کانوں میں زہر انڈیلتی رہی اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے پھر پورے چھ دن بعد پھپھو نے ایک صبح ناشتے کی میز پر اس سے کہا۔

"آج تیار ہوجانا جیولر کی طرف جانا ہے اور کچھ شاپنگ کرنا ہے اور تمہارا ویڈنگ ڈریس بھی لینا ہے۔ کون سا کلر لینا چاہتی ہو؟ عرفان اور تمہارے بابا آرہے ہیں اگلے ہفتے، اور تمہاری شادی ہے۔"

وہ حیرت سے منہ کھولے پھپھو کو دیکھتی رہی اس کی شادی ہو رہی ہے اسے خبر بھی نہیں بالا ہی بالا پھپھو نے یہ کیا سازش کرلی تھی۔ عرفان کو تین چار ماہ تک آنا تھا پھر ایک لمحہ کو اس کا دل عجب طرح سے دھڑکا۔ عرفان نے کبھی کوئی اس سے ایسی بات نہ کی تھی جس میں استحقاق ہو لیکن جاتے سے وہ کئی دن ڈسٹرب رہی تھی۔

"عرفان بہت نرم مزاج تھا اور یقیناً وہ مجھے اجازت دے دے گا۔" اس نے خوش دلی سے سوچا۔

"اتنا پیسہ ملے گا اتنی شہرت ملے گی کہ۔۔۔۔۔"

اس نے آنکھیں موند کر خود کو شہرت کی بلندیوں پر دیکھا اور پھر خاموشی سے اٹھ کر تیار ہونے چل دی اس نے بہت شوق سے اپنے لیے ویڈنگ ڈریس پسند کیا تھا۔ جیولری میچنگ کی خریدی گئی پھپھو بار بار کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتی تھی اور پھر جیسے ان کے چہرے پر اطمینان سا پھیل جاتا مگر اس رات جب سلطانہ کو اس نے بتایا۔

"کہ شادی ہو رہی ہے۔" وہ حیران رہ گئی۔

"یہ اچانک کس کو تاڑ لیا تیری پھپھی نے۔۔۔۔۔"

"عرفان اور بابا آرہے ہیں۔ عرفان پھپھو کا بیٹا ہے نا آپ آنا ضرور میری شادی میں، میں پھپھو اور بابا سے اجازت لے لوں گی وہ منع نہیں کریں گے۔"

"لو تیری چڑیا تو مٹھی سے پھڑ۔۔۔۔۔"

صادق نے قہقہہ لگایا وہ اس وقت سلطانہ کے گھر میں ہی تھا۔

"ہماری تو قسمت ہی کھوٹی ہے شانی۔۔۔۔!"

"تو کچھ کر صادق۔۔۔۔۔۔!" سلطانہ بھی پریشان ہوگئی۔

"اچھا چل صبح کراچی چلتے ہیں اور وہ نذیر سے کہہ دینا ایک پرائیویٹ پروگرام ہے اس میں جانا ہے۔"

صادق کے پاس ہمیشہ ہی جواب تیار رہتے تھے اور پھر صبح ہی وہ کراچی پہنچ گئے تھے۔ان کی قسمت اچھی تھی کہ جب وہ اس سے ملنے قصر عرفان گئے تو وہ گھر میں اکیلی تھی اور رقیہ ڈرائیور کے ساتھ شاپنگ پر نکلی تھیں۔

"اے۔۔۔۔میں کہتی ہوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر پھپھی سے کہہ دے ان سے کہ تجھے اپنی زندگی جینا ہے۔۔۔۔غلامی نہیں کرنی اس کے بیٹے کی۔۔۔۔تیرے لیے لاکھ رشتے۔۔۔۔۔"

وہ کوئی دو گھنٹے اس کو سمجھاتی رہی ملائکہ خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔۔۔ کبھی کبھی صادق بھی بول اٹھتا۔۔۔۔ ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد پھپھو آ گئیں چوکیدار سے سلطانہ کی آمد کا سن کر وہ بوکھلا گئیں۔سیدھی لاؤنج میں آئیں۔

"کون آیا تھا ملائکہ۔۔۔۔۔!"

"اماں اور ماما آئے تھے۔۔۔۔" وہ بے حد پرسکون سی بیٹھی ناخنوں کو تراش رہی تھی۔

"کیوں آئے تھے۔۔۔۔؟" ان کا اضطراب چھپائے نہ چھپتا تھا۔

"ملنے آئے تھے مجھ سے۔۔۔۔۔۔"

"پھپھو ماڈلنگ کرنا اور ٹاپ کی ماڈل بننا میری شدید خواہش ہے، مجھے ماڈل بننا ہے اور میں نے آج سلیمان واسطی کو فون پر بتا دیا ہے کہ میں ان کا کنٹریکٹ سائن کر رہی ہوں، آپ عرفان کو بھی بتا دیں بعد میں اسے کوئی مسئلہ نہ ہو۔۔۔۔۔"

پھپھو حیران سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"ملائکہ! تو ہوش میں ہے نا یہ پٹی تجھے کس نے پڑھائی ہے۔۔۔۔؟ میں اچھی طرح جانتی ہوں وہ تیری دشمن ہے دوست نہیں ہے۔"

"وہ میری ماں ہے پھپھو! اور ماں کبھی بیٹی کی دشمن نہیں ہو سکتی۔۔۔۔"

وہ بڑے اعتماد سے بول رہی تھی یہ ملائکہ تھی جو ہر چھوٹی بڑی بات ان سے پوچھتی تھی اور وہ کہتی تھیں "ملائکہ! اب بڑی ہو جاؤ۔۔۔۔۔"

آج وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔وہ خاموشی سے باہر چلی گئیں ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔اس ننھی سی جان کو انہوں نے پالا پوسا تھا،اس کے لیے خواب دیکھے تھے،اسے اپنے لاڈلے بیٹے کی دلہن بنانے کے،کیا ماں کے دودھ کا اثر ان کی تربیت پر غالب آ گیا۔

"اماں صحیح کہتی تھیں۔۔۔۔" ملائکہ نے انہیں خاموشی سے جاتے دیکھ کر سوچا۔

"مجھے شروع سے ہی پھپھو سے بے دھڑک بات کرنی چاہیے تھی میرے اندر ٹیلنٹ ہے تو میں کیوں نہ اسے آزماؤں۔ٹھیک ہے میں کل ہی واسطی صاحب سے مل کر معاملہ طے کر لیتی ہوں۔اماں اور صادق ماما کو ساتھ لے لوں گی۔" وہ بڑی مطمئن تھی اور سلطانہ کو ہوٹل میں فون کر کے اسے ساری بات بتا دی تھی۔

"شاباش بیٹی! ڈرنا نہیں ہم ہیں نا ادھر، تیرے لیے ہی آئے ہیں اتنا خرچہ کر کے۔۔۔۔صادق بے چارے نے کرایہ کسی سے ادھار لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں آؤں گی تو پیسے بھی ساتھ لیتی آؤں گی۔"

رات ہی کو عرفان کا فون آ گیا تھا وہ بہت سنجیدہ تھا۔

"پھپھو اپنے کمرے میں ہیں۔میں بلاتی ہوں۔مجھے تم سے بات کرنا ہے ملکی! یہ امی جان کیا کہہ رہی ہیں۔۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔۔میں ماڈل گرل بننا چاہتی ہوں مجھے شوق ہے۔"

"تم نے شوق پورا تو کر لیا ملکی۔۔۔۔!" عرفان سے سمجھایا۔

"دیکھو ہمارا ماحول، ہمارا پس منظر، اس کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی میں پسند کرتا ہوں کہ میری بیوی۔۔۔۔"

"لیکن مجھے پسند ہے۔۔۔۔" پتا نہیں اس میں اتنی جرات کہاں سے آ گئی تھی۔

"دیکھو ملائکہ! ماڈلنگ یا میں۔۔۔۔۔ تمہیں دونوں میں سے کسی ایک کو چننا

ہوگا۔'' ایک لمحے کو اس کا دل ڈوب سا گیا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے کانوں میں سلطانہ کے الفاظ گونجنے لگے۔

''تیرے قدموں پر سینکڑوں عرفان جیسے لڑکے سر رکھیں گے ملکی۔۔۔۔!تو ایک بار شوبز کی دنیا میں قدم تو رکھ، تو تو ملکہ ہے میری جان۔۔۔۔!''

''میں ماڈلنگ نہیں چھوڑ سکتی۔۔۔۔''

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی پھر عرفان کی آواز سنائی دی۔

''اوکے۔۔۔۔میری طرف سے تم آزاد ہو۔'' اس کا دل جیسے گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا وہ کتنی دیر ریسور ہاتھ میں تھامے ساکت کھڑی رہی۔

شاید دونوں طرف یقین ٹوٹا تھا۔ عرفان کو یقین تھا کہ وہ اسے نہیں چھوڑ سکتی اور اسے یقین تھا کہ عرفان اس کی ضد مان لے گا۔ ابھی دو تین دن پہلے اپنا ویڈنگ ڈریس پسند کیا تھا۔ کچھ دیر وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی روتی رہی اس وقت صرف سلطانہ تھی جو اسے تسلی دے سکتی تھی۔ اس کے ٹوٹے دل پر مرہم رکھ سکتی تھی سو کچھ دیر بعد آنسو پونچھ کر اٹھی اور اسے فون کرنے لگی۔

''تم نے بالکل صحیح کیا۔۔۔۔'' سلطانہ نے اسے شاباش دیتے ہوئے کہا۔

''صبح واسطی کے دفتر جانا صادق اور میں بھی آجائیں گے۔ صبح ناشتے کے بعد وہ تیار ہو باہر نکلی تو پھپھو کچن کے پاس کھڑی رقیہ کو کچھ ہدایات دے رہی تھیں۔

''میں کام سے جا رہی ہوں۔'' انہوں نے مڑ کر ایک نظر اسے دیکھا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ اسے شاید منع کریں گی لیکن انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا ایک سنجیدگی چہرے پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے بعد بھی انہوں نے اسے کہیں آنے جانے سے نہ روکا، وہ کیا کرتی ہے، کہاں جاتی ہے، انہیں جیسے اس سے کوئی سروکار نہ رہا تھا۔

جس روز شوٹنگ تھی وہ خاصی دیر سے آئی تھی۔ لیکن پھپھو نے اس سے کوئی باز پرس نہ کی تھی۔ سلطانہ اور صادق مسلسل کراچی میں رہ رہے تھے اور تقریباً ہر روز ہی ملائکہ سے ان کی ملاقات ہوتی تھی۔ ملائکہ کے پہلے ہی ایڈ نے اسے خاصا مشہور کر دیا تھا۔ چند ایک ٹی وی چینل نے بھی اس سے رابطہ کیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ وہ ان کی سیریز میں کام

کرے اور سلطانہ چاہتی تھی کہ وہ پھپھو کا گھر چھوڑ کر اس کے ساتھ لاہور چلے لیکن صادق ایسا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ ایسا منصوبہ جس میں زیادہ سے زیادہ مال ہاتھ لگ سکے لیکن ابھی وہ کوئی لائحہ عمل طے نہیں کر پایا تھا کہ ملائکہ کو ایک فلم ساز آفتاب علی کی طرف سے آفر ہوئی۔ سلطانہ اور صادق تو خوشی سے پاگل ہو گئے۔

''ملکی۔۔۔۔!اس چانس کو مس نہیں کرنا۔ فوراً ہمارے ساتھ لاہور چلو۔۔۔۔تم نہیں جانتیں آفتاب علی کا نام کامیاب فلم کی ضمانت ہے۔''

''لیکن ملائکہ متذبذب تھی۔ پتا نہیں پھپھو لاہور جانے دیں گی یا نہیں۔ کیا ہوگا اگر جو روک لیں گی۔ اس کا دل خود بہت چاہ رہا تھا۔''

اس روز آفتاب علی سلیمان واسطی کے اسٹوڈیو میں اچانک ہی آئے تھے جب وہ اپنے ایڈ کی فائنل ریہرسل کر رہی تھی۔

''مجھے اپنی فلم کے لیے ایک نئے چہرے کی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میری تلاش ختم ہو چکی ہے۔'' انہوں نے اس سے کہا تھا اور تب ہی سلطانہ اور صادق ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔ کچھ دن وہ سوچتی رہی لیکن سلطانہ اسے مسلسل اکسا رہی تھی تب اس نے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا اور ایک صبح ناشتے کی میز پر پھپھو کو مخاطب کیے بغیر اطلاع دی۔

''میں دو روز تک لاہور جا رہی ہوں۔''

پھپھو نے ذرا سی نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر اپنی پیالی میں چائے انڈیلنے لگیں وہ کچھ دیر تو منتظر نظروں سے انہیں دیکھتی رہی کہ شاید وہ پوچھیں کہ وہ لاہور کیوں جا رہی ہے لیکن انہوں نے تو پوچھا تک نہیں۔ انہوں نے مجھے پالا پوسا ہے لیکن یہ میری ماں نہیں ہیں اماں صحیح کہتی ہیں کہ ان کے سینے میں میرا درد نہیں ہو سکتا۔ اصل درد تو ماں کو ہی ہو سکتا ہے جو میری ماں ہے وہی میری بہتری اور بھلائی کا سوچ سکتی ہیں اور میرے لیے فلمی دنیا میں ایک روشن مستقبل ہے وہ ایک اجنبی سی نظر ان پر ڈال کر اپنے کمرے میں آگئی اور سلطانہ کو کمرے میں آتے ہی فون کیا کہ وہ لاہور جانے کے لیے تیار ہے۔

''تیری پھپھو نے کوئی پھڈا تو نہیں کیا۔۔۔۔؟'' سلطانہ خوش ہو گئیں۔

''نہیں۔۔۔۔''

"چل شکر ہے۔۔۔۔تو تیاری پکڑ، صادق کو ادھر کوئی کام ہے دو تین روز تک چلتے ہیں۔تو اپنا سارا سامان لے لینا، پیسہ دھیلا، زیور شیور سب۔ جانے کتنے دن ٹھہرنا پڑے۔ واسطی نے جو چیک دیا ہے۔وہ بھی کیش کروالینا ٹکٹ شکٹ لینا ہوگا جہاز کا، اب تیرے ساتھ ٹرین میں تو نہیں جائیں گے۔بے عزتی ہوگی نا۔۔۔۔۔"

اگلے دو تین دن تک وہ تیاری کرتی رہی کچھ نئے کپڑے بنوائے لیکن اس کا خیال تھا کہ جتنے بھی دن لگے بہر حال لوٹ کر تو ادھر ہی آنا ہے اس لیے اس نے زیور وغیرہ تو نہیں لیا۔ہاں چیک بک رکھ لی تھی۔بس جو معمولی زیور پہنے تھی وہی اسکے خیال میں بہت تھا۔ پھر ایک اٹیچی کیس اور ایک بیگ بن ہی گیا تھا۔سلطانہ نے اسے فون پر بتادیا کہ پیر کو صبح گیارہ بجے اس کی فلائٹ ہے۔وہ بائیں کندھے پر بیگ لٹکائے اور دائیں ہاتھ سے اٹیچی کیس گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلی تو عرفان کو لاؤنج میں کھڑے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔اس کے ساتھ ایک کم عمر سی لڑکی تھی یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال کی۔

وہ حیران سی اسے دیکھنے لگی۔

یہ عرفان کب آیا، شاید رات کو کسی وقت، وہ تو شام ہوتے ہی اپنے کمرے میں گھس جاتی تھی۔ پھپھو کو یقیناً اس کی آمد کا علم ہوگا لیکن انہوں نے مجھے بتانا بھی گوارہ نہیں کیا عرفان کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر ایک لمبی اور گہری سانس لی۔

"کہیں جا رہی ہو شاید۔۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کتنے دن کا پروگرام ہے۔۔۔۔؟"

اس نے بھاری بیگ اور اٹیچی کیس کو دیکھا۔

"معلوم نہیں۔۔۔۔۔" وہ اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔

"میری شادی تک رک جاتیں۔۔۔۔۔" عرفان نے ایک کھوجتی ہوئی سی نظر اس پر ڈالی۔لمحہ بھر کے لیے اس کے نقوش میں ارتعاش پیدا ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ نارمل ہوگئی۔

"یہ ثنا ہے۔۔۔۔۔" عرفان نے مڑ کر اس لڑکی کا تعارف کروایا۔

"میری وائف اور تمہاری بہن (اسٹیپ سسٹر) میرا مطلب ہے نکاح وہیں ہوگیا تھا۔باقی تقریبات یہاں ہوں گی۔ماموں جان بھی آجائیں گے ہفتہ دس دن تک کچھ کام تھا انہیں۔۔۔۔۔"

لڑکی کے رخسار گلگوں ہوئے اور وہ تیزی سے واپس کمرے میں غائب ہوگئی۔

اس نے بیگ ایک کندھے سے دوسرے کندھے تک منتقل کیا۔

"او کے۔۔۔۔میں چلتی ہوں۔"

ملائکہ نے بہت دیر سے روکی ہوئی سانس کو آزاد کیا۔تھوڑا سا جھک کر بیگ کے اسٹریپ کو پکڑا۔عرفان نے آہستگی سے اسٹریپ اسکے ہاتھ سے لے لیا۔

"چلو۔۔۔۔۔"

وہ خاموشی سے بیگ کندھے پر لٹکائے ہولے ہولے چلنے لگی۔

"ملائکہ۔۔۔۔۔!" اٹیچی کیس گاڑی کی ڈکی میں رکھتے ہوئے عرفان نے کہا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا ملائکہ۔۔۔۔!نہ اپنے ساتھ، نہ میرے ساتھ، بلکہ ہم سب کے ساتھ، بابا کو امی کو سب کو تمہارا بہت صدمہ ہے ملائکہ۔۔۔۔!لیکن میں۔۔۔۔ مجھے تو تم نے مار دیا ہے، پتا نہیں تم نے کبھی میرے متعلق سوچا تھا یا نہیں۔۔۔۔لیکن میں نے تمہیں بہت سوچا۔۔۔۔بہت چاہا۔۔۔۔بہت محبت کی تم سے۔۔۔۔میں نے تم سے کبھی محبتوں کا اظہار نہیں کیا۔۔۔۔لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔۔۔۔پھر ابھی تم پڑھ رہی تھیں۔۔۔۔ابھی ان باتوں کا وقت نہیں تھا۔۔۔۔میرے پاس تو تمہارے لیے اتنی محبتیں تھیں ملائکہ۔۔۔۔!" وہ ذرا سا رکا۔

ملائکہ ساکت تھی۔"تم نے کبھی میری آنکھوں میں نہیں دیکھا۔۔۔۔کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ میں تمہارے لیے کتنا حساس ہوں۔۔۔۔تمہاری معمولی سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا تھا۔۔۔۔ مجھے یقین تھا کہ تمہارے دل میں بھی میرے لیے بہت جگہ ہوگی۔۔۔۔لیکن جب تم نے کہا کہ تم ماڈلنگ کو نہیں چھوڑ سکتی ہو۔۔۔۔تو جانتی ہو کیا ہوا۔۔۔۔تم نے میرے برسوں کے بنائے ہوئے رنگ محل کو خاک میں ملادیا۔۔۔۔میں کتنے ہی دن شاک میں رہا۔۔۔۔کتنے دل پاگلوں کی طرح پھرا۔۔۔۔تم

نے۔۔۔تم نے ملائکہ۔۔۔تم نے۔۔۔۔مجھے ماردیا۔۔۔۔"

وہ ایک دم تیزی سے مڑا اور بھاگتے ہوئے تقریباً اندر چلا گیا۔

ملائکہ کا جی چاہا وہ بھی بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے جائے، اس سے سوری کرے اور کہے تم تو میرے لیے سب سے اہم ہو۔۔۔ماڈلنگ، ایکٹنگ، سب تمہاری محبتوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں۔۔۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خوبصورت سی کم عمر لڑکی جو اسکے بے حد پیارے بابا کی بیٹی تھی۔اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی اور عرفان کی آواز "ہمارا نکاح ہوچکا ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔"اس نے اتنی شدت سے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا کہ خون چھلک آیا۔

"کہاں جانا ہے بی بی۔۔۔!"

"ایئرپورٹ۔۔۔۔"اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔کیا تھا اگر وہ کچھ دن اور رک جاتی اور بابا سے اس کی ملاقات ہوجاتی۔کتنے سالوں بعد وہ آرہے تھے لیکن کیا وہ ان کا سامنا کرسکے گی۔

"خیر جو ہوا سو ہوا۔۔۔ایک بار مجھے اپنا ٹارگٹ مل جائے تو میں پھپھو کو آکر منا لوں گی۔۔۔پھپھو بہت دیر مجھ سے ناراض نہیں رہ سکتیں۔۔۔اور بابا تو۔۔۔۔"

مدھم سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ آج کے بعد وہ کبھی اس گھر کے گیٹ میں داخل نہیں ہوگی۔

اسے فلم میں تو چانس نہ مل سکا لیکن ٹی وی ڈرامے نے اس کو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔اس کے متعلق اگر یہ کہا جاتا "وہ آئی اور چھا گئی" تو کچھ غلط نہ تھا اس کا حسن اس کی معصومیت، ذہانت، تعلیم اور ایکٹنگ کی تعریفوں سے اخبار بھرے تھے۔ دھڑا دھڑ انٹرویو چھپ رہے تھے۔

وہ اس گلیمر میں ایسی الجھی کہ پیچھے مڑ کر دیکھ ہی نہ سکی اگر کبھی خیال آیا بھی تو قدم نہ اٹھ سکے۔ایک غلطی تو معاف بھی کردی جاتی ہے لیکن جو دوسری غلطی اس سے سرزد ہوئی وہ قابل معافی نہ تھی۔لاہور آنے کے چند دن بعد صادق نے مشورہ دیا کہ اس کا نکاح اس

کے بیٹے اللہ یار سے کردیا جائے اس صورت میں یہ خطرہ نہیں رہے گا کہ محب اللہ خان کچھ کرسکیں گے۔

"وہ حبس بے جا کا کیس کرسکتا ہے۔باپ ہے تمہارا اور قانوناً وہ تمہیں زبردستی لے سکتا ہے۔کیونکہ انہوں نے شانی سے لکھوالیا تھا کہ اس کا تم پر کوئی حق نہیں ہوگا۔تم بالغ ہو اس نکاح کے بعد تمہاری پوزیشن مضبوط ہوجائے گی۔"

لیکن ملائکہ متذبذب تھی اللہ یار میٹرک پاس تھا اور ایک الیکٹرک کے سامان مرمت کرنے والی دوکان پر کام کرتا تھا۔سادا سا، عام سا لڑکا۔۔۔

"یہ صرف کاغذی نکاح ہوگا ملائکہ۔۔۔۔!"

صادق نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا لیکن پھر یہ صرف کاغذی نکاح نہیں رہا تھا۔ شہریار اس کا ثبوت تھا۔اللہ یار باپ کی طرح چالاک اور ہوشیار نہیں تھا اس لیے وہ وہی کرتا جو باپ کہتا۔

سو جب وہ اللہ یار کے ساتھ اپنی شادی کا سوچتی تو اس کے قدم ٹھہر جاتے۔

"نہیں بابا اور پھپھو مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔لاہور آنے کے سال بھر بعد تک تو اسے کوئی قابل ذکر کام نہیں ملا تھا۔سلیمان واسطی کے دفتر میں ملنے والے آفتاب علی نے ایک نئی لڑکی سلیکٹ کرلی تھی جو پہلے ٹی وی ڈراموں میں کام کرتی تھی۔سو لاہور آکر بھی وہ کچھ عرصہ تک ماڈلنگ ہی کرتی رہی۔تاہم ماڈلنگ سے اسے اتنی رقم تو ضرور مل گئی تھی کہ اس سے گلبرگ میں ایک بنگلا خرید لیا تھا اور سلطانہ کے ساتھ اس میں شفٹ ہوگئی تھی۔

سلطانہ کے گھر میں نذیر کا رویہ انتہائی برا تھا۔وہ شخص بالکل پسند نہیں کرتا تھا ہر وقت سلطانہ سے لڑتا رہتا اور ان پیسوں سے حصہ مانگتا جو ملائکہ کو ملتے تھے۔جب کہ پیسوں کا سارا حساب کتاب صادق کے پاس تھا۔

گھر خرید لیا گیا تو سلطانہ نے کہا۔"چل گولی مار نذیر کو میں اس سے طلاق لے لیتی ہوں۔ویسے بھی دمے کا مریض ہوگیا ہے۔ساری رات کھانس کھانس کر میرا دماغ خراب کردیتا ہے۔"

نذیر بھی نشے میں تھا جب سلطانہ نے اس سے طلاق مانگی تو اس نے فوراً ہی اسے طلاق دے دی لیکن بعد میں بہت پچھتایا۔ کتنی بار کوٹھی پر آیا کہ وہ نشے میں تھا لیکن سلطانہ نے اسے دھکے دے کر نکال دیا۔ شروع میں تو صادق، اس کے بیوی بچے بھی ان کے ساتھ رہے لیکن بعد میں سلطانہ اور صادق میں زبردست جھگڑا ہوا اور سلطانہ نے صادق کو گھر سے نکال دیا۔

صادق اللہ یار کو بھی لے گیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد دونوں بہن بھائی پھر ایک جیسے ہو گئے۔ تاہم صادق نے اپنے لیے گھر لے لیا تھا۔ ملائکہ اپنی زندگی میں مصروف تھی۔ اسے ان سارے جھگڑوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ صادق اور سلطانہ کے کہنے پر اس نے اپنی شادی کو چھپایا ہوا تھا۔ وہ اللہ یار سے محبت نہیں کرتی تھی۔ نہ ہی اللہ یار نے اس سے محبت کے بول بولے تھے بس وہ اس کا شوہر تھا۔ وہ دن رات شوٹنگ میں مصروف رہتی۔ ٹی وی ڈراموں کے ساتھ ساتھ اس نے فلم سائن کر لی۔ ہر طرف اس کی اداکاری کی دھوم تھی۔ ملائکہ کی اداکاری پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔

''وہ ہر مکالمے کو اس طرح ادا کرتی ہے کہ اس میں جان ڈال دیتی ہے۔'' ایسے تبصرے چھپتے رہتے تھے جو ملائکہ خان کے نام سے متعارف ہوئی تھی اب فخر سے بتاتی۔

''میں ملائکہ محب اللہ خان ہوں میرے والد ایک بڑے بزنس مین ہیں۔ حوالہ جو چھوڑ آئی تھی اسے اب اس حوالے کی ضرورت تھی کہ لوگ اسے سلطانہ اور صادق کے ساتھ دیکھ کر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے تھے۔ وہ بے حد مصروف تھی اتنی مصروف کہ رات گئے تک جب وہ گھر آ کر لیٹتی تو اسے کچھ یاد نہ رہتا۔ نہ پھپھو، نہ وہ گھر، نہ بابا اور نہ عرفان۔۔۔۔۔ پورے دو سال وہ بے حد مصروف رہی۔ اخبار اس کی اداکاری کی تعریف سے بھرے ہوتے۔ ایک کے بعد دوسرا کامیاب ڈرامہ اور یکے بعد دیگرے دو کامیاب فلموں نے اسے سب کچھ بھلا دیا لیکن۔۔۔۔۔ جس روز اس کی تاج پوشی ہوئی، اسے اداکاری کی ملکہ کہا گیا، اس روز جب وہ اپنے بیڈ پر لیٹی اسے لگا کہ جیسے بہت ساری کامیابیوں اور کامرانیوں کے باوجود اس کا دامن خالی ہے، اس کے اندر عجیب طرح کی ویرانی ہے، اس روز بیشمار دنوں۔۔۔۔۔ بلکہ مہینوں۔۔۔۔۔ کے بعد اس نے سلطانہ سے

اللہ یار کے متعلق پوچھا۔

''وہ تو دوبئی چلا گیا ہے مزدوروں میں بھرتی ہو کر۔۔۔۔۔''

''اور مجھے بتایا تک نہیں۔۔۔۔۔''

''تمہارا اس کا کیا جوڑ تھا ملائکہ جان! وہ تو بس ایک حفاظتی تدبیر تھی اور اب اس کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے وہ طلاق دے دے تجھے۔ صادق نے بہت منع کیا تھا۔ یہ صادق بھی بڑا لالچی ہے، میں سمجھتی ہوں اس کی نظر تیری آمدنی پر ہے، تیرے اکاؤنٹ میں کوڑی بھی جمع نہیں کرواتا، میں کہتی ہوں تو خود کیوں نہیں حساب کتاب رکھتی یہ کم بخت ہم ماں بیٹی کو بھیک منگوائے گا۔ مجھے ساری زندگی اس کی چالیں سمجھ نہیں آئیں، وہ تو اللہ یار نے جاتے جاتے اس کے سارے راز کھول دیے۔''

''کیا اللہ یار نے مجھے طلاق دے دی ہے۔۔۔۔۔؟''

ملائکہ نے کب کی رکی ہوئی سانس آزاد کی۔

''ہاں۔۔۔۔۔ وہ پہلے بھی اس شادی پر رضامند نہ تھا، تمہارا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے، تمہارے اور اس کے مزاج میں کچھ بھی ایک جیسا نہیں ہے، وہ کہتا تھا وہ سیدھا آدمی ہے اپنے ابا جیسا نہیں ہے اور اسے اپنے جیسی ایک سادہ سی گھریلو بیوی کی ضرورت ہے جو دال روٹی کھا کر گزارا کر لے، جسے زیادہ کی ہوس نہ ہو۔''

''اور شہریار۔۔۔۔۔؟'' اس کے لب ذرا سے ہلے تھے۔

''شہری کا کیا ہے۔۔۔۔۔ وہ تو میرا بیٹا ہے۔''

وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ اللہ یار سے محبت تو کجا کوئی لگاؤ بھی نہیں رکھتی تھی اور ان دو سالوں میں تو ایک بار بھی وہ اور اللہ یار اکٹھے نہیں ہوئے بلکہ اس کی اللہ یار سے کوئی خاص بات بھی نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ کئی بار اس کی نظریں اس پر پڑتی رہتی تھیں پھر بھی دل کے اندر ایک کھاؤ سا پڑ گیا۔ پہلے عرفان نے اسے ٹھکرا دیا۔۔۔۔۔ اور پھر اللہ یار جیسے مرد نے اسے رد کر دیا۔۔۔۔۔ حالانکہ وہ خود اس سے طلاق لینا چاہتی تھی۔ اسے خود ہی طلاق مل گئی۔۔۔۔۔ اب تو جیسے اس کی زخمی انا تڑپ رہی تھی۔

''کیا وہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے چاہا جائے، اس سے محبت کی جائے۔''

عرفان نے کہا تھا ''اس نے اسے بہت چاہا ہے، اسکے پاس دینے اور کہنے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن ۔۔۔۔۔۔'' اور اس کے اندر عجیب طرح کی تشنگی اُمڈ آئی۔

اسے محبت کی ہوس ہوگئی تھی۔

وہ ہر اس شخص کی طرف لپکنے لگی۔ جو ذرا بھی اس پر التفات بھری نظر اٹھاتا، وہ ملائکہ جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ مغرور ہے، اپنے خاندان کا فخر ہے، وہ کسی کو لفٹ نہیں کرواتی، اس کے اسکینڈل چھپنے لگے ۔۔۔۔ کبھی کسی صحافی کے ساتھ، کبھی کسی اداکار کے ساتھ، کبھی کسی پروڈیوسر کے ساتھ۔

پھر ممتاز سومرو کا نام اس کے ساتھ لیا جانے لگا۔ ممتاز سومرو ایک معزز جاگیر دار تھا۔ کسی تقریب میں دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ اسے محبت کی چاہ تھی ۔۔۔ وہ لفظوں کی بھوکی تھی ۔۔۔ اور ممتاز کے پاس لفظوں کی جادوگری تھی ۔۔۔۔ وہ اس کی ایسی اسیر ہوئی کہ اسے لگتا کہ وہ اندر تک لبالب محبت سے بھر گئی ہے۔ ساری عمر کی تشنگی ختم ہوگئی ۔۔۔ عرفان سے کہیں زیادہ محبتیں تھیں ممتاز کے پاس ۔۔۔ وہ اس کا ساتھ پانے کے لیے سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوگئی۔ عین بلندی پر اس نے شوبز کو خیر آباد کہہ دیا، پرانے کنٹریکٹ مکمل کیے اور مزید کچھ بھی کرنے سے انکار کر دیا۔

سلطانہ اس پر سخت ناراض ہوئی۔

''تم پاگل ہوگئی ہو ۔۔۔۔۔''

''ہاں میں پاگل ہوگئی ہوں ۔۔۔۔''

''شوبز میں بہت پیسہ ہے ملکی ۔۔۔۔! اور ابھی چھ سات سال تک تو بہت کما سکتی ہے۔''

''ممتاز کے پاس بھی بہت پیسہ ہے ۔۔۔''

''میں ۔۔۔ اور ۔۔۔ میرا کیا ہوگا؟'' سلطانہ گھبرائی ہوئی تھی۔

''تم یہاں اس گھر میں رہنا، میں تمہیں پیسے بھیجتی رہوں گی۔''

''لیکن ملکی ۔۔۔!''

''بس مجھے جانا ہے ۔۔۔۔''

''اور شہریار ۔۔۔۔۔؟''

''وہ تمہارا بیٹا ہے سب کی طرح ممتاز بھی یہی سمجھتا ہے، وہ تمہارے پاس ہی رہے گا اس کا خرچ میں دے دوں گی۔''

سلطانہ کا سمجھانا، اس کی دھمکیاں، ڈراوے سب بے معنی تھے اس کے لیے، اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ سو وہ سب چھوڑ کر ممتاز کے ساتھ اس کے گاؤں چلی گئی۔ ممتاز نے اس سے بہت سے وعدے کیے تھے ۔۔۔ لیکن گاؤں جا کر وہ وعدے بھول گیا۔ گاؤں میں اس کی پہلے بھی دو بیویاں موجود تھیں اور ملائکہ کے لیے اس کے پاس بہت کم وقت تھا ۔۔۔ زمینوں کے جھگڑے، لوگوں سے ملنا ملانا وہ سارا دن مصروف رہتا تھا اور وہ بولائی بولائی سی حویلی کے کمروں میں چکراتی پھرتی۔

ممتاز کی بیویاں اس کی بے چینی دیکھ کر ہنستیں اور دور سے اشارے کر کے سرگوشیاں کرتیں۔ ممتاز ہفتے میں دو بار ہی اس کے پاس آتا تھا لیکن وہ یہاں آکر سب خوبصورت الفاظ کھو بیٹھا تھا۔ اسے لگتا وہ ویسی ہی تشنہ اور خالی ہے۔ اس کے کاسے میں محبت کا کوئی سکہ نہیں۔

''وہ عرفان تھا کہ اس کے پاس اس کے لیے ڈھیروں محبتیں تھیں۔''

اور ممتاز سومرو ۔۔۔۔۔ جانے کس دھوکے میں وہ اس کی طرف چلی آئی تھی۔

اماں نے صحیح کہا تھا۔ ''یہ جاگیردار ایسے ہی ہوتے ہیں، چار دن عیش کرے گا اور چھوڑ دے گا۔'' ممتاز نے تو اسے نہیں چھوڑا ہاں ۔۔۔۔۔ اس نے اسے چھوڑنے کا عہد کر لیا تھا۔

''میں نے تمہیں پہلے ہی یہ بتا دیا تھا ملائکہ محب اللہ خان! کہ ہماری حویلی کی پابندیاں تم سہہ نہ پاؤ گی۔''

''میں پابندیوں سے نہیں گھبراتی ممتاز سومرو! لیکن اگر تمہاری محبت بھی سنگ ہوتی تو ۔۔۔۔ اب تو یہ پابندیاں میرے گلے میں پڑے طوق ہیں جو لمحہ دم گھونٹ رہے ہیں ۔۔۔۔ تم مجھے آزاد کر دو ۔۔۔۔''

اور ممتاز سومرو نے اسے بلا جھجک آزاد کر دیا۔ ایک سال دس ماہ بعد وہ واپس آ گئی

دولاکھ کا حق مہر کا چیک لیے سلطانہ خوش ہوگئی۔صادق جس کے ساتھ ملائکہ کے جانے کے بعد سلطانہ نے صلح کر لی تھی وہ کھل اٹھا۔

''میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا تو اس کیساتھ بس نہیں سکے گی خیر۔۔۔۔۔''

سلطانہ کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

''کیا کچھ لے کر آئی ہے۔۔۔۔۔؟''

اس نے خالی خالی نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے چیک اس کی طرف بڑھا دیا۔

''بس یہ دولاکھ۔۔۔۔۔دولاکھ تو تیرا حق مہر تھا۔۔۔۔۔؟''

''ہاں یہ حق مہر ہی ہے۔۔۔۔۔''

وہ بہت تھکی ہوئی تھی اور آرام کرنا چاہتی تھی۔

''تو اور کچھ نہیں ۔۔۔۔۔کوئی کوٹھی۔۔۔۔ کوئی بینک بیلنس ۔۔۔۔۔دوسالوں میں کچھ بھی نہیں لے سکی تو اس جاگیردار کے بچے سے۔۔۔۔۔''

سلطانہ کے چہرے پر مایوسی تھی۔وہ ایک نظر اس پر ڈال کر کمرے میں آگئی۔

''پچھتاوے اس کے اندر ڈنگ مارنے لگے۔۔۔۔ اس نے وہ سب یاد کیا۔۔۔۔جو وہ چھوڑ آئی تھی۔پھپھو کی محبتیں۔۔۔۔شفقتیں۔۔۔۔بابا کا پیار۔۔۔۔اور پھر سب سے بڑھ کر عرفان کی چاہتیں۔۔۔۔۔''

''عرفان۔۔۔۔۔۔''اس کے ہونٹوں سے سسکی نکلی۔وہ بہت دیر تک روتی رہی اور اس نے سوچا کہ پھپھو کے پاس چلی جائے۔۔۔۔ان کے پاؤں پر گر کر معافی مانگ لے۔۔۔۔وہ ضرور معاف کر دیں گی۔۔۔۔اس نے سلطانہ اور پھپھو کا موازنہ کیا تو اسے لگا کہ سلطانہ ایک لالچی عورت ہے اور شاید اس لیے بابا کی ان سے نبھ نہیں سکی تھی۔

لیکن کبھی کبھی واپس پلٹنے میں دیر ہو جاتی ہے اسے بھی دیر ہو گئی تھی۔پھپھو کو عرفان اپنے ساتھ کینیڈا لے گیا تھا۔وہ گیٹ کے پاس بہت دیر تک روتی رہی چوکیدار نے اسے پانی پلایا۔

''بابا! کیا پھپھو مجھے یاد کرتی تھیں۔۔۔۔کبھی انہوں نے میرا نام لیا۔۔۔۔؟''

''کیوں نہ یاد کرتی ہوں گی۔۔۔۔پالنے کی محبت بڑی ظالم ہوتی ہے بیٹا۔۔۔۔!سلطانہ بی بی تو آپ کو مرنے کے لیے چھوڑ گئی تھیں۔۔۔۔ذراسی جان کو بیگم صاحبہ نے ہی سنبھالا تھا۔۔۔۔چوکیدار نے اسے جو کچھ بتایا اس نے اس کے اندر باہر آگ لگادی۔وہ کراچی سے لوٹی تو سلطانہ سے الجھ پڑی۔

''تم نے میری زندگی برباد کی ہے۔۔۔۔تم میری ماں نہیں ہو۔۔۔۔تم نے مجھے اجاڑ دیا ہے۔۔۔۔میرا گھر۔۔۔۔میرا شوہر۔۔۔۔سب چھین لیا۔۔۔۔مجھے پھپھو کا گھر چھوڑنے پر اکسایا۔''

''ارے چل۔۔۔۔اتنی ہمدرد تھی تیری پھپھو تو روک لیتی تجھے۔۔۔۔نہ جانے دیتی۔۔۔۔اس نے تو سوچا تھا خس کم جہاں پاک۔۔۔۔''

''ہاں پھپھو مجھے روک بھی تو سکتی تھی زبردستی۔۔۔۔لیکن میں ان کی بیٹی جو نہیں تھی۔۔۔۔''

''اماں سچ کہتی ہے۔۔۔۔اسے سلطانہ کی بات سچ لگی۔۔۔۔''

پھر کئی روز گزر گئے تو سلطانہ نے کہا۔

''چل ختم کر یہ سیاپا۔۔۔۔ذرا پارلر جا کر تیار شیار ہو اور صادق کے پاس جا کر آفتاب صاحب سے مل لے آج کل وہ ایک نئی فلم بنا رہے ہیں۔''

''مجھے کسی فلم یا ڈرامے میں کام نہیں کرنا۔۔۔۔۔''

''بھوکی مرے گی کیا۔میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔کل شہری کو بھی ٹیچر نے کلاس سے باہر نکال دیا۔دوماہ سے فیس نہیں دی۔۔۔۔۔''

''اور وہ دولاکھ کہاں گئے۔۔۔۔۔؟''

''اتنا قرض چڑھا ہوا تھا۔وہ اتارا تو تو چل دی تھی اس ممتاز کے ساتھ۔۔۔۔پیچھے ہم نے کیسا وقت گزارا تجھے کیا خبر۔۔۔۔''سلطانہ کی آنکھیں برسنے لگیں۔

''اچھا چل دیکھتی ہوں۔۔۔۔''اس نے ماں کو تسلی دی۔

''میں فون کروں صادقے کو۔۔۔۔؟''

""نہیں میں خود چلی جاتی ہوں۔۔۔۔۔""

""یہ ٹھیک ہے تو خود سمجھدار ہے وہ تو آدھے پیسے خود رکھ لیتا ہے۔""

دو سال تک چھوٹی اور بڑی سکرین پر حکومت کرنے والی ملائکہ جب آفتاب صاحب سے ملنے گئی۔تو چپڑاسی نے اسے انتظار کرنے کو کہا وہ غصے سے باہر نکل گئی اور ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں چلی گئی۔ کمپنی کا مالک اسے اپنے ایڈ میں لینے کے لیے اس کے پیچھے بھاگتا تھا۔اس نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اسے بلالے گا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی سلطانہ نے پوچھا تو وہ چیخ اٹھی۔

""نہیں کرسکتی میں اب یہ کام۔۔۔۔۔۔""

""تو پھر واپس کیوں آئی ہو۔۔۔۔رہتی اپنے عاشق کے پاس ۔۔۔۔"" سلطانہ نے بھی چلا کر کہا۔ کچھ دیر وہ بولتی رہی ملائکہ خاموشی سے اندر کمرے میں چلی گئی اور سلطانہ تیار ہو کر تھیٹر چلی گئی۔

کسی صحافی کو اس کی خبر مل گئی تو اس نے اخبار میں سرخی لگادی۔""شوبز کی دنیا کو اچانک چھوڑ جانے والی ملائکہ محب اللہ خان کی واپسی۔۔۔۔۔""

اور پھر تو قیاس آرائیاں ہونے لگیں سلطانہ کے اصرار کے باوجود اسٹوڈیو کا رخ نہیں کیا۔۔۔۔تو تھک ہار کر سلطانہ بھی خاموش ہوگئی اور گھر اس کی تھیٹر کی معمولی آمدنی پر چلنے لگا۔ پیسہ آتا تو تھا لیکن سلطانہ بہت فضول خرچ تھی۔ جب نوبت زیورات بکنے پر آئی تو ایک بار پھر ملائکہ کو جھنجھوڑا۔

""لوگ مجھے بھول چکے ہیں ماں۔۔۔۔۔!""

""ایک بار تو پھر آجائے تو تیرا ہی راج ہوگا۔یہ جو سکرین پر تھرک رہی ہیں چوبیس گھنٹے انہیں تو ایکٹنگ کی الف ب بھی نہیں آتی۔""

""میں اب ایکٹنگ نہیں کرسکتی۔۔۔۔""

""اچھا چل صادق دوبئی جارہا ہے ایک شو میں تو بھی چلی جا اس کے ساتھ میرا نہیں تو شہریار کا سوچ لے۔""

وہ جانے کس موڈ میں تھی کہ اس نے حامی بھرلی۔یا پھر وہ ذہنی طور پر اتنی کمزور

ہوچکی تھی کہ احتجاج کر ہی نہ سکتی تھی۔ دو ماہ بعد جب وہ دوبئی سے آئی تو حالت بدلی ہوئی تھی۔ سگریٹ پینے لگی تھی، اونچے اونچے قہقہے لگاتی، جینز اور ٹی شرٹ پہنتی، اونچی آواز میں بات کرتی، کبھی بیٹھے بیٹھے رونے لگتی (شو کے پردے میں کیا ہوا تھا اس کے متعلق نہ ملائکہ نے بتایا نہ صادق نے) سلطانہ نے صادق سے پوچھا تو ہنس دیا۔

""میں نے تو کچھ نہیں کیا۔۔۔۔تو ہی کہتی تھی نا کہ اسے زندگی کی طرف لاؤں تو لے آیا، بہت پیسہ کما کے لائی ہے وہ وہاں سے۔۔۔۔لیکن وہ اب بدل گئی تھی وہ جو سارے پیسے سلطانہ کو دے دیتی تھی اب اپنی رقم چھپانے لگی تھی اس پر سلطانہ لڑتی اسے برا بھلا کہتی۔

مگر وہ چپ چاپ سنتی رہتی۔ دوبئی سے واپس آکر اس نے نئی گاڑی بھی خرید لی تھی اور اکثر گاڑی لے کر نکل جاتی۔ سلطانہ چاہتی تھی کہ وہ پھر شوبز میں چلی جائے۔

""تیری بیٹی اب ہیروئن نہیں بن سکتی۔ یہ تو ایک جملہ بھی یاد نہیں کرسکتی۔ اب مکالمے کیا یاد کرے گی کوئی تگڑی آسامی دیکھ کر اس سے شادی کردے اس کی۔۔۔۔""

صادق کا مشورہ پسند آیا اس کو۔

اور وہ لوگوں کو پھانس پھانس کر لانے لگی۔اسے اب کسی تھیٹر ڈرامے میں بوڑھی نائکہ کے ہی کوئی کردار مل جاتے تھے۔ وہاں کسی سے ملاقات ہوتی تو وہ ملائکہ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی۔ ملائکہ سے ملواتی ملائکہ جو ایکٹنگ سکرین پر کرتی تھی۔ وہ عام زندگی میں کرنے لگی۔ وہ سلطانہ کے مہمانوں سے اپنی ذات کے حوالے سے دھڑلے سے جھوٹ بولتی۔ اس نے اتنے جھوٹ بولے تھے کہ اسے خود بھی سچ لگتا تھا وہ سب جو کچھ کہتی تھی اب پورے یقین سے کہنے لگی تھی۔ سات سال میں لوگ اسے بھول چکے ہیں۔ بعض اوقات تو قریب سے گزرنے پر بھی کوئی اس کی طرف نہ دیکھتا، نہ پہچانتا تھا۔

""کیا اس کی شکل بدل گئی ہے۔۔۔۔؟"" وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھی خود کو تکتی رہتی۔ لوگ اسے پہچانتے کیوں نہیں۔۔۔۔ بڑے بڑے پروڈیوسر منتیں کرنے اس کے پاس کیوں نہیں آتے۔۔۔۔ وہ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس کے بغیر سکرین تاریک ہے۔۔۔۔ ایکٹنگ مرگئی ہے۔۔۔۔ ڈرامہ زندہ نہیں رہا۔۔۔۔ اس نے اپنی ایک تصوراتی دنیا تخلیق کرلی تھی۔ جہاں وہ اسکرین کی ملکہ تھی۔۔۔۔ جہاں پروڈیوسر اسکے قدموں پر

گرتے تھے۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔اور عرفان سے زیادہ وجیہہ اور باوقار مرد اس کی محبت کا دم بھرتے تھے۔۔۔۔اس صورت حال نے اس کے اندر ایک توڑ پھوڑ کا عمل شروع کر دیا تھا۔ وہ سلطانہ کے لائے ہوئے ہر شخص کی طرف لپکتی لیکن وہ مرد اسے ممتاز سومرو لگتا۔ محبتوں سے خالی۔۔۔۔کھوکھلا۔۔۔۔اور وہ پیچھے ہٹ جاتی۔ جس پر ماں بیٹی میں لڑائی رہتی۔

"وہ اتنا دولت مند تھا عیش کرتی ساری زندگی۔۔۔۔"

"لیکن۔۔۔۔اس کا دل خالی تھا۔۔۔۔۔اس کے پاس محبت نہیں تھی۔۔۔۔"

"خالی محبت کو چاٹے گی۔۔۔۔" سلطانہ اسے دو ہاتھ مارتی۔

لیکن اسے تو محبت کی ہوس ہو گئی تھی۔۔۔۔چاہے جانے کا خبط۔۔۔۔اس طلب میں وہ ایک بار پھر دھوکا کھا بیٹھی۔۔۔۔مرزا مسعود ایک رنڈوا زمیندار تھا۔۔۔۔جوان بیٹے شادی شدہ تھے۔ لیکن مرزا خود بھی جوان لگتا تھا۔۔۔۔بال ڈائی کرتا، تھری پیس سوٹ پہنتا۔۔۔۔پجارو میں بیٹھتا۔۔۔۔جب لاہور آتا تو اپنی ذاتی کوٹھی میں قیام کرتا۔۔۔۔بھوربن بھی اس کی کوٹھی تھی۔۔۔۔سلطانہ کو جانے کہاں ملا تھا۔۔۔۔ لیکن اس کے توسط سے ملائکہ تک پہنچا تھا۔

اس نے ملائکہ کے سارے ڈرامے اور دونوں فلمیں دیکھ رکھی تھیں۔۔۔۔وہ ملائکہ سے اس کے پرانے کردار کے حوالے سے بات کرتا تو اسکی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ وہ بہت اشتیاق سے اس کی باتیں سنتی۔ پھر مرزا نے اسے پرپوز کیا اور ملائکہ جو بھاگتے بھاگتے ہانپنے لگی تھی۔۔۔۔نے ہاں کر دی۔ سارے معاملات مرزا اور سلطانہ میں ہو چکے تھے اور وہ ان معاملات سے بے خبر تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ مرزا مسعود کی وفادار بیوی بن کر رہے گی چاہے کچھ بھی ہو۔ مرزا اسے اپنی حویلی میں لے کر نہیں گیا تھا۔ بلکہ لاہور والی کوٹھی میں رکھا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے غلاظت سے اٹھ کر ایک بار پھر معتبر ہو گئی ہے لیکن ٹھیک گیارہ ماہ بعد مرزا مسعود نے اسے فارغ کر دیا۔ وہ ہکا بکا سی اسے دیکھتی رہی۔

لیکن۔۔۔۔۔۔

وقت نے پلٹا کھایا۔۔۔۔۔۔۔

اور پھپھو نے اسے سمیٹ

لیا۔۔۔۔بڑے بڑے ڈاکٹروں سے علاج کروایا لیکن اس کی ذہنی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی تھی۔ ہاں وہ پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ مارتی پیٹتی نہیں تھی۔ لیکن جب دورہ پڑتا تو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ تب اسے فونٹین ہاؤس میں داخل کر دیا گیا۔ عرفان سیٹل نہ ہو سکا تو واپس کینیڈا چلا گیا اور شہریار کو بھی ساتھ لے گیا ملک محب اللہ خان اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آ گئے۔ پھپھو بھی یہاں تھیں۔

وہ مہینے دو مہینے بعد چکر لگاتیں لیکن ملائکہ کسی کو پہچانتی نہ تھی۔ اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ وہ فونٹین ہاؤس میں ہر آنے والے شخص کو کہتی کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ کبھی کبھی کوئی صحیح بات بھی کر جاتی۔ لیکن ڈاکٹر کوئی خاص پرامید نہ تھے۔ وہ ملائکہ محب اللہ جسے محبت کی طلب تھی لیکن جسے سچی محبت کبھی نہ ملی۔

میں نے اس کہانی کو یہاں تک ہی پڑھا تھا اس کے آگے اختتامی جملے پڑھنے کی ضرورت بھی نہ تھی اب ملائکہ میرے سامنے تھی میں اسے دیکھ رہا تھا۔ مہینے میں دو چکر لگاتا تھا اس کا کیس میرے مطالعے میں رہتا تھا لیکن مجھے بھی ڈاکٹر لطیف کی رائے سے اتفاق تھا کہ بالکل ٹھیک ہونے کے امکانات کم ہیں۔

بچپن میں لگنے والی چوٹ کا اثر تھا یا اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہی اتنی شدید تھی۔ کہ بحالی ممکن نہیں رہی تھی۔ پھر بھی اپنی کوشش کرتے رہتے تھے۔ میں گھنٹوں اسکے پاس بیٹھا رہتا، باتیں کرتا رہتا، لیکن اس کی آنکھوں میں جو اجنبیت تھی وہ روز اول کی طرح ہی تھی۔

"میں ڈاکٹر حبیب ہوں ملائکہ۔۔۔۔۔!"

"اچھا۔۔۔۔لیکن دیکھو مجھے انجکشن نہ لگانا۔" میرے تعارف کے بعد وہ کہتی۔

"نہیں لگاؤں گا۔۔۔۔" میں ہولے سے اس کا ہاتھ تھپتھپاتا۔

اس کے لمس سے میرے اندر اب وہی ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا جو اس وقت ہوتا تھا اگر میں اس سے شادی کر لیتا تو شاید اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔

کبھی کبھی میں سوچتا تھا، عجب پچھتاوا سا ہوتا میری محبت شاید اسکے اندر کے خلا کو

بھر دیتی۔۔۔شاید۔۔۔۔لیکن اس نے مجھ سے کتنے جھوٹ بولے تھے۔اگر وہ سچ کہہ دیتی تو۔۔۔۔میں نہیں جانتا کہ نوازش کی کہانی میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ،شاید واقعات اور حقائق سے سب سچ ہو۔۔۔۔ہاں تھوڑی سی رنگ آمیزی کی ہو۔نوازش آخر کو کہانی کار ہے نا۔۔۔۔لیکن مجھے سب سچ ہی لگتا ہے۔مجھے یہ کہانی مکمل ہی لگتی ہے۔بس اس میں ایک بات نہیں ہے جو ایک بات نوازش نہیں جانتا۔۔۔۔یا جانتا بھی ہے تو اس نے لکھا نہیں۔

اس نے لکھا ہے کہ ملائکہ کو سچی محبت کبھی نہیں ملی۔۔۔۔کسی نے اس کو دل کی گہرائیوں سے نہیں چاہا۔۔۔۔وہ محبت کی دھند میں اندھا دھند بھاگی۔۔۔۔اور پھر اس کھوج میں ہوا س کھو بیٹھی۔۔۔۔اس کا من خالی کا خالی رہا۔۔۔۔دل آباد نہ ہو سکا۔

یہ ہی اس کہانی کے آخری جملے ہیں لیکن مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ میں۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔میں نے اس سے محبت کی۔۔۔۔نوازش سچ کہتا تھا کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔۔۔۔ان بہت سارے بیتے سالوں میں۔۔۔۔مریم جیسی بیوی ہونے کے باوجود۔۔۔۔میں نے جسے سوچا وہ ملائکہ محب اللہ خان ہے۔۔۔۔میری وہ راتیں اس کی گواہ ہیں جو میں نے اسے سوچتے گزاریں۔۔۔۔

میں نے جو کو اتنا نہیں سوچا جتنا ملائکہ کو۔۔۔۔جو تو ایک نرم ہوا کا جھونکا تھی۔جو میرے دل کو معطر کر کے چلی گئی لیکن۔۔۔۔ملائکہ ایسا شجر تھی جس کی جڑیں میرے اندر دور تک چلی گئیں۔۔۔۔مجھے اعتراف ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔۔۔۔ویسی ہی محبت جیسی محبت کی اسے چاہ تھی اور صرف میں نہیں۔۔۔۔عرفان بھی اس سے محبت کرتا ہے جب ہی تو ہر چھ مہینے بعد اسے ملنے چلا آتا ہے اتنی دور سے۔۔۔۔وہ بھی گھنٹوں میری طرح اس کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔۔۔۔اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا ہے۔۔۔۔وہ سنتی ہے لیکن سمجھتی نہیں۔۔۔۔وہ بات ختم کر کے پرامید نظروں سے اسے دیکھتا ہے تو فوراً ہی کسی کی شکایت جڑ جاتی ہے(نمبر 3 مجھے گھور کر دیکھتی ہے)اس وقت عرفان کے چہرے پر پھیلتے مایوسی کے رنگ۔۔۔۔اس کی آنکھوں کی نمی۔۔۔۔اس کے اندر کی کیفیتوں کا اظہار کرتی ہے۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔عرفان ملک نے بھی ا

س سے محبت کی ہے۔۔۔۔اتنی شدید محبت۔۔۔۔جتنی شدید محبت کی وہ ہمیشہ طالب رہی۔۔۔۔۔

بلکہ عرفان کی محبت میری محبت سے ارفع ہے۔۔۔۔۔اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔۔۔۔تب سے جب وہ معصوم سی بچی تھی۔۔۔۔۔جب اس سے اس کی ماں نے کہا تھا۔

"اسے میں اپنے عفی کی دلہن بناؤں گی۔۔۔۔۔" تب سے۔۔۔۔وہ ملائکہ محب اللہ خان۔۔۔۔جو محبتوں کی حریص تھی۔۔۔۔جسے سچی محبت کی طلب تھی۔۔۔۔اور اس طلب میں اس نے خود کو فگار کر لیا تھا۔۔۔۔۔

وہ آبلہ پا ان محبتوں کو پانے کے لیے بھاگتی رہی۔۔۔۔۔وہ جو کہتی تھی۔۔۔۔

"میں نے اپنے باپ کے خاندان میں جانے کے لیے بہت سفر کیا ہے۔۔۔۔ میری مسافتیں رائیگاں ٹھہریں۔۔۔۔"

اس میں تھوڑی جھوٹ کی آمیزش تھی۔۔۔۔لیکن سچ ہی تو تھا کہ اس نے بہت سفر کیا۔۔۔۔لیکن باپ کے خاندان میں جانے کے لیے نہیں۔۔۔۔محبت کی طلب میں۔۔۔۔وہ جب ہوش میں تھی۔۔۔۔تو اسے محبت کی بہت حب تھی۔۔۔۔بہت لالچ تھا۔۔۔۔اس کی ماں کہتی تھی۔

"تو مرد کی رفاقت کی بھوکی ہے۔۔۔۔۔تب ہی تو اتنے عروج میں شوبز چھوڑ کر ممتاز سومرو کے پیچھے چل دی۔۔۔۔۔" اور وہ کہتی تھی۔

"نہیں میں مرد کی رفاقت کی بھوکی نہیں۔۔۔۔۔اس کی محبت کی بھوکی ہوں۔"

ملائکہ محب اللہ خان ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔۔۔۔لیکن وہ محبت اسکے سامنے تھی۔۔۔۔اس کی دسترس میں۔۔۔۔وہ جب چاہے مٹھی بھر کر اس محبت کو اپنے دل میں رکھ لے اور شانت ہو جائے۔۔۔۔

اور ایک مرد کی نہیں دو مردوں کی محبت۔۔۔۔۔ایسی محبت جس میں کوئی کھوٹ نہیں۔۔۔۔کوئی لالچ نہیں۔۔۔۔۔میں نے اس سے محبت کی۔۔۔۔لیکن اس کے سنگ زندگی گزارنے کے خواب نہیں دیکھے۔۔۔۔تصور میں اسے کبھی اپنے

گھر چلتے پھرتے نہیں دیکھا۔۔۔۔لیکن عرفان نے ان سارے خوابوں کو ہمراہ لے کر اس کے خواب دیکھے۔۔۔۔۔میں نے ایک بار اسے کہتے سنا تھا۔

''ملکی! ایک بار ہوش کی دنیا میں لوٹ آؤ۔۔۔۔۔تو میں تمہیں وہ سارے خواب لوٹاؤں گا۔۔۔۔۔جو میں نے تمہارے حوالے سے دیکھے۔۔۔۔۔ملکی! مجھے تمہارا بیٹا اتنا عزیز ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرا اور تمہارا بیٹا ہے۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔ محبت اس کے سامنے پڑی ہے۔۔۔۔۔اس کی دسترس میں۔۔۔۔۔لیکن اب اسے محبت کی طلب نہیں ہے۔۔۔۔۔ہم دونوں اپنے مدار کے گرد چکر لگاتے ہیں۔۔۔۔۔اس کی کشش کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے۔۔۔۔۔اسی لیے بھاگے بھاگے اس کے پاس آتے ہیں۔

وہ روتی رہتی ہے۔۔۔۔۔شکائتیں کرتی رہتی ہے۔۔۔۔۔نمبر دو، نمبر تین کی، نمبر چار کی۔۔۔۔۔

''نمبر دو نے میرے بال کھینچے تھے۔۔۔۔۔''

''نمبر تین کی پلیٹ میں زیادہ چاول تھے۔۔۔۔۔''

اور محبت اس کے سامنے پڑی سسکتی رہتی ہے۔۔۔۔۔لیکن وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔۔۔۔۔وہ ملائکہ محب اللہ خان۔۔۔۔جسے محبت کی طلب تھی لیکن جسے محبت کبھی نہیں ملی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔

☆ ☆ ☆